نیاز نمبر

نگار

پاکستان

قیمت فی کاپی
چار روپے

سالانہ چندہ
دس روپے



بچے ہیں
کوئی گڈے گڑیا
تو نہیں!
یہ دھوپ میں بھی ضرور باہر نکلیں گے!
بہتر ہے کہ انہیں گرمیوں میں رُوح افزا پلاتے رہئے۔ یہ انکو گرمی
اور لُو کے اثرات سے محفوظ رکھے گا۔
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس
لاہور - کراچی
HAMDARD FRUIT PRODUCTS PAK
HFP
LAHORE
ROOH AFZA
United HRA 8/309



ڈبلو-پی-آئی-ڈی-سی-سیمنٹ
ZEALPAK
زیل پاک
MAPLE LEAF
میپل لیف
مقبرہ قائد اعظم
یہ اعلیٰ معیار کے سیمنٹ ہماری قومی اُمنگوں کو
حقیقت کا رُوپ دے رہے ہیں
زیل پاک سیمنٹ ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے قائد اعظم کے مقبرہ کی تعمیر میں استعمال کے لئے موزوں سمجھا گیا۔
بے مثال خوبیوں اور اعلیٰ معیار کی وجہ سے ہی ہوٹل انٹر کانٹینینٹل اور نیشنل بینک آف پاکستان کی عظیم تعمیرات کے لئے زیل پاک سیمنٹ استعمال کیا جا رہا ہے۔
یہی نہیں بلکہ کے۔ ڈی۔ اے کی سکیموں کے تحت بننے والی عمارتوں میں بھی یہی سیمنٹ استعمال ہو رہا ہے۔
میپل لیف سیمنٹ بھی یکساں خوبیوں کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن تعمیر کے ماہروں اور انجینیروں نے پشاور یونیورسٹی، یونیورسٹی کیمپس لاہور اور نئے دارالخلافہ اسلام آباد کی تعمیر نیز واپڈا کے دوسرے تعمیری منصوبوں کے لئے میپل لیف سیمنٹ کا انتخاب کیا ہے۔
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
PRESTIGE


چہرے کی شگفتگی کے لئے
PALMROSE TOILET SOAP
PALMROSE TOILET SOAP
خواتین کا پسندیدہ
پام روز ٹائیلٹ سوپ
اس کے خوشبو والے چکنے جھاگ جلد کو ملائم اور دلکش بنا کر رنگ کو نکھارتے ہیں۔ نیز آپکے بالوں کو چمکدار اور جاذب نظر بناتے ہیں۔
کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز لمیٹڈ۔ کراچی۔ چٹاگانگ
تیارکنندگان
مقبول عام کریسنٹ
151
اونٹ مارکہ نمبر 151
وہ واحد واشنگ سوپ ہے جو L4 کی آمیزش کے سبب بے مثل ہے۔
اپنے قیمتی کپڑوں کی شفاف، چمکدار، بکفایت اور بے ضرر دھلائی کے لئے "کریسنٹ" صابن کو ہمیشہ یاد رکھیئے۔

رجسٹرڈ نمبر ایس ۷۲ ۲۴

سالنامہ ۱۹۶۳ء

نیاز نمبر

حصہ دوم

نگار پاکستان

مرتبہ

فرمان فتحپوری

زر سالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
چار روپے

نگار پاکستان ۲/۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

باہتمام عارف نیازی پرنٹر پبلشر۔ مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی میں طبع ہوا۔

فہرست حصہ دوم

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

۴۲ واں سال	مئی : جون سنہ ۱۹۶۳ء	شمارہ ۵ ۔ ۶

نیاز و نگار

اعتراف و اعتذار

منظومات

منشورات

مولانا حامد حسن قادری　　مولانا ضیاء احمد بدایونی　　مولانا ابوالاعلیٰ مودودی　　علامہ جمیل مظہری
مولانا امتیاز علی عرشی　　محمد طاہر فاروقی　　محمد اسحٰق صدیقی　　حاجی سید سجاد حسین
اثر لکھنوی　　مولانا عبدالماجد دریاآبادی　　مولانا غلام رسول مہر　　ڈاکٹر عندلیب شادانی
سید محمد تقی　　عابد رضا بیدار　　غلام مجتبیٰ خاں ہنر　　غلام احمد پرویز
نصیر الدین ہاشمی


احمد فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کراچی
کی خاص پیشکش
تازہ پھلوں اور پھولوں سے تیار کردہ
شربت نورس
اور بہترین آموں سے تیار شدہ
احمد مینگو سکویش
سے موسم گرما کو خوشگوار بنایئے اور
تحفہ
مفت حاصل کیجئے
شربت نورس اور احمد کے مینگو سکویش
کی ہر بوتل پر ایک ایک گفٹ ٹوکن باندھا گیا ہے۔ ان ٹوکنوں
کو اپنے پاس محفوظ کر لیجئے اور ۳۱ جولائی سے پہلے کراچی میں تین
اور مغربی پاکستان کے دوسرے مقامات پر چار ٹوکن دیکر
کسی بھی دوکاندار سے ہماری ایک خوبصورت اسپیشل ٹرے
حاصل کیجئے۔
مشروب وقت نورس
شربت نورس کی خوبیوں سے
کون واقف نہیں
مفرح اور مقوی ہونے کے ساتھ ساتھ
اس شربت کی انوکھی لذت نے اسے
خواص و عام میں انتہائی مقبول
بنا دیا ہے۔ آپ بھی پیجئے اور
احباب کو بھی پیش کیجئے۔
AHMED
NAURUS SYRUP
شربت نورس
AHMED
MANGO SQUASH
احمد مینگو سکویش

منتخباتِ نیاز

افاداتِ نیاز

فہرست حصّہ اوّل

ادب اور زندگی

فکر و فن اور شخصیت

تخلیق و تنقید



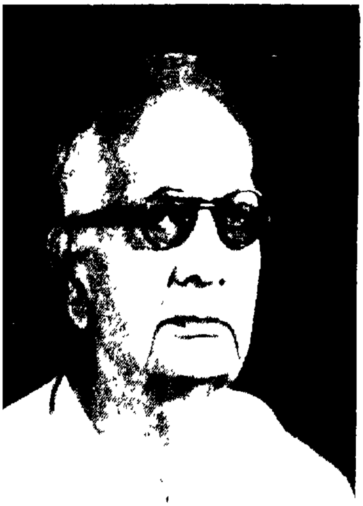


۱۹۲۸ء

۱۹۳۱ء



۱۹۵۲ء



۱۹۶۰ء

حضرت نیاز مختلف زمانوں میں



حضرت نیاز اپنے دو بیٹوں ریاض نیازی اور سرفراز نیازی کے ساتھ

ملاحظات

فرمان فتحپوری

نیاز نمبر حصہ اول کے بعد حصہ دوم آپ کے پیش نظر ہے اسے دراصل نیاز نمبر حصہ اول کا تتمہ خیال کرنا چاہیے جیسا کہ حصہ اول میں اظہار کیا جا چکا ہے۔ ان دونوں حصوں کو ایک ہی جلد میں شائع ہونا تھا لیکن بعض مشکلات کی وجہ سے سارے مواد کو اک ساتھ سمیٹنا ناممکن ہو گیا اور نیاز نمبر کو دو حصوں میں شائع کرنا پڑا۔

جن حضرات کی نظر سے حصہ اول گزر چکا ہے انھوں نے "ملاحظات" کے مطالعہ سے ہر دو حصوں کی ترتیب و تدوین کا پہلے ہی اندازہ کر لیا ہوگا۔ وہی ترتیب حصہ دوم میں برقرار رکھی گئی ہے چنانچہ جو لوگ، دونوں حصوں کو ملا کر اس پر نظر ڈالیں گے وہ مضامین کی ترتیب و تدوین میں منطقی ربط کے ساتھ ایک طرح کی جامعیت بھی ضرور پائیں گے۔

لیکن جن حضرات نے حصہ اوّل ملاحظہ نہیں فرمایا، وہ شاید حصہ دوم کو بعض وجوہ سے تشنہ اور غیر مربوط پائیں گے۔ بات یہ ہے کہ حصہ دوم کے مواد و مضامین کا حصہ اوّل سے گہرا ربط ہے اور جب تک دونوں حصے اک ساتھ سامنے نہ ہوں نیاز صاحب کے فکر و فن کی پوری تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے دونوں حصوں کے مضامین کی مکمل فہرست اس شمارے میں درج کر دی گئی ہے اس سے یقین ہے کہ حصہ دوم کے قارئین کو حصہ اوّل کے مواد و موضوعات کی اہمیت کا اندازہ کرنے اور نیاز کی علمی و شخصیت کو پوری طرح ذہن میں ابھارنے میں مدد ملے گی۔

"نیاز نمبر" بشمول حصہ اوّل و دوم کس نوعیت اور کس معیار کا ہے۔ اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں پہونچتا۔ کوتاہیوں اور خامیوں کے اعتراف کے ساتھ صرف اس قدر عرض کروں گا کہ میں نے نیاز نمبر کو ہوائی مضامین کے ذریعے خواہ مخواہ پھُلانا پسند نہیں کیا بلکہ اسے معتبر و مستند تاریخی دستاویز بنانے کی آرزو میں صرف معتبر و معیاری تحریروں کو جگہ دی ہے حتی الوسع انہیں لوگوں سے لکھوانے کی کوشش کی ہے جو 'نیاز و نگار' سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور ان پر تنقید و محاکمہ کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ نیاز نمبر میں بیسویں صدی کے تقریباً سارے ممتاز اہل قلم اور نیاز کے اکثر معاصرین کی رائیں محفوظ ہو گئی ہیں اور اسی لئے امید ہے کہ یہ نمبر کوتاہیوں کے باوجود بیسویں صدی کے ادبی رجحانات اور نیاز و نگار کی علمی و ادبی خصوصیات کو سمجھنے سمجھانے میں رہنمائی ضرور کرے گا۔

جہاں تک زیر نظر شمارہ کا تعلق ہے یہ چار خاص ابواب پر مشتمل ہے باب اوّل میں "نیاز و نگار" کے عنوان سے

وہ مقالات درج ہیں جن میں نیاز کی ادبیت وجامعیت اور نگار کی علمی وادبی روایت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں "اعتراف واعتذار" کے تحت منثور ومنظوم پیغامات وتاثرات اور معذرت نامے شامل ہیں۔ "منتخاب نیاز" کے ذیل میں نیاز کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب ہے۔ ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض نگار سے قبل کے بعض رسائل مثلاً الہلال، تمدن، نقاد اور صلائے عام میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ پرچے چونکہ اب نایاب ہیں اسلئے امید ہے کہ انتخاب قارئین کی دلچسپی کا سبب ہوگا اور نیاز کی شاعرانہ شخصیت کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ "افادات نیاز" میں نیاز صاحب کی تحریروں کا مفصل اشاریہ ہے۔ نیاز صاحب نے نگار میں جتنا کچھ لکھا ہے "ملاحظات" کو چھوڑ کر اس سب کی تفصیل اس میں آگئی ہے۔ یہ کام خاصا مشکل تھا لیکن قیصر ابن حسن صاحب کی توجہ نے اسے آسان بنا دیا اور امید ہے کہ یہ حصہ کسی موضوع پر نیاز صاحب کی رائے معلوم کرنے میں رہنما ثابت ہوگا۔ نیاز صاحب نے گزشتہ بیالیس سال میں "نگار" میں جن کتابوں پر تبصرہ کیا ہے ان کی مکمل فہرست بھی تبصرے کے نمونوں کے ساتھ اس شمارے میں شامل ہے۔ یہ فہرست عارف نیازی کی جانفشانی کا نتیجہ ہے اور امید ہے کہ اس سے بیسویں صدی میں علمی، ادبی اور فنی کتابوں کی رفتارِ اشاعت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ نگار سے قبل کی بعض تحریروں کا اشاریہ بھی عارف نیازی نے بعض پرچوں سے مرتب کر دیا ہے جو لوگ نیاز صاحب کے ذہنی ارتقا اور مزاج کو سمجھنا چاہتے ہیں انہیں ان تحریروں سے استفادہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

غرض کہ حصہ اوّل میں جو کمی رہ گئی تھی اسے حصہ دوم میں پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کوشش کے سلسلے میں میں نیاز نمبر کے قلمی معاونین کا حد درجہ شکر گزار ہوں جن کی لطف ارزانی کی بدولت "نیاز نمبر" نے نگار کے خاص نمبروں کی لاج رکھ لی ورنہ مجھے نیاز صاحب اور قارئین نگار دونوں کے سامنے ندامت اٹھانی پڑتی۔ مقالات کی فراہمی سے قطع نظر اشاعت وطباعت میں عارف نیازی کا ذکر بھی ضروری ہے اس لئے کہ اگر یہ انتظامی امور میں اس درجہ مستعدی اور محنت سے کام نہ لیتے تو نیاز نمبر کی دو ضخیم جلدیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا میرے لئے ممکن نہ ہوتا۔

"ابھی قیصر ارشد کاکوی مرحوم کا زخم ابھی مندمل بھی نہ ہوا تھا کہ پروفیسر سید ابوالخیر کشفی کی اہلیہ طاہرہ کشفی دو معصوم بیٹوں سمیت ایک حادثہ کے بہانے ناگاہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے روٹھ گئیں اور اپنے پرائے سب کو اشکبار کر گئیں۔ ابھی آنسوؤں کے تار ٹوٹنے بھی نہ پائے تھے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے قبل از وقت شوکت تھانوی کو بھی ہم سے چھین لیا اور بزم نگار دیکھتے دیکھتے ماتم خانہ بن گئی۔

ادارہ ان دلدوز سانحات پر سوگوار ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو اس بار غم کو اٹھانے کی طاقت بخشے" (ادارہ)

نیاز و نگار

یادِ ماضی

مانی جائسی

دن جاتے دیر نہیں لگتی، پچاس برس پہلے کی بات کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں مجھے جیسی نیاز صاحب فتح پوری سے بالو گنج (آگرہ) میں ایک خاتون کے مکان پر سب سے پہلے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لطیف الدین احمد اکبر آبادی (جو دنیائے ادب میں ل۔ احمد کے نام سے معروف ہیں) ڈاکٹر ضیائے عباس ہاشمی بدایونی (ضیائی) بھی موجود تھے۔ نیاز صاحب اب تو اپنے شعر سناتے ہی نہیں مگر اس زمانے میں، اور اس کے چند سال بعد تک سنا دیا کرتے تھے۔ یہاں انھوں نے اپنی ایک نظم "کویل سے" اور ایک غزل جس کا ایک شعر یہ ہے:

عزیزو ڈال دو تم میرے منہ پہ اک چادر　　اور ان سے کہہ دو کہ اب مجھ کو انتظار نہیں

پڑھی تھی۔ اور میں نے بھی ایک تضمین سنائی تھی اور شاید ایک غزل۔ تضمین غالب کی اس غزل پر تھی:

"بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی"

ضیائی نے بھی کچھ پڑھا۔ لطیف شعر کہتے ہی نہیں اگرچہ ان کا وجود بجائے خود شعر کی فضا کو دلچسپ تر بنا رہا تھا۔

کم و بیش دو گھنٹے یہ نشست رہی۔ اس کے بعد یہ اپنی منزل کی طرف چلے اور میں بھی ساتھ ہو لیا۔ نیاز اور ضیائی، لطیف کے یہاں من ٹولہ میں مقیم تھے۔ یہ بالو گنج سے زیادہ دور نہیں ہے۔ روزانہ دو تین گھنٹے کے لئے ملاقات ہوا کرتی تھی، کبھی بالو گنج میں کبھی من ٹولہ میں۔

اسی زمانے میں "نگار" ماہانہ رسالے کے اجرا کی بات چھڑی اور طے ہوا کہ نیاز صاحب فرائضِ ادارت انجام دیں۔ نیاز صاحب بھوپال چلے آئے اور وہیں سے ادارت "نگار" کرتے رہے۔ رسالہ آگرہ میں چھپتا تھا اور وہیں سے ہر مہینے پارسل کے ذریعے جاکر بھوپال ہی سے تقسیم ہوتا تھا۔ چند ہی روز میں "نگار" نے وہ شہرت اور مقبولیت ملک میں حاصل کی کہ شاید و باید اور آج تو نیاز صاحب کے زورِ قلم نے "نگار" کو وہ خصوصی حیثیت عطا کر دی ہے اور وہ امتیازِ اعلیٰ بخشا ہے کہ دنیائے اردو میں اس کا جواب نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مدیر نگار حضرت علامہ نیاز فتح پوری کی بے مثال علمی جامعیت، لاجواب خداداد ذہانت اور کمالِ حسنِ ترتیب اور سلیقۂ ادارت نے رسالے کو اس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں پر مارنا کسی اردو رسالے کے بس کی بات نہیں۔

جی چاہتا ہے کہ نیاز صاحب کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں پر مبسوط تبصرہ کروں لیکن صحت اس منزل پر ہے کہ الحمد ہو اللہ دو چار دقیقوں کے لئے بھی کسی کام کی طرف متوجہ ہونے کو آمادہ نہیں ہوتی۔ طبیعت بہت آمادہ ہو، طاقت کہاں اور یہ امکاں کب ہے کہ دو چار ہفتے ان کے شاہکاروں کا مطالعہ کروں اور کچھ نمونہ ہائے جواہر پیش کروں۔

امریکہ سے کسی خاتون نے حضرت نیاز کے متعلق ایک پورا رسالہ "نگار" اپنے رشحات نگارش سے سیراب کر دیا ہے، مجھے اس وقت مہینہ یاد نہیں ورنہ پتہ واضح ہو جاتا۔ خوب ہے اور حقیقتاً خوب ہی دقتِ نظر اور سلیم المذاقی کی داد دی ہے۔

اب میں نیاز صاحب کی صرف چند خلقی خصوصیات اور اپنے ان کے تعلقات کے سلسلے میں کچھ لکھ کر مضمون کو تشنہ اور اپنے کو ناکام چھوڑتا ہوں۔

نیاز صاحب جیسے اپنی علمی و ادبی خصوصیات میں فردِ کامل ہیں ویسے ہی بحیثیت انسان، انسان اور بحیثیت دوست، دوست ہیں، جس کے دوست ہوں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے دل میں اپنے ملنے والوں کے لئے مدارج ہیں۔ ایک ہی خانے میں سب کو نہیں رکھتے، میں خلقِ عمیم کو معتبر نہیں سمجھتا ——— معاشرت میں نیاز صاحب کی شگفتگی اور حلم ان کے قابلِ رشک خصائص ہیں۔

بھوپال میں ہمارا حلقۂ احباب چند افراد پر مشتمل تھا، روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور کیا کہوں زندگی کس لطف سے گذرتی تھی ——— خود نیاز صاحب، ملک حبیب احمد، فخر الحسن (یہ ایک نوجوان اور نہایت ہونہار انشا پرداز تھے نیاز صاحب کے داماد بھی لیکن افسوس کہ جوان مر گئے) ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی، ماسٹر نادر علی۔ وہ لطف مستزاد ہوتا جو دوسرے تیسرے مہینے دو چار روز کے لئے ضیائی اور لطیف کے آجانے سے میسر ہو جاتا تھا۔ سبھی بلند پایہ ادیب تھے ضیائی تو بڑے ہی خوش گو شاعر بھی ہیں ماسٹر ناصر علی مرحوم بھی شعر خوب کہتے تھے۔

بھوپال ہی کا ذکر ہے کہ چند مہینوں کو میرے اور نیاز صاحب کے درمیان شکر رنجی ہو گئی تھی۔ اب ان کی شرافتِ نفس دیکھئے۔

ایک روز بعد مغرب میں لکھیرہ پورہ (بھوپال) میں اپنے بالاخانے پر تنہا بیٹھا ہوا تھا، دفعتہً کسی نے پکارا۔ میں اٹھ کے زینے پر گیا، وہیں سے دریافت کیا۔

"کون صاحب ہیں!"

"میں ہوں نیاز محمد۔"

"فرمائیے!"

"کیا میں اوپر آسکتا ہوں؟"

"تشریف لائیے۔"

آئے اور بیٹھ کر کہنے لگے۔

"مانی صاحب، میں اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا کہ دراصل میرا کوئی قصور ہے یا نہیں۔ جو الزام بھی آپ مجھ پر رکھتے ہوں تسلیم ہے لیکن دنیا میں اگر خطا کوئی چیز ہے تو عفو بھی کوئی چیز ہے۔"

میں نے فی الفور کہا

"اچھا نیاز صاحب معاف کیا۔"
کہنے لگے۔
"یوں معافی نہیں، دل سے کدورت نکال دیجئے۔"
میں نے کہا۔
"کیا آپ میرے قول و عمل کو میرے دل کی بات نہیں سمجھتے۔ نیاز صاحب۔ اب کوئی ملال میرے دل میں نہیں اور میں وہی ہوں جو آپ کے نزدیک کبھی تھا۔"

نیاز صاحب کے اس فقرے نے کہ "اگر دنیا میں خطا کوئی چیز ہے تو عفو بھی کوئی چیز ہے۔" میری روح کو جیسے جھنجھوڑ دیا اور ہرگز کوئی طولانی سے طولانی معذرت مجھے اس طرح متاثر نہ کر سکتی تھی۔ یہ فقرہ ان کے تفکر اور نفسیاتی مہارت کا کارنامۂ عظیم ہے اور میں نے اکثر صحبت احباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ کہہ کے ذکر کیا ہے کہ نیاز صاحب ہی یہ فقرہ بول سکتے تھے۔ اب تو میرے اور نیاز صاحب کے حالات سے یہ شعر مطابقت کرتا ہے، پوری مطابقت کرتا ہے۔

او مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق		او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

ایک ادبی لطیفہ

"لارڈ جارج انگلستان کی ایک بڑی مشہور ہستی گزری ہے اور اس نے جس شان سے وہاں کی وزارتِ عظمیٰ کی خدمات انجام دیں، وہ مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی۔ اس کی کامیابی کے متعدد اسباب تھے لیکن سب سے بڑی صفت اس میں یہ تھی کہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بھی اس کا دماغی توازن خراب نہ ہوتا تھا۔

انتخاب کا زمانہ تھا اور ہر شخص اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ لارڈ جارج بھی مختلف جلسوں میں اپنے انتخاب کا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔

ایک دن وہ کسی جلسہ میں لوگوں سے خطاب کر رہے تھے کہ دورانِ تقریر میں ایک عورت جو لارڈ جارج سے سخت متنفر تھی اٹھ کھڑی ہوئی اور لارڈ جارج کو مخاطب کر کے بولی کہ "اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو تمہیں زہر دے دیتی۔" ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشتعل کر دینے والا فقرہ تھا اور لارڈ جارج کی جگہ اگر دوسرا شخص ہوتا تو یقیناً برہم ہو جاتا اور خدا معلوم کیا جواب دیتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے لارڈ جارج نے اس کا کیا جواب دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے عورت سے کہا کہ "اے محترم خاتون اگر میں تمہارا شوہر ہوتا تو اس زہر کو میں نہایت خوشی سے پی جاتا۔"
لارڈ جارج کے اس فقرہ نے سارے مجمع کو اس کا طرفدار بنا دیا اور آخر کار ووٹ اسی کو زیادہ ملے۔" (نیاز)

حضرت نیاز سے میرا تعارف

(پرنسس) عابدہ سلطان (بھوپال)

چونکہ میری تعلیم و تربیت ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ جنت مکان کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی اس لیے میری تعلیم کی ابتدا قرآن و حدیث سے ہوئی اور اس سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی وغیرہ پر زور دیا گیا۔ اردو کو مادری زبان ہونے کی حیثیت سے اس طرح نظر انداز کیا گیا کہ نہ لکھنا سکھایا گیا نہ پڑھنا۔ اور اردو لٹریچر سے میں حسب دلخواہ واقف نہ ہو سکی۔

ان حالات میں قبلہ نیاز صاحب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنا ایسا ہے جیسے آفتاب کے آگے شمع روشن کرنا۔ تاہم نیاز نمبر میں اپنی شرکت کو باعث سعادت سمجھ کر یہ چند سطریں قلمبند کر رہی ہوں۔

یوں تو نیاز صاحب کا قیام بھوپال میں سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک رہا لیکن وہ زمانہ میری کم سنی کا تھا اس لئے میں ان کے وجود سے اس وقت تک بے خبر رہی جب تک کہ نگار نے مجھے اپنی طرف مخاطب نہ کیا۔

سرکار عالیہ خلد آشیاں کے زمانے میں میرے مطالعہ کے لئے صرف نگار اور ہمایوں، دو رسالوں کی اجازت تھی۔ اور اگرچہ میں اس کم عمری میں نہ نگار کو پڑھنے کی استعداد رکھتی تھی نہ اس کے مضامین کو سمجھنے کی صلاحیت، لیکن جس طرح ایک ناواقف شخص فن موسیقی سے بیگانہ ہوتے ہوئے بھی بعض بعض راگوں میں ایک مخصوص کشش محسوس کر کے ان سے متاثر و لطف اندوز ہوتا ہے اسی طرح میں نگار میں ایک مخصوص کشش محسوس کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر اس سے رشتۂ محبت قائم کر چکی تھی اور یہ رشتہ عمر اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا حتیٰ کہ سرکار عالیہ کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر سے اٹھنے کے بعد کچھ عرصہ بعد نگار کا آنا بھی بند ہو گیا۔

مگر سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب میں اپنے گھر میں منتقل ہو کے خود مختار ہوئی تو میں نے نگار پھر جاری کرا لیا اور اب اس سے روز بروز دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ میں نے نیاز صاحب کو

The king of Urdu literature and a living Encyclopaedia.

کا خطاب دے دیا۔ ساتھ ہی یہ شوق پیدا ہوا کہ میں خود ان سے استفادہ کر سکوں لیکن مختلف وجوہ کی بناء پر اس وقت یہ کوشش اور امید بیکار تھی۔ اس کے بعد جب شہریار میاں سلمہٗ کے لئے اردو اتالیق کے انتخاب کی تجویز میرے والد ہز ہائی نیس نواب حمید اللہ خاں صاحب نے پسند فرمائی تو میں نے جن منظر صاحب کے سپرد یہ انتظام کیا تھا اُن سے نیاز صاحب کے متعلق تذکرہ کیا۔

شروع میں تو انہوں نے ٹال دیا اور دوسرے نام تجویز کئے۔ لیکن جب مجھے بہت زیادہ مصر پایا تو ناراض رہنے لگے اور معاملہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت بہ اینجا رسید کہ ایک روز انہوں نے بالکل صاف انکار کر دیا کیونکہ (نیاز صاحب) اُن کے خیال میں دہریے تھے۔

چونکہ میں بھی عرصہ سے نگار کو بہت اشتیاق اور غور سے دیکھتی چلی آ رہی تھی اس لئے منسٹر صاحب کے اس نظریہ سے میں نے اختلاف کرتے ہوئے بہت بحث کی آخر میں وہ جھنجھلا کر بولے۔

"آپ نیاز کو کہاں سے اور کیسے جاننے لگیں۔ یہ کس لئے آپ کے دل میں ان کا خیال جما ہوا ہے۔"

میں نے کہا کہ "ذاتی طور پہ ملاقات کا تو اتفاق نہیں ہوا صرف نگار دیکھ دیکھ کر ان کی معترف ہو گئی ہوں اور سوچتی ہوں کہ شہریار میاں کی بدولت مجھے بھی کچھ حاصل کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔"

پھر تو منسٹر صاحب کی ناگواری کی کوئی حد نہ رہی۔ کہا:—

"نگار یہاں کیوں اور کیسے آیا"

میں نے جواب دیا "سرکار اماں منگاتی تھیں۔ پھر اب ہم خود منگاتے ہیں۔"

"کہا یہ ہرگز نہیں آ سکتا۔ اور یہ کیسے یہاں آتا ہے۔"

میں نے کچھ حیرت زدہ ہو کے کہا۔ کہ "وہ ڈاک سے ہی آتا ہے۔"

کہا "میں ابھی جا کے بند کرواتا ہوں۔ اور دیکھوں گا کہ اب وہ کیسے ریاست بھوپال کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔"

اب میری حالت یہ ہو چکی تھی۔ کہ

؎ شوق بڑھتا گیا گناہوں کا لذتِ انفعال نے مارا!

میں نے کہا جو آپ سے ہو سکے وہ ضرور کیجئے۔ اور اگر نگار بھوپال میں آنا بند ہو گیا تو میں موٹر پر بھیلسہ جا کر لایا کروں گی لیکن خیریت رہی نگار ڈاک سے آنا بند ہوا اور نہ مجھے بھیلسہ جانا پڑا۔ اور اسی ضد پر نیاز صاحب کو میں نے بطور مہمان کچھ دنوں بلا کے اپنے پاس رکھا تاکہ بھوپال میں ان کا داخلہ بند ہونے کی بھی آزمائش کر لی جائے۔ البتہ نیاز صاحب ان حالات سے ناواقف رہے...... ان کے دورانِ قیام میں۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ اگر صحیح طریقہ پر ان سے درخواست کی گئی تو اتالیقی کے لئے شاید آمادہ ہو کر بھوپال آ جائیں گے......

شہریار میاں اس وقت سات آٹھ سال کے تھے۔ اس لئے میں نے اس میں کوئی خاص عجلت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ آئندہ بہت وقت و موقعہ مل جائے گا۔ مگر جلد ہی پھر انقلابات آنا شروع ہو گئے اور تقسیم ہند کے بعد نہ بھوپال بھوپال رہا نہ شہریار میاں کو آج تک اردو لکھنا پڑھنا نصیب ہوا۔ البتہ میری عقیدت نیاز صاحب سے دن بدن بڑھتی چلی گئی اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ سنا کہ وہ مستقلاً پاکستان تشریف لے گئے ہیں۔ اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر کا بھی ہے۔ اور کچھ اثر اپنی دعاؤں کا بھی!.....

—*—*—*—*—*—

نیاز اور نگار

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اردو اخباروں اور رسالوں کے موجودہ معیار اور مذاقِ ادب پر نظر ڈالی جائے تو یہ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان، اس کے ادب، شاعری، تنقید اور اسالیب کی نشو و نما اور فروغ میں سب سے زیادہ حصہ اخباروں اور رسالوں کا ہے۔ اول تو کتابیں ہمارے یہاں لکھی ہی کم جاتی ہیں۔ شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے، پھر ان کتابوں کے پڑھنے والے اور بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر سال جتنے مضامین لکھے جاتے ہیں وہ زیادہ تر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں ہر طرح کے اخبار اور رسالے ہیں ایسے بھی جنھیں صرف کاغذی چیتھڑا کہنا چاہیے اور بقول ہمارے ایک دوست کے کتب خانوں کی الماریوں میں محفوظ کرنا تو در کنار اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ ان کو الماریوں کی زینت بنایا جائے۔ ان میں سے بعض صرف ترقی پر زندہ ہیں، بعض پرانی قبروں کے مجاور ہیں۔ بعض گفتنی اور ناگفتنی قسم کے امراض اور زنانہ جنسی بیماریوں کے علاج اور قوتِ مردمی کی دواؤں کے اشتہارات کی برکت سے زندہ ہیں ان اشتہاروں کو پڑھ کر بہتوں کا بھلا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ان کے شائع کرنے والوں کا بھلا ضرور ہوتا ہے۔ کچھ رسالے اربابِ سیاست، ارکانِ حکومت اور سیاسی جماعتوں کی سرپرستی سے زندہ ہیں۔ انہیں سرکاری اشتہارات ملتے ہیں۔ ان کے پرچوں کی ایک بڑی تعداد مفت تقسیم کرنے اور ردی میں بیچنے کے لئے خریدی جاتی ہے۔ ایک نئی جنس رسالوں کی زمانہ حال کی پیداوار ہے۔ یہ ناشرین کے رسالے ہیں جس کے لئے وہ خود کوزہ و کوزہ گر و خود گلِ کوزہ ہیں۔ وہی اس کے مدیرِ اعلیٰ، وہی مضمون نگار، وہی نقاد، وہی مبصر اور وہی مالک ہوتے ہیں اور از راہِ سرپرستی چند مفلوک الحال اور مجہول الاسم مصنفوں کی نگارشات کو بڑی آب و تاب سے شائع کر کے گویا ادب اور زبان کی بڑی مسیحائی کرتے ہیں، ان رسالوں میں متعلقہ کم اور ان کی مطبوعات کے اشتہارات ان کی تعریف میں تبصرے اور ان کے منظورِ نظر ادب کی آبیاری کرنے والے نام نہاد شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔ کاتب دیکھتے دیکھتے مدیر، مدیر اعلیٰ، مصنف، نقاد اور صاحبِ طرز انشا پرداز بن جاتے ہیں اور اب جو گفتگو کرتے ہیں تو میں کی بجائے ہم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور قسم کے رسالے ہیں جو ادب کے سرپرست سرکاری حکام نکالتے ہیں اور گویا اپنے اصلی منصب پر فائز ہونے میں ان کی جو کسر باقی رہ جاتی ہے اسے ادبی خدمت کے جلووں سے دھونا چاہتے ہیں۔ ان کے رسالے بھی بڑی آب و تاب سے نکلتے ہیں اور ان کے اخراجات "من فضلِ ربی" ہوتے ہیں۔ آخر بڑے بڑے بلیک مارکیٹ کرنے والے، درآمد برآمد کے آڑھتی، سرمایہ دار اور کارخانہ دار بھی تو اپنی دولت کی کچھ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اس سے اچھا کیا ہے کہ ایک تیر سے دو شکار کرتے ہیں۔ ادب کی سرپرستی بھی ہو جاتی ہے اور ادیبِ کامل کی خوشنودی بھی۔ گویا دونوں جہاں میں سرخروئی اسی سے حاصل ہوتی ہے اور پھر ایسے اخبار اور رسالے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مالی افکار سے محفوظ و مامون رکھا ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں لاٹھی ہوتی ہے یہ اس کی بھینس ہوتے ہیں لیکن بھینس کا دودھ صرف چند لوگوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ ہر شخص کا معدہ اسے ہضم نہیں کر سکتا، اس لئے ایسے لوگوں کو ان بھینسوں کے دودھ کا استعمال ممنوع ہے۔

ایک قسم کے رسالے اور ہیں جنہیں بعض سرپھرے لوگ نکالتے ہیں۔ یہ خود رسالدار یا رسالہ دار نہیں ہوتے اور نہ رسالے والے ان کی سرپرستی کرتے ہیں یہ اپنے شوق سے رسالہ نکالتے ہیں اور جیسے بہت سی بازیوں کا شوق بالآخر شوقینوں کی جیب خالی کرا لیتا ہے اسی طرح رسالہ بازی کا شوق انہیں مفلوک الحال بنا دیتا ہے۔ انہیں ایسے رسالوں سے آمدنی نہیں ہوتی بلکہ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ ان رسالوں کی خدمت میں صرف ہوتا ہے۔ ان کی مخالفت ہوتی ہے۔ ان کو گالیاں نصیب ہوتی ہیں، ان پر فتوے صادر کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ یا تو وہ خود مرحوم ہو جاتے ہیں یا اُن کے رسالے دم توڑ دیتے ہیں۔ کوئی بڑا ہی سخت جان ہوگا جو ان حملوں کے بعد بھی باقی رہ جائے۔ اور ان میں ایک نگار بھی ہے۔

میں نگار کو اس سلسلہ کی ایک کڑی سمجھتا ہوں جس میں تہذیب الاخلاق اور مخزن جیسے رسالے شامل ہیں۔ تہذیب الاخلاق تو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں نشاۃ الثانیہ کا نقیب ہے۔ اس نے اردو میں ہر قسم کے علمی اور تہذیبی موضوعات اور مباحث کی بنا ڈالی اور مضمون نگاری کے فن کو رائج کیا۔ ممکن ہے بعض لوگ تاریخی اعتبار سے سرسید احمد خاں کو اردو کا پہلا مضمون نگار تسلیم نہ کریں اور یہ بھی درست ہے کہ اردو کا پہلا رسالہ ماسٹر رام چندر داس نے خیر خواہ ہند کے نام سے نکالا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود تہذیب الاخلاق اور سرسید کو انکی حیثیت اور اہمیت سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ سرسید نے اپنے پرچے کے ذریعے سے زبان اور ادب کی خدمت کی۔ اردو کو ایک ایسے اسلوب سے آشنا کرایا جس کی بنیاد سادگی اور بے تکلفیٔ گفتگو پر ہے اور جو کسی بھی شائستہ زبان کا علمی اور سنجیدہ طرز ہوتا ہے۔ انہوں نے بحیثیت تہذیب اخلاق کی کوشش کی۔ تعصب، جہالت، بحث و تکرار اور تقلید کی بیخ کنی کی روشن خیالی اور آزادیٔ رائے کے تصورات کو عام کیا۔ سیاسی اور سماجی جمود و تعطل کو توڑا، اور ایسے خیالات کا اظہار کیا جن سے بہت سے لوگوں کو اس وقت بھی اختلاف تھا اور آج بھی ہے لیکن ہاں جن لوگوں نے سرسید کی نیت اور خلوص میں شبہ کیا تھا آج تاریخ نے سرسید کو ان الزامات سے بری کر دیا ہے۔ آج انکی شخصیت ہماری سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی اور ادبی دنیا میں ایسی ہے جیسے بونوں کی بستی میں کوئی دیو یا العقل میر حشرات الارض کے مقابلہ میں اژدر۔

اردو کے تاریخی رسالوں میں مخزن بھی بطور خاص قابل ذکر ہے۔ جس نے شیخ عبدالقادر کی ادارت میں انہیں نقوش کو اجاگر کیا جو تہذیب الاخلاق میں پہلی مرتبہ نمودار ہوئے تھے۔ یہ دونوں رسالے صرف رسالے نہیں ایک تحریک ہیں، تہذیب الاخلاق کی تحریک جس میں سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، آزاد، محسن الملک، وقار الملک سب شامل ہیں اور مخزن کی تحریک جس میں عبدالقادر سے اقبال تک کتنے ہی درخشاں نام ملتے ہیں۔ نگار کو بھی ایک رسالہ ہی نہیں ایک تحریک سمجھتا ہوں۔

جن لوگوں نے نگار کا باقاعدہ اور مسلسل مطالعہ کیا ہے وہ تائید کریں گے کہ نگار اردو کے علمی رسالوں کی فہرست میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اگرچہ اس میں اعلیٰ درجے کی غزلیں اور نظمیں، اور کبھی کبھی اچھے افسانے بھی شائع ہوئے ہیں لیکن نگار کی اپنی خصوصیت علمی، تاریخی اور تنقیدی مضامین کا وہ سلسلہ ہے جو سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات میں بکھرا پڑا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس باب میں نگار کا مذاق عامیانہ تو کیا ہوتا عام پسند بھی نہیں خاص پسند بلکہ خاص الخاص پسند ہے اور اس اعتبار سے اس کی مقبولیت کا حلقہ بھی محدود ہے۔ لیکن یہ محدود حصہ خاصان ادب کا ہے جن کی تحسین اور تنقید دونوں میں وزن اور وجدان ہے نگار کے مدیر اور اس کے اکثر مضمون نگار اس حیثیت سے واقف نہیں اس لئے شروع سے آج تک نگار کا ایک مستقل معیار اور اس کا اپنا ایک مسلک رہا ہے۔ یہ ایسا پودا نہیں کہ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اسے جس طرف چاہے جھکا دے۔ بلکہ اکثر لوگوں کو تو اس کی بغاوت اور سرکشی کی شکایت ہے جس کے لئے نیاز اور ان کے مضمون نگار برابر کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔

نگار کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ یہ مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہے غالباً اس کا ایک سبب یہ ہے کہ نیاز صاحب خود اپنے مزاج میں خالص مشرقی ہیں۔ بالخصوص فارسی زبان، شاعری اور اسالیب ان کے اپنے مزاج اور انداز میں ایسے رچ گئے ہیں کہ اب وہ ان کی زندگی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ اردو کے کم رسالے ایسے نکلیں گے جن میں فارسی شاعری اور ادب کی چاشنی یا ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہوگا، جتنا کہ

نگار میں لکھا جا چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اردو میں غالب سے عجمی مزاج کے قدردان ہیں وہ نگار کی اس خصوصیت کو سب سے زیادہ محسوس کرتے ہیں اب زمانے کا مذاق بدل چکا ہے۔ ہماری تہذیب مغرب زدہ ہو کر اپنے اصلی ملفوظات اور سرچشموں کو بھولتی جا رہی ہے۔ فارسی کی تعلیم جو پہلے تہذیب و شائستگی کی ایک علامت تھی انگریزی کے سامنے سپر ڈال چکی ہے اور اس کی بدولت ہماری پوری نسل حافظ کی شیرینی، سعدی کی فصاحت اور خیام کی مستی یا بیدل کی حکمت سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہو چکی ہے۔ یہ بات تعجب کی نہیں کہ اردو اخبار اور رسالے بھی جو عوام کے مذاق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اس مشرقی مزاج کے آئینہ دار نہیں رہے ہیں نگار کا دم اس اعتبار سے غنیمت ہے۔

نگار کے سلسلہ میں ایک اور اہم پہلو اس کا علمی پہلو ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو نیاز صاحب کے بعض معتقدات اور نظریات سے بنیادی اختلاف ہو اور یہی بات نگار کے بعض اور مضمون نگاری میں بھی پائی جاتی ہو لیکن اس اختلاف کے باوجود یہ بات قطعی ہے کہ نگار کے مباحث اور موضوعات اور نگار کے مضمون نگاروں کے عام اسلوب میں علمی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اس علمی متانت اور سنجیدگی کو قائم رکھنے میں بڑے صبر اور استقلال کی ضرورت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اردو اخباروں اور رسالوں پر ایک بڑا پر آشوب دور آیا تھا جب مالی اعتبار سے اردو کے اچھے سے اچھے رسالوں کو بڑا خسارہ ہو رہا تھا اور بعض رسالے تو اس بنا پر بند ہی ہو گئے۔ بعض نے اپنی آمدنی میں اضافہ کے لئے مختلف ذرائع سوچے۔ اس وقت رسالہ جامعہ دہلی، اردو کے ممتاز پرچوں میں تھا اور جامعہ ملیہ اور قومی تحریک کا ایک آئینہ دار ہونے کے باعث اچھے پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول تھا۔ جو لوگ جامعہ ملیہ کے ارباب حل و عقد کے سیاسی افکار سے پوری طرح متفق نہ تھے وہ بھی جامعہ پڑھتے اور اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس مالی بحران میں جامعہ والوں نے نئے پرچے میں اشتہار شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ بدقسمتی سے جو اشتہارات شائع ہوئے ان میں ایک اشتہار ایک جرمن دوا کا تھا جو مردانہ قوتوں کو بحال کرنے کے لئے ایک کامیاب دوا بتائی گئی تھی۔ نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمان خاں صاحب شیروانی بقید حیات تھے۔ انہوں نے یہ اشتہار دیکھا تو بڑے آزردہ ہوئے اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو لکھ بھیجا کہ اب جامعہ کے بھی یہ دن آ گئے۔ اور یہ اشتہار آنا بند کر دیا گیا۔ حالانکہ ایک بات اس اشتہار کے سلسلہ میں اور تھی، جو صاحب اس کے تقسیم کنندہ تھے وہ جامعہ کے بڑے حامیوں میں تھے اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ جامعہ کی مدد کے لئے دیتے تھے۔ یہ بات بڑی تعریف کی ہے کہ نگار نے اس باب میں اپنے مسلک میں راسخ رہ کر ایک اچھی روایت کو استحکام بخشا ہے ورنہ آج اردو کے بہت سے رسالوں کو پڑھ کر جہاں افسانوں، غزلوں اور نظموں کے مطالعہ سے ایک مریضانہ ذہنیت اور بیمار سماج کا احساس ہوتا ہے وہاں انہیں رسالوں میں جنسی بیماریوں کے علاج اور دواؤں کے اشتہارات کی کثرت سے پڑھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس ملک میں ہر شخص امراض جنسیہ میں مبتلا ہے یا نہیں ہے تو ایک نہ ایک دن فرد ہوگا۔ اس اعتبار سے اردو کے چند ہی رسالے ایسے ہیں جنہوں نے ایک صحت مندانہ روش اختیار کی ہے، نگار یقیناً اس فہرست میں شامل ہے۔

اردو اخباروں اور رسالوں کے باب میں ایک عام شکایت یہ بھی ہے اور کسی حد تک اکثر اور بیشتر رسالوں کے بارے میں اب بھی ہے کہ ان کی علمی اور ذہنی سطح بہت پست بلکہ کبھی کبھی عامیانہ ہو جاتی ہے۔ تہذیب الاخلاق یا مخزن نے اردو رسالوں کے لئے جو بلند معیار قائم کیا تھا اسے چند ہی رسالے نباہ سکے اس کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ اول تو اس ملک میں خواندگی کی شرح ہی بہت کم ہے اور پھر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد تو اور بھی کم ہے اور بدقسمتی سے یہ طبقہ بھی انگریزی کا دلدادہ رہا ہے۔ اگرچہ ان کو اپنی دوسری ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں میں اس کا موقع ہی کم ملتا ہے کہ وہ کتابیں اور رسالے پڑھیں اور اگر پڑھنے کے لئے وقت ملے بھی تو یہ انگریزی کے اخباروں اور رسالوں کی سرپرستی کرتے ہیں اور قدرتی طور پر اردو رسالے نکالنے والے عام قارئین کی طرف توجہ کرتے اور ان کے مذاق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ سرسید نے علمی، ادبی، تاریخی، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل پر غور و فکر کی جو روایت قائم کی تھی، تہذیب الاخلاق اس کا آئینہ تھا، جن لوگوں نے نگار کے پرچوں کا مطالعہ کیا ہے انہیں نگار میں ایسی ہی جھلکیاں نظر آتی ہیں، بعض لوگوں کو نیاز کے مضامین، اور بعض مضامین کے خیالات اور معتقدات سے اتفاق نہ ہوگا۔ سرسید سے بھی بعض لوگوں

کو اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نگار نے اور خاص طور پر نیاز صاحب نے آزادی فکر و نظر اور آزادی گفتار و قلم کی ایک صحت مند اور جرأت مندانہ روایت کو پروان چڑھایا ہے۔ جس معاشرہ میں جہالت عام ہو، تعصب اور کوتاہ نظری پر لوگ فخر کرتے ہوں۔ روایت پرستی جہاں جزو ایمان سمجھی جائے وہاں ایسی روایت قائم کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا آسان نہیں۔

کسی معاشرہ کی ذہنی صحت مندی کا ایک اندازہ لوگوں میں تحقیق و تلاش کے شوق و ذوق سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ اس اعتبار سے ہماری زبان و ادب کے سرمایہ کا بڑا حصہ ہمارے ذہنی افلاس کا مرثیہ خواں ہے۔ میں تخلیقی ادب کی حیثیت اور اہمیت کا منکر نہیں۔ اعلیٰ درجہ کے اشعار کی تخلیق میں فنکار کا جو خون جگر صرف ہوتا ہے میں وہ بھی جانتا ہوں۔ اسی طرح اعلیٰ درجے کے ناول اور افسانے یا اچھے ڈرامے کی تخلیق بھی قابل تعریف و تحسین ہے لیکن جو لوگ اکثر فخریہ کہتے ہیں کہ چائے کی ایک پیالی سامنے رکھ کر وہ ایک افسانہ لکھ ڈالتے ہیں اور پیالی ختم ہونے تک افسانہ بھی تکمیل کی منزل کو پہنچ جاتا ہے وہ جیسا افسانہ لکھتے ہیں ظاہر ہے تحقیق کے مراحل بڑے صبر آزما ہوتے ہیں۔ کانٹا اور دوڑے سے یہاں کام نہیں چلتا۔ اس لئے اگر کسی کتاب یا رسالے میں ہمیں علمی یا تاریخی تحقیق و تلاش کا مذاق نظر آتا ہے تو اسے ایک صحرائے لق و دق میں نخلستان سمجھنا چاہیئے اور نگار کو اردو کے رسالوں میں یہ امتیاز ضرور حاصل رہا ہے اور اس کے لئے نیاز صاحب کی اپنی تحریریں بھی ایک حد تک ذمہ دار ہیں۔

اگرچہ اخباروں اور رسالوں کے مضامین مستقل تصانیف کے مقابلہ میں بہت جلد فراموش ہو جاتے ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض مضامین اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں محفوظ کیا جائے۔ نگار نے اپنی زندگی میں ایسے بے شمار مضامین شائع کئے ہیں۔ افسوس ہے کہ اب تک نگار میں شائع ہونے والے مضامین کا کوئی مکمل اشاریہ[1] بھی شائع نہیں ہوا ہے۔ ورنہ اس سے اندازہ ہوتا کہ اور چیزوں کو چھوڑ کر اردو شاعری اور تنقید کے موضوعات پر ہی نگار میں ایسے بلند پایہ مقالات شائع ہوئے ہیں جن کی اہمیت اور حیثیت مستقل تصانیف کی ہے۔ اگر ایسے مضامین سے انتخاب نگار مرتب ہو جائے تو اردو پڑھنے والوں کے لئے ایک یادگار تالیف ہوگی۔

" کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چیز جہل کو دور کرنے کے لئے آئے گی اس کی ابتداء عہد تاریک سے ہوگی اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کر چکیں گی تو دور اصلاح ختم ہو جائے گا اگر اس کا مقصود کسی انسان کو محدود منزل تک پہونچا کر ٹھہر جاتا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جس کے دائرۂ عمل سے تعین منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی ...... تگ و دو کی جولانگاہ قرار دیا ہے یا جس کا مدعا عقول انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے جس کی دعوت عالم انسانی کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر سکتی ہے اور جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہو کر انقیاد فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہو جاتا ہے۔"

نیاز

---

[1] دوسرا شمارہ: ڈاکٹر صاحب نے جس اشاریہ کا ذکر کیا ہے وہ اسی اشاعت میں شامل ہے

بیادِ آں نگارے

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

میں اور میری عمر کے جتنے اشخاص آجکل موجود ہیں اس وقت صرف ابتدائی درجوں کے طالب علم تھے جب نیاز صاحب اردو صحافت کی فضا پر چھا چکے تھے، ہم سب ان کے ادب لطیف اور جوش و تازگی سے بھری نثر سے بے حد متاثر اور مرعوب تھے۔ ہر ماہ ان کے قلم کی جنبشوں کو نگار میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے کے منتظر رہتے تھے۔ نگار کا ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ شاید اس کی مقبولیت کا بہترین زمانہ تھا، شہاب کی سرگزشت، جو کیوپڈ و سائیکی کی رنگین داستان، جمالستان، خیال آرائیاں سب انتہائی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں کیونکہ یہ طرز نگارش اردو ادب میں ایک نیا اسلوب تھا نہایت جاندار نہایت جوان اور باوجود سرمستی کے باوقار بھی تھا اور رنگین بھی۔

میں ۱۹۲۸ء میں نیاز صاحب سے سب سے پہلے متعارف ہوا۔ وہ اس وقت امین آباد لکھنؤ میں ایک بڑے مکان میں رہتے تھے ان کا پریس بھی وہیں تھا۔ میں اس زمانے میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور مجھے آج تک یاد ہے کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی جب اسی زمانے میں میرا سب سے پہلا تنقیدی مضمون نگار میں اشاعت کے قابل سمجھا گیا تھا۔ زمانہ بدلتا گیا، میں اپنی تعلیم و ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۵ء تک علی گڑھ اور دہلی میں رہا جب ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ واپس آیا تو محلہ نیا گاؤں میں قیام پذیر ہوا۔ نیاز صاحب اسی محلہ میں کئی سال پہلے سے سکونت اختیار کر چکے تھے اور ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ اب وہ میرے ہم محلہ تھے۔ مکان قریب ہی تھا اس لئے نیاز صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کے اکثر مواقع ملتے رہے اور مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ نیاز صاحب مجھ سے بڑی محبت اور شفقت فرماتے تھے۔ جب ملاقات ہوتی تو مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی بہت سی غیر ادبی بھی مثلاً صحت، غذا، ہومیوپیتھی وغیرہ۔ نیاز صاحب اپنی صحت کے معاملہ میں بڑے چوکس رہنے والے آدمیوں میں سے ہیں اور میں بیمار رہنے والوں میں سے ہوں اس لئے اس موضوع پر اکثر تبادلہ خیال رہتا۔ وہ ایک تو بیمار بہت کم ہوتے لیکن جب کبھی کوئی علالت ہوتی تو بڑے سے بڑے ڈاکٹر، ہومیوپیتھ یا طبیب کا معالجہ کرتے تھے۔ ہومیوپیتھک علاج سے کافی شغف تھا اور اس علم کی تمام مستند کتابیں ان کے پاس موجود تھیں جن سے کبھی کبھی میں بھی مستفید ہوتا تھا۔ نیاز صاحب اپنی غذا کے معاملہ میں بڑے محتاط رہتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اچھی تین چیزیں بہت مرغوب ہیں آم، مونگ کی دال اور عورت۔ جس زمانے میں السٹریٹڈ ویکلی میں معمے نکلتے تھے تو معموں کے حل کرنے میں بھی بڑی مستعدی دکھلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ مقصد انعام حاصل کرنا نہیں ہے صرف معمہ کا حل نکال لینا ہے۔ اسی طرح کی دلچسپی ریس کورس سے بھی تھی۔

ادبی گفتگو میں جب چھڑ جاتیں تو انکی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ کوئی موضوع ہو، کوئی ادبی مسئلہ ہو نیاز صاحب اس کے متعلق پہلے سے سوچی ہوئی ایک جچی تلی رائے رکھتے تھے اور اس پر مستقل مستحکم رہتے تھے۔ انکی صائب رائے ان کے لہجہ کی صلابت سے مل جل کر اور بھی مضبوط اور بھاری بھرکم معلوم ہوتی تھی۔ تقاضائے سن کے باعث ادھر عرصہ سے مزاج میں گوشہ نشینی آگئی تھی۔ شہر میں مختلف قسم کے ادبی جلسے ہوتے رہتے لیکن وہاں ان میں بہت کم شرکت فرماتے تھے لیکن تقاضائے سن ان کے اپنے کام میں کبھی حارج نہیں ہوئی۔ وقت مقررہ پر صبح وہ اپنے دفتر میں آکر بیٹھ جاتے تھے اور اور غالباً بارہ یا ایک بجے دن تک مسلسل لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ ان سے کہا بھی کہ کسی کو اپنا مددگار بنا لیجیے مگر واقعہ یہ ہے کہ کیسے بناتے

بیٹے ان کے بہت چھوٹے، داماد ملازمت پیشہ آدمی۔ اس لئے ان کا کوئی اپنا آدمی نہ تھا جس پر وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سارا کام چھوڑ سکتے۔

مذہب اور معقولیت کے نیاز صاحب ہمیشہ دلدادہ رہے اسی لئے مذہب کو بھی انھوں نے معقولیت کے پیمانہ پر لانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کو بہت سے لوگوں نے پسند بھی کیا اور بہتوں نے انتہائی ناپسند۔ انکی ابتدائی تعلیم و تربیت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی اور ان کے والد محمد امیر خاں صاحب مرحوم نے انھیں بالکل عالم دین ہی بنانا چاہا تھا لیکن نیاز صاحب نے مذہب کو ہمیشہ ملائیت کی سطح سے بلند ہو کر سمجھنا چاہا اور روایت پر ہمیشہ درایت کو ترجیح دی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چند سال ہوئے میری خوشدامن صاحبہ بہت علیل ہوئیں اور حالت نازک ہو گئی۔ ایک صاحب نے جو بذات خود نہایت معتبر اور سنجیدہ آدمی ہیں اس علالت کی خبر کو میری طرف منسوب سنا اور یہی جا کر نیاز صاحب سے کہہ دیا۔ نیاز صاحب پریشان ہو کر میرے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنے مکان کے اوپر کے کمرے میں اپنی خوشدامن صاحبہ کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ دور سے دیکھ لیا کہ نیاز صاحب جلد جلد آرہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ زینہ پر آگئے اور بغیر بکارے اندر آنا چاہتے تھے کہ میں کمرہ کے باہر آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کیسے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو اچھا ہوں البتہ میری خوشدامن صاحبہ بہت علیل ہیں۔ سنتے ہی کہا کہ دیکھئے اسی لئے تو میں حدیثوں کی صحت کا قائل نہیں ہوں کیونکہ راوی نہایت معتبر مگر خبر اس نے بالکل غلط پہنچائی۔

سیاسیات سے نیاز صاحب کی عملی دلچسپی کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ البتہ نظریاتی دلچسپی ہمیشہ رہی۔ نگار کے شذرات جو پچھلے دس بارہ سالوں میں لکھے گئے ہیں ان کے تعمق نظر کے غماز ہیں۔ انھیں پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی نیاز صاحب ہیں جو کبھی نگارستان کے مصنف رہ چکے ہیں۔ ادھر پندرہ بیس سالوں سے نیاز صاحب کے انداز بیان میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ عہد شباب کی رنگین اور طرب انگیز انشاپردازی کی جگہ نہایت معقول اور مدلل، صاف اور ستھری انداز تحریر نے لے لی ہے۔

ان کی کثیر تصانیف (جو مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہیں) کا کیا ذکر تنہا ان کا نگار ہماری اردو صحافت کا ایک مستقل باب ہے جس استقلال پامردی اور ہمت کے ساتھ انہوں نے ابتدا (۱۹۲۲ء) سے لیکر اب تک اسے جاری رکھا ہے وہ لائق صد تحسین ہے اور اس کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ادب کا وہ کون سا پہلو ہے جس پر انہوں نے نہیں لکھا یا نہیں لکھوایا یعنی اس چالیس سال کے اندر ملک میں اردو ادب نے جتنے بھی پہلو بدلے ہیں ان سب کی عکاسی آپکو نگار کے فائل میں نظر آ جائیگی۔ اس ادبی پہلو کو چھوڑئیے نگار کے شماروں میں ایک خاص چیز آپ کو اور بھی نظر آئے گی اور وہ ہے نئی علمی معلومات کو خصوصیت کے ساتھ شائع کرنا۔ نیاز صاحب ادب و ادبیات کے علاوہ دیگر علوم خصوصاً علوم جدیدہ کے بڑے شائق رہے ہیں اور اپنے رسالہ میں ہمیشہ نئی نئی معلومات کو اس لئے جگہ دی ہے کہ دوسرے لوگوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور دیکھیں کہ دنیا اب کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے اس تعلیمی مقصد کے پیش نظر انہوں نے بہت سی مفید معلومات جو دیگر زبانوں میں تھیں ترجمہ کر کے پیش کی ہیں۔ کبھی ایسے موضوعات پر دوسروں سے بھی لکھوایا ہے۔ غرض یہ کہ نگار کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ معلوماتی لٹریچر کا فراہم کرنا بھی اس کا امتیازی وصف رہا ہے۔

نیاز صاحب اور ان کے ساتھ نگار کا ہندوستان سے ہجرت کر جانا ہندوستان والوں کے لئے ایک بہت افسوس ناک واقعہ ہے۔ مجھے یہ بخوبی معلوم ہے کہ نیاز صاحب کسی جلب منفعت کی خاطر پاکستان نہیں گئے ہیں۔ اگر ایسا خیال ہوتا تو نیاز پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت ہی چلے گئے ہوتے۔ ان کے سیاسی خیالات میں بھی یہاں ایسی کوئی نمایاں تبدیلی ظہور میں نہیں آئی تھی جس کے تحت وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں انہیں سیاسیات میں عملی طور پر کبھی دلچسپی نہیں رہی انھیں اپنے کام سے کام رہا ہے۔ ملک میں چاہے جس قسم کے خیالات رائج ہوں علم و ادب سے شغف رکھنے والے ہر حال میں اپنی گزر بسر کر لیتے ہیں یہی حال نیاز صاحب کا ہے۔ اسی لیے انکی ہجرت کی توجیہہ کسی سیاسی عقیدہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک ان کی قدر دانی کا سوال ہے تو خود ہندوستان کی سرکار نے ابھی پچھلے دنوں انھیں "پدم بھوشن"

کے خطاب سے نوازا تھا۔ سرکار سے زیادہ خود اُردو داں طبقہ ان کی حتی الوسع قدر و منزلت کرتا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اگر بعض ہندوستانی یا پاکستانی اخبار یا ادیبوں نے اس قسم کے الزامات تراشے ہیں تو وہ صریحاً بے بنیاد ہیں۔ نیاز صاحب اب عمر کے اس دور تک پہنچ چکے ہیں جب کہ منفعت یا مزید حصول شہرت و عزت کے خیالات کوئی خاص معنی یا اہمیت نہیں رکھتے۔ بلکہ اس عمر پر پہنچکر تو ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اپنے بقیہ ایام بے فکری اور آرام و اطمینان سے بسر کر لے جائے اور جتنا کچھ ہو سکے اپنا ادبی یا علمی کام بغیر کسی فکر و اندیشہ کے کرتا رہے۔ یہی چیز اب نیاز صاحب کے لئے یہاں ممکن نہیں رہی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کی ہجرت کن افسوس ناک حالات کے تحت پیش آئی۔ واقعی ان کی نجی زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہو گئے تھے جن کے باعث وہ اپنا کوئی کام سکون خاطر سے نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا کوئی عزیز قریب بھی ایسا نہ تھا جو انہیں اخلاقی طور پر ہی مدد دے سکتا۔ بڑھاپے میں مالی نہ سہی اخلاقی مدد اور انسانی ہمدردی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور یہی چیز اب انھیں یہاں میسر نہ تھی۔

بہر حال نیاز صاحب یہاں سے چلے گئے ہم سب کو بڑا افسوس ہے۔ خدا کرے وہ وہاں خوش و خرم رہیں اور اطمینان و فراغت سے وہاں کے لوگوں کے درمیان زندگی بسر کریں اور خدا انھیں اُردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے عرصہ دراز تک زندہ و سلامت رکھے۔ مجھے تو ان کی انسانیت، شرافت، ہمدردی اور مکرمت ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔ اب بھی جب کبھی ان کے مکان کی طرف سے گزر ہوتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے مصروف سرگرم تحریر ہوں گے

"دُنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی کی شدید مخالفت کی اور جس کے علمبرداروں نے اپنے آپ کو "بت شکن" کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پروا کی اور نہ بحر ہند کی گہرائیوں کی وہ محدود علم کی تعداد میں فوجیں فراہم کر کے اُٹھے، صرصر و سیل کی طرح نہ رکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برق و زلزلہ کے مانند ہر اس بت کدے کو تباہ و برباد کر گئے، جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اٹھتا تھا "جنت عدن" سے قریب تر کر دینے والا ہوتا تھا اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بت پر پڑتی تھی گویا قصر فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی، وہ مذہب جس کی بنیاد ہی "لات و ہبل" کی مسماری پر قائم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہیئے تھا اور ہر سومنات کے لئے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہو جانا ضروری تھا۔ لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب مندر کے کسی گھنٹہ کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ ایک "بت" کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف محمود کا گرز گراں اٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف "جنیذ کلید بتکدہ در دست برہمن":

یوں تو دنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، بت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "ناتراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے، لیکن نہ بت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ "بت شکن" اس پر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔"

(نیاز)

حضرت نیاز اور ان کا فن

ضیاء الدین احمد برنی

ہم لوگ ایک لحاظ سے مُردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ جب کوئی بڑا ادیب اس دُنیا سے گزر جاتا ہے اس وقت ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم اُردو ادب میں اس کا مقام معلوم کریں، اسکی روح کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کریں اور اسکی کوئی یادگار قائم کریں۔ مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود اس فنائے آب و گل میں نہیں رہتا۔ زندہ قومیں ادیب کی زندگی ہی میں اسکی قدر کرتی ہیں اور اس کی عظمت فن کا اعتراف کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض حضرات کی یہ کوشش کہ وہ نیاز فتحپوری کی ادبی خدمات کا اعتراف "نگار پاکستان" کا ایک خاص نمبر شائع کر کے کریں، ہر لحاظ سے سراہنے کے قابل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر قبولیت عامہ کی سند حاصل کرے گا۔

نیاز نے ساری عمر اردو کی ٹھوس خدمت کی ہے۔ انہوں نے اردو علم ادب میں ایسے اسلوب نگارش کو رواج دیا ہے جو ان ہی کی ذات تک محدود ہے۔ بالفاظ دیگر ان کی اس انفرادیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ان کی تحریر میں بہت جان ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی، ترکی، فارسی اور انگریزی سے خوب واقف ہیں اور انہوں نے ان سب زبانوں کے بہترین لکھنے والوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ان زبانوں کے بہترین ادب کی روح کو جوں کا توں اردو میں منتقل کر دیں۔ اردو کے بہت کم ادیب ایسے ہیں جو اس میدان میں ان کے حریف ہوں۔

اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں نیاز صاحب مولانا ابوالکلام آزاد اور رابندرناتھ ٹیگور سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی اثر کے ماتحت انہوں نے "گیت انجلی" کا ترجمہ "عرض نغمہ" کے نام سے اس وقت کیا جب کہ دنیا ٹیگور کے فن سے زیادہ واقف نہ تھی۔ درحقیقت انہوں نے ہی اردو دانوں کو اس ڈگر پر ڈالا اور پھر اردو کے بہت سے ادیب ان کے بنائے ہوئے راستہ پر چل پڑے۔ انہوں نے عربی کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کیا اور اس طرح انہوں نے اردو کے دامن میں، غیر معمولی وسعت پیدا کی اور اسے گلہائے رنگارنگ سے بھر دیا۔ ان کی نگارشات اردو ادب کا مایۂ ناز حصہ ہیں۔

انہوں نے "نگار" کے ذریعہ جو اہم ادبی و علمی خدمات انجام دی ہیں وہ اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ اس میں وہ نقاد، افسانہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کی نگارشات پڑھنے کے بعد کون ہے جو ان کے انداز سے متاثر نہ ہوا ہو؟ انہوں نے اردو کے بہت سے شعراء کو زندہ کر دیا ہے۔ اس کے خاص نمبر آج بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور آئندہ بھی پڑھے جائیں گے۔ بعض نمبر تو اسقدر جامع ہیں کہ وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان کی تحریروں میں بھرپور خلوص ہے، شوخی ہے اور زندگی ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فوارہ کی سی روانی ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار نہایت تیزی سے کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو زور اور بہاؤ ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

نیاز صاحب قدرتی مناظر سے جس طرح متاثر ہوتے ہیں اردو کے بہت کم شاعر اور ادیب متاثر ہوئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت سے ایسا حساس دل لیکر آئے ہیں جو مناظر قدرت سے بھرپور لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنے تاثرات کو جب قرطاس ابیض پر منتقل کرتے ہیں تو ایسی تصویر کھینچتے ہیں

جس سے پڑھنے والا بھی وقتی طور پر انہی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ وہ ہر چیز میں ازلی حسن دیکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اردو ادب میں ایسے ایسے حسین جملوں کا اضافہ کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے محمد حسین آزاد، ظفر علی خاں، اقبال اور غالب ہیں۔ بمبئی میں وہ حسین عورتوں کے جھرمٹوں کو دیکھ کر "حسن پاشیدہ" کا جملہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ حسین ترکیب ان سے پیشتر کسی نے استعمال نہیں کی۔ ایسی بیسیوں ترکیبیں ان کی تحریروں میں جابجا بکھری پڑی ہیں۔

انہوں نے تنہا اردو کے لئے جتنا مختلف النوع لٹریچر پیدا کیا ہے اتنا غالباً کسی اور شخص نے پیدا نہیں کیا۔

ان کی تحریروں کا ایک نمایاں پہلو ان کا مخصوص رومانوی رنگ ہے جس میں اردو کا کوئی دوسرا ادیب ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ وہ حسین اور ناقاتلی مناظر کے شیدائی ہیں اور اسی حسن کو وہ اپنی مختلف تحریروں میں اس طرح سے سمو دیتے ہیں کہ الفاظ تک میں رومانیت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں ان کی مخصوص انشاپردازی کی پہنائی اور ہمہ گیری اس میں پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ اس موقع پر میں کوئی جامع مضمون پیش نہ کر سکا۔ یہ ایک مختصر سا ہدیۂ عقیدت ہے جسے میں حضرت نیاز کے حضور میں پیش کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف!

"ماترید نام ہے ایک گاؤں کا جو سمرقند کے مضافات سے تعلق رکھتا تھا اسی جگہ ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام ابو منصور محمد بن محمود تھا ان کا شمار متکلمین اسلام میں ہوتا ہے ماتریدی، اشعری اور سنی دراصل تینوں اہل السنت والجماعت ہیں، تینوں فقہ حنفی کے مفسر و شارح ہیں۔ اور تینوں معتزلہ کے خلاف ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں اشعری جماعت کا نام زیادہ لیا جاتا ہے، البتہ ماوراء النہر کے علاقہ میں حنفی مسلک کا نمائندہ ماتریدی اسکول کو سمجھا جاتا ہے۔

اشعری، ماتریدی اور طحاوی تینوں ایک ہی زمانہ کے متکلم تھے اور ان کی وفات کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی تھا۔ اشعری کا انتقال ۳۳۰ھ میں ہوا۔ ماتریدی کا ۳۳۳ھ میں اور طحاوی کا ۳۲۱ھ میں، ان تینوں کا مقصد اعتزال و الحاد کا مقابلہ کرنا تھا

نسفی، ماتریدی عقاید کے پیرو تھے جن کی مشہور کتاب شرح عقاید نسفی، اصول فقہ پر ہندوستان و مصر دونوں جگہ درس میں شامل تھی، مصر کے مشہور عالم محمد عبدہ بھی ماتریدی عقائد کی طرف مائل تھے۔

اشاعرہ اور ماتریدیوں کے درمیان تیرہ اختلافات تسلیم کئے گئے جن میں سے سات کا تعلق خیالات سے ہے اور چھ کا الفاظ سے۔ اشاعرہ اس بات کے قایل ہیں کہ خدا کا ارادہ بھی اصل چیز ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جزا و سزا کا تعلق اخلاق سے نہیں ہے، لیکن ابو حنیفہ اور ان کے بعد ماتریدیوں کا مسلک یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعمال پر اختیار دیا گیا ہے اور اسی لئے وہ جزا یا سزا کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ابو حنیفہ کا عقیدہ ہے کہ انسان کا ہر فعل خدا کے ارادہ سے وابستہ ہے لیکن خدا اس پر راضی نہیں کہ اس کے بندہ سے کوئی گناہ سرزد ہو۔ ماتریدی عقاید کی رو سے نجات کا یقین حاصل ہو سکتا ہے اشاعرہ اس کے قایل نہیں۔ ایک ماتریدی کہہ سکتا ہے کہ میں خدا کا یقینی قایل ہوں، لیکن ایک اشعری صرف اتنا کہے گا کہ میں خدا کا قایل ہوں اگر خدا چاہے۔

بعد کو ماتریدی خیالات نے اشعری اسکول میں بھی در خور حاصل کیا اور بہت سی باتوں میں دونوں متفق ہو گئے۔"

(نیاز)

*

نیاز کا ادبی مرتبہ

ڈاکٹر محمد حسن

نیاز فتحپوری کی شخصیت خاصی متنوع اور رنگا رنگ رہی ہے۔ بعض لوگ انہیں ایک باغی ایڈیٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں جس نے تعصب تنگ نظری اور کٹھ ملائیت کے خلاف زبردست جہاد کیا۔ بعض لوگ انہیں ایک ایسے انشا پرداز کی حیثیت سے جانتے ہیں جس کی نثر میں جادو ہوا کرتا تھا کچھ سمجھتے تھے اور کچھ نہیں سمجھتے مگر واہ واہ اکثر کی زبان سے نکل جایا کرتی تھی بعض ان کو شہاب کی سرگذشت اور شاعر کا انجام لکھنے والے اس رومانی ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں جس کے کردار حسن کے پرستار اور جس کی ہیروئنیں حسن اور ذہانت کا لاجواب مجموعہ ہوا کرتی تھیں بعض انہیں اس تنقید نگار کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں جو بڑے بڑے شاعروں پر استعجاب لگائے قائم کرتا اور کلاسیکی شعرا کی اپنے انداز سے چھان پھٹک کرتا رہتا ہے۔

نیاز فتحپوری ان تمام حیثیتوں کی بنا پر ہمارے لئے لائق توجہ ہیں اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے تفصیل مقالے کی ضرورت ہے جدید اردو ادب میں جو تین سب سے زیادہ معرکہ آرا اور اختلافی شخصیتیں گزری ہیں ان میں یگانہ کے بعد اور منٹو سے پہلے نیاز کا نام آتا ہے۔ نیاز آزاد خیال تھے اور آزاد خیالی کے جوش میں انہوں نے مذہب کے روایتی تصور پر گہری نظر ڈالی اخلاقیات کی روشنی میں عقائد و رسوم کو پرکھا اور ایک نئے اعتزال کی بنیاد ڈالی۔ نیاز نے کبھی اپنے مسلمان ہونے سے انکار نہیں کیا مگر اسلام کا ایک نیا عقلی اور کسی قدر ذاتی تصور پیش کرنے پر اصرار کیا۔ یہ کوشش نئی نہیں تھی اس سے قبل سرسید احمد خان قرآن مجید کی نئی تفسیر لکھ چکے تھے اور اپنے طور پر اجتہاد و اعتزال کے دروازے کھول چکے تھے یہ اور بات ہے کہ نیاز کا تصور مذہب زیادہ اخلاقی زیادہ جدید اور آزاد خیالی پر مبنی تصور تھا۔ نیاز نے اسلام کو رد نہیں کیا۔ البتہ اسلام کی بیسویں صدی کی نظروں سے پرتالا اور اسے مذہب سے زیادہ نظام اخلاق گردانا۔

نگار ایک مدت تک سارے آزاد خیالوں کا محبوب رسالہ بنا رہا۔ اس کے ملاحظات میں ایک دھاردار تیزی تھی اس میں انوکھی شگفتگی تھی اسے شاہراہ عام پر چلنا گوارا نہ تھا وہ ہر قدم پر رک کر اپنا راستہ الگ بنانا چاہتا تھا وہ قدیم طرز فکر پر شک کرتا تھا وہ عزم جراُت اور خود اعتمادی کے نئے باب وا کرتا تھا اس لئے نوجوانوں کو اس کا یہ البیلا پن عزیز تھا گو وہ جانتے تھے کہ یہ بحثیں جب تک خود مذہب کے دائرے کے اندر رہ کر کی جائیں گی ان کی حیثیت علم کلام کی کوششوں سے زیادہ نہ ہوگی وہ

یہ بھی جانتے تھے کہ نیاز صاحب اپنی تمام 'جدیدیت' کے باوجود مشرقی مزاج رکھتے ہیں اور وہ مذہبی مباحث گرمئی بازار کے لئے زیادہ چھیڑتے ہیں اور ان سے واقعی مذہب کے غلط تصور سے ٹکرانا مقصود نہیں ہوتا۔ نیاز نے ان مباحث میں اکثر اعمال اور معاملات دنیوی پر عبادات و رسوم کی پابندی سے زیادہ زور دیا ہے اسی وجہ سے وہ اخلاقیات کو مذہب پر فوقیت دیتے ہیں وہ اپنے اس نئے تصور کو لے کر بہت دور تک نہیں گئے اس لئے نہ وہ تصوف تک پہنچے نہ کمیونزم تک۔

رسالوں نے اکثر ادبی دنیا میں نئی تحریکوں کو جنم دیا ہے خود اردو میں تہذیب الاخلاق، مخزن اور نیا ادب کی مثالیں موجود ہیں نگار کوئی نئی تحریک پیش نہ کرسکا مگر لکھنے والوں کی کئی نسلیں نگار کے زیر اثر پروان چڑھی ہیں۔ نگار کی روایت آزاد خیالی اور احساس جمال کی روایت تھی۔ ایک حیثیت سے نگار تہذیب الاخلاق کا تتمہ تھا اور دوسری حیثیت سے اس پر اضافہ۔

اضافے ہر طرح کے ہوتے ہیں کچھ سے ترقی کے قدم تیز ہوتے ہیں اور منزلیں روشن تر ہو جاتی ہیں کچھ منزل کو اور بھی دور کر دیتے ہیں مگر بعض نئی راہیں ضرور کھول دیتے ہیں گویا بیک وقت وہ اضافہ بھی ہوتے ہیں اور ترمیم بھی۔ نگار نے تہذیب الاخلاق کی معتزلہ روایت اور آزاد خیالی کی لے کو آگے بڑھایا یہی نہیں جس طرح سرسید اور ان کے رفقا کی یہ کوشش تھی کہ ہمارے ادب کو مغربی فکر و دانش ادب اور فن کی روشنی پر چلایا جائے اس کو بھی نگار نے اپنے طور پر انجام دیا لیکن سرسید نے جس سلیس اور سادہ نثر کو رواج بخشا تھا اسے نیاز نے مرصع اور رنگین بنا دیا انہوں نے مختصر افسانے بھی لکھے اور طویل مختصر افسانے بھی مگر ان میں نہ سرسید کے رفقا کی طرح سماجی افادیت کا جوش تھا نہ سادگی۔ انہوں نے علمی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے استفسارات و جوابات بھی مگر ان سب میں مقصدیت کا وہ آہنگ موجود نہیں جو سرسید کی تحریک کی نشانی ہے۔

لازمی طور پر بات نیاز کے طرز بیان تک پہنچتی ہے اسلوب دراصل مضمون و معنی کے تابع ہوتے ہیں اور مضمون اور اسلوب دونوں لکھنے والے کی شخصیت کے۔ شخصیت کیا ہے اور اس کا ادب سے کیا تعلق ہے۔ یہ بحث طویل ہے مختصراً یوں سمجھئے کہ شخصیت فکر جذبہ اور عمل کا مجموعہ ہے اور ادب شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے اور اظہار سے گریز کا بھی۔ یہ ذات کا آئینہ بھی ہے اور پردہ بھی۔ نیاز کی پرورش یقیناً مشرقی ماحول میں ہوئی عربی فارسی کی متداولہ کتابیں منقولات و معقولات مذہبیات اور اخلاقیات کی بنیادوں پر ان کے علم و فضل کی تعمیر ہوئی یہ اور بات ہے کہ ان کی جرأت مندی حصے نہیں تشکیل کے راستے پر لا ڈالا اور وہ آزاد خیالی کے کوچے میں نکل آئے۔ اس لحاظ سے بھی وہ سرسید اور ان کے رفقا کی طرح مشرق کے ذریعہ سے مغرب تک پہنچے مگر نیاز کا مغرب سرسید سے مختلف تھا۔ سرسید کا مغرب برطانیہ اور وہ بھی وکٹوریہ کے عہد کے برطانیہ تک محدود ہے۔ نیاز کا مغرب آسکر وائلڈ کے برطانیہ سے درس نمو پاتا ہے اور فرانس کی رومانی نفاست تک پہنچتا ہے۔ سرسید کا سارا زور تعقل اور اخلاقیات پر تھا نیاز کا سارا زور احساس جمال پر۔ ایک سادگی کا رسیا تھا دوسرا رنگینی کا ایک کو سلاست عزیز ہے دوسرے کو آراستگی۔

نیاز کے طرز و اسلوب کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ اس کی تاریخی اہمیت سے کون انکار کریگا مگر تاریخ ایک عمل ہے وہ اہم سے اہم سنگ میل کو بھی پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہے ان میں نیاز کی جگمگاتی انشاء پردازی بھی ہے جس

میں جامد ہے مگر توانائی نہیں سیلاب رنگ و نور ہے گہرائی اور عظمت نہیں رنگینی ہے صلابت نہیں۔ اچھی نثر کا بنیادی معیار ہی یہ ہے کہ اس میں سلاست ہو، ربط و تسلسل ہو وہ آئینہ نہ ہو کہ اس کے حسن میں نگاہیں الجھ کر رہ جائیں شیشہ ہو جس سے نگاہیں پار ہو کر اس مفہوم تک پہنچ سکیں جو اس کے ذریعہ سے ادا ہوا ہے۔ نیاز کی نثر رعنائی جمال کا پیکر ہے رعنائی فکر کا نہیں اس لئے وہ اپنی ساری رنگ آمیزی کے باوجود گزرے ہوئے کل کی یادگار ہے آنے والے کل کا نشان نہیں ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سادہ اور سلیس نثر تہذیب کا تحفہ ہے اور قوموں کو بتدریج اور حسب توفیق ملتا ہے۔ اردو نثر کے تاریخی سفر میں بھی ایک ایسی منزل آئی تھی جب وہ رنگین اور پرکاری کا شکار ہوئی۔ یوں تو آج بھی ہمارے ذمہ دار اور سنجیدہ ادیبوں میں ایسے حضرات کی کمی نہیں ہے۔ جو اچھی نثر نگاری کی مثالیں محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کی تصانیف سے پیش کرتے ہیں اور انہیں معیاری اسلوب سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی سلاست اور سادگی خارجیت واقعیت نثر کو صرف فکر کی ہمہ جہتی کے قابل بنایا تھا جذبے کی قوت اور توانائی سے اس نئی نثر کا آبگینہ اب بھی پگھلا جاتا تھا۔ ہماری نثر میں جمالیاتی احساس کی کمی تھی۔ نیاز اور ان سے کچھ پہلے یلدرم اور مہدی افادی نے نثر کی اس فنی صلاحیت کو پہچانا، نثر میں بھی مصوری کی جا سکتی ہے اس سے بھی نقاشی اور مرصع کاری ممکن ہے آرائش در و بام کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ یہ دراصل سرسید اور ان کے رفقا کی حد سے بڑھی ہوئی اخلاق پرستی اور اصلاح پسندی کا ردعمل تھا جس طرح وکٹورین دور کی اخلاق پرستی اور سماجی افادیت کے تصور نے "ادب برائے ادب" کا ردعمل پیدا کیا اسی طرح اردو ادیب اخلاق سے عورت کی طرف تعقل سے احساس جمال کی طرف مائل ہوئے اور نثر دھیرے دھیرے غزل بن گئی۔

نیاز کی نثر نگاری کی خصوصیت ان کے انشائیہ مضامین اور طویل مختصر افسانوں میں نمایاں ہوئی ہیں۔ ان میں اپج یا طبعزاد انداز کم ہے مغربی اسالیب کو پیش نظر رکھ کر اردو ادب میں وہی جمالیاتی آہنگ اور رومانی خروش پیدا کرنے کی سعی البتہ واضح طور پر ملتی ہے۔ یہ کام کسی محقق کا ہے کہ وہ ان صاحبان طرز کا پتہ لگائے جن سے نیاز نے اثر قبول کیا ہے۔ دو باتیں البتہ یقین سے کہی جا سکتی ہیں ایک یہ کہ نیاز کے فکر و اسلوب میں جمالیات پرستوں اور رومانی ادیبوں کی جذباتیت اور گھن گرج موجود ہے اور دوسرے یہ کہ نیاز کی رنگینی اور مرصع کاری ظہوری اور رجب علی بیگ سرور کے انداز بیان سے مختلف تھی "ایک شاعر کا انجام" کے دیباچے میں نیاز نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

"یہ نہ تو مذاق پیشین رکھنے کا مدعی ہے کہ قافیہ پیمائی آپ تلاش کریں اور نہ موجودہ ناول طرازی کا ہم آہنگ کہ ضلع جگت اور عزلیات کی آپ کو جستجو ہو نہ آپ اس میں اشعار پائیں گے اور نہ عامیانہ زبان — مگر ہاں اس میں کلام نہیں کہ اگر اس افسانہ درد کو آپ نے ایک نگاہ دردمند اور دل مبتلا کے معیار سے دیکھا تو میری وارفتہ نوائی کی داد ضرور مل جائیگی ایک باب کا تسلسل بھی دوسرے باب سے کم پائے گا لیکن معاف فرمائیے کم پر اردو اشک ہوں مجھے تو موتی کچھ بکھرے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ عبارت ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی حالی اور شبلی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اور یہ دونوں سادہ زبان کے بادشاہ تھے نذیر اور رسوا کے ناول اس زمانے میں مقبول ہو چکے تھے اور ان کی روانی سلاست اور تازگی کسی سے پوشیدہ نہیں نیاز کے اسلوب میں اس سلاست اور روانی کا شائبہ نہیں البتہ اس عبارت میں فارسی تراکیب کی کثرت جمالیاتی ذوق اور خود فراموشی اور حسن پرستی میں محویت کا انداز نمایاں طور پر ملتا ہے "افسانۂ درد" پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور جذبات کی زبان کو عقل کے مربوط استدلال پر ترجیح دی گئی ہے۔

پہلے تراکیب پر غور کیجئے۔ مذاق تپش، افسانۂ درد، نگاہ دردمند، دل مبتلا، وارفتہ نوازی، نم پروردۂ اشک ان میں بعض صفت اور موصوف کا مجموعہ ہیں اور بعض میں ایک حاسہ کی خصوصیت کو دوسرے حاسہ کے لوازم یا آثار سے متعلق کیا گیا ہے۔ اس قسم کی لاتعداد تراکیب مثال کے طور پر ان کے مضمون برسات میں نظر سے گزریں گی جہاں رنگ کی موسیقی اور اجالے کی مہک تاریکی کی سرگوشی اور آواز کے شعلوں کا ذکر ملے گا۔ آرٹ کے مختلف شعبوں میں بنیادی وحدت کا یہ احساس ان کی ندرت احساس کا ایک پہلو ہے وہ حسن کے بارے میں تقریباً اسی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں صوفیا ہمہ اوست کے نظریے کے ذریعے سے پہنچتے ہیں یعنی حسن ہر جگہ ہے اور ہر عمل ہر شے اور ہر منظر میں جلوہ گر ہے صرف اسے دیکھنے کے لئے آنکھ چاہیئے اور اس سے لطف لینے کے لئے حسن پرست اور احساس آشنا دل، البتہ فرق اتنا ہے کہ حسن نیاز کے ہاں بہت کچھ محسوساتی ہے وہ ماورائیت تک بھی محض احساس کے ذریعے تک ہی پہنچتے ہیں۔

نیاز نے حسن پرستی کو مذہب کی سطح تک پہنچا دیا ہے ان کے ہاں حسن کا حسین تصور اور عشق کا افلاطونی اور ماورائی تصور دونوں ملتے ہیں ان کے نزدیک محبت ایک "بے غرض انہماک" کا نام ہے اور "اگر محبت کرنے والا محبوب سے ملنا چاہتا ہے تو وہ حقیقتاً محبت نہیں ہے بلکہ ایک جذبۂ شہوانی ہے" لیکن فراق مسلسل کے اس فلاطونی تصور کے باوجود نیاز حسن کو خالص حسین روپ میں دیکھتے ہیں فطری مناظر میں بھی ان کا تصور حسن بڑی حد تک مرئی اشیاء کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے ان کے ہاں حسن وہ اعلیٰ پاکیزہ غیر جسمانی اور ماورائی تصور نہیں ہے جو مثلاً ٹیگور کے یہاں ملتا ہے۔ اس اعتبار سے حسن پرستی کے معاملے میں نیاز کی حیثیت کچھ ایسی ہے جیسے غم پرستی کے سلسلے میں میر کے مقابلے میں فانی کی ہے۔ میر خود روتے ہیں فانی رونے کی تلقین کرتے ہیں اسے ایک فلسفہ کی شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں نیاز حسن کو دیکھ کر "خود فراموش محویت" کی تلقین زیادہ کرتے ہیں محو کم ہوتے ہیں اسی لئے ان کے ہاں شعور نزاکت احساس کم ہے درد کی عظمت کا ذکر اور اس کا پرشکوہ اعلان زیادہ ہے۔ ان کا طرز ترکیب اور استعارے کا ہے اور تراکیب اور استعارے پرشکوہ الفاظ محاکات سے ڈھالے گئے ہیں ان میں سادگی کم آرائش زیادہ ہے بے ساختگی کم کاری گری زیادہ ہے اس لئے ان کا طرز مرعوب کرتا ہے متاثر نہیں کرتا آرائش در و بام میں اصل عبارت کو گم کر دیتا ہے۔

نیاز کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے وقت تاریخی پس منظر کو فراموش نہ کرنا چاہئیے نیاز نے اس وقت حسن کاری اور حسن پرستی کی آواز بلند کی تھی جب اردو نثر جمالیاتی حسن سے محروم ہوتی جارہی تھی لیکن یہ وقت کی چیز ہوتے ہوئے ہر وقت اور ہر زمانے کی چیز نہیں ہے اب اس کی تاریخی ضرورت پوری ہوگئی اس سے بعض نئی راہیں کھلیں ہمارے افسانے میں جذبے کی لہک احساس کی مستی اور انداز بیان کی سجاوٹ پیدا ہوئی وفور جذبات رونما ہوا رومانی خود فراموشی حسن پرستی اور محاکاتی رنگ آیا مگر اس کے باوجود آج بھی ادب کا طالب علم اس طرز تحریر کا جائزہ لے گا تو اسے ماضی ہی کے خانے میں جگہ دے گا اس سے اخذ وارد اکتساب فیض کرنے کی ہمت نہ کرے گا۔

جہاں تک نیاز کے افسانوں کے پلاٹ اور کردار نگاری کا تعلق ہے ان کو بھی معیاری نہیں کہا جاسکتا۔ ایک نقاد نے مختصر اردو افسانہ نگاری کا بانی پریم چند اور یلدرم اور اس کے بعد نیاز کو بتایا ہے پریم چند کی روایت نیاز سے ہوتی ہوئی آگے بڑھی اس نے جمالیات پر زور دیا اور زبان کی آراستگی بیان کی شعریت اور فلسفیانہ آہنگ کو اختیار کیا۔ نیاز کے افسانوں ـــــ اور مضامین ـــ کو جمالیاتی تجربوں کی حیثیت دینا چاہیئے۔ ان میں نہ واقعہ پوری طرح مربوط اور مرتب ہوتا ہے نہ کردار جیتے جاگتے اور منفرد ہوتے ہیں نہ نقطۂ عروج کا واضح تصور ملتا ہے مگر ان میں ایک مضطرب اور متجسس ذہن ضرور ملتا ہے جو نئی تصویروں اور مختلف رنگ و آہنگ کے مجموعوں سے کیف حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے ان کے کردار یا تو مردہ ہیں یا خود نیاز کی شخصیت کا روپ ہیں۔ ان کے جسم سوتے ہیں صرف ذہن بیدار رہیں وہ احساس کی بات کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ صرف ان کی ذہانت ان کی پوری شخصیت پر مستولی رہتی ہے۔ ان کے ہیرو، ہیروئن سے محبت نہیں کرتے اس کے تصور سے یا یوں کہئے کہ محبت میں مبتلا ہونے کے خیال یا حسن پر جان دینے کے دھیان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اگر وہ شہید ہوتے ہیں تو محبوب کے ناز وغمزہ کے نہیں ہوتے بلکہ اس مجرد اور موہوم تصور محبت کے نام پر شہید ہوتے ہیں جس کے پردے میں انہوں نے زندگی کیسر اپنی اور اپنے ذوق خود نمائی کی پرستش کی ہے اس لئے ان کے کردار سب کے سب خود اپنی آگ کے خس وخاشاک ہیں گو " پرائی آگ میں جلنا ہے کار مردانہ " ان کے ہیرو ہمیشہ غیر متوازن حد تک ذہین اور عظیم شخصیتوں کے مالک ہیں جو خود ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی وہ شہاب ثاقب کی طرح آسمان سے ٹوٹتی ہیں اور دور تک نور کی ایک لکیر بناتی گذر جاتی ہے۔

نیاز کو ایسے کرداروں سے محبت ہے۔ وہ عالم استفہام کے راہی ہیں۔ وہ صرف نئے سوالوں کے جویا ہیں ان میں سے سب کا جواب خود ان کے پاس بھی نہیں ہے لیکن جرأت سوال ہی ہماری روایت پرست سماج میں بڑی نعمت ہے۔ اس اعتبار سے دو عظیم فن کاروں سے نیاز کی ذہنی اور فکری مماثلت کا دھیان آتا ہے ایک بیدل اور دوسرا آسکر وائلڈ۔ بیدل کے بارے میں یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ وہ مشکل پسند اور کس قدر "چیستاں گو" شاعر تھا اس کا تخیل ناہموار اور ناشناس راہوں پر دوڑتا ہے وہ مجرد تصورات کو مرئی شکلوں میں ڈھالتا اور کیفیات سے نئے استعارے تراشتا ہے معنی آفرینی اور خیال بندی کا بادشاہ ہے اور خیال کی ندرت اور باریک بینی کی فکر میں تجسس اور تفکر کی نئی راہیں نکالتا ہے۔ نیاز کے پاس بیدل کا سا بے کل تخیل نہیں ہے لیکن استعاروں کی تراش خراش کیفیات حس کے باہمی ارتباط و انتقال اور جرأت فکر میں وہ بیدل سے متاثر

ضرور ہیں اس لئے ان کی نثر میں وہی استعاراتی کیفیت تراش دشوار پسندی اور بوجھل پن جھلکتا ہے۔

وائلڈ لفظوں کا صیاد ہے اور قول محال سے ایک جہان معنی پیدا کر دیتا ہے وائلڈ کی سی شگفتگی سادگی اور ہلکا پھلکا پن نیاز کو نہیں ملا مگر جمالیاتی احساس پر اس قدر زور نیاز کے ہاں غالباً وہیں سے آیا ہے حسن کا تصور نیاز کے ہاں بھی کسی قدر مجرد اور غیر افادی ہے اس کے پیچھے سماجی ذمہ داری کا کوئی احساس جلوہ گر نہیں ہے وہ فنون لطیفہ کو ایک مدت تک حسن کی موج اور حسن کی کے پیدا کردہ احساس سپردگی کا نام سمجھتے رہے ہیں۔ یہ کیفیت ان کے مضامین میں جلوہ گر رہی ہے۔

انشا پردازی کی حیثیت سے بھی نیاز کا ایک تاریخی مقام ہے ان کی انشا پردازی غالب اور سرسید کی کھلی ڈلی شخصیت کی غماز نہیں ہے بلکہ ایک شمشیر خوش غلاف ہے جس کی کاٹ سے پیادہ نہیں مگر اس کے غلاف کی سجاوٹ مسحور کن ہے۔ نیاز سجے سجائے محلوں اور تصویروں کے عادی ہیں اس لئے ان کے مضامین ــــ اور مکاتیب بھی ــــ ان کے ڈرائنگ روم ہیں گھر کا آنگن نہیں ہیں۔ وہ بے ساختہ اور بے تکلف چلنے کے عادی نہیں۔ وہ کبھی اپنی شخصیت کو بے محابا اور بے غلاف پیش نہیں کرتے وہ کبھی اپنے ڈرائنگ روم میں "تہمد اور بنیان پہن کر" کسی کا استقبال نہیں کرتے۔ یہ نفاست شائستگی اور آراستگی جزو فن ہے۔ وہ ایک ایسے مشنری کی زندگی بسر کرتے ہیں جس نے اپنے کو خوبصورتی کی بارگاہ سے منسوب کر دیا ہے۔ اس لئے بڑے پرکیف اور دلچسپ ہونے کے باوجود ان کے مضامین بے ساختگی سے محروم ہیں۔ وہ ایک ایسی نقاب کی مانند ہیں جس کے پیچھے چھپنے والا ہنوز آرائش جمال سے فارغ نہیں ہوا ہے۔ البتہ جب کبھی وہ تخیل کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو ان کا پیکر تراش ذہن نئے نئے مجسمے ڈھالتا نئی دنیائیں سجاتا اور نئی نئی کہانیاں سناتا گزرتا ہے۔

نیاز کے مضامین ایک سنبھلے ہوئے مگر آزاد خیال ادیب کی تخلیق ہیں۔ ان میں توازن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ نیاز کی شخصیت اور ان کے آرٹ دونوں میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ وہ کبھی احساس کی نذر نہیں ہوئے۔ اس لئے وہ مجاز یا مقلد نہیں بنے نیاز رہے۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ کس جگہ پر رک جانا ضروری ہوتا ہے مگر بغاوت کے جوش میں بھی وہ اس سبق کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ نیاز نے روایت پرستی کے جمود کو للکارا۔ جھوٹے پندار اور نقلی زہد کے جبہ و دستار اتار پھینکے عقلیت کا مذاق بھی اڑایا شہری تمدن اور اس کے کاروباری اور میکانکی انداز زندگی پر طنز بھی کیا مگر وہ کبھی باغی کا سا ابال اور جوش جنوں کی سی وارفتگی کا شکار نہ ہوئے۔ اس لئے ان کے مضامین میں تخیل کا نکھار ہے مگر جوش جنوں کی سرمستی نہیں ہے۔ البتہ تخیل کی فراوانی اور انداز بیان کی دل فریبی کے اعتبار سے ان کے مضامین کی ایک تاریخی حیثیت برقرار رہے گی۔

مگر دونوں حیثیتوں سے بڑی حیثیت مدیر نگار کی ہے نگار نے اردو ادب کی شائستگی میں ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کی کئی نوعیتیں ہیں ایک اس اعتبار سے کہ نگار نے ہمارے یہاں کے ادبی پرچوں کو علمی مذاق سے آشنا کیا اور پڑھنے والوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر دیا جو محض چٹخارے کے لئے چند افسانوں یا غزلوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر دنیا کی موجودہ صورت حال اور اس کے مبلغ علم کے مختلف شعبوں سے بھی دلچسپی لینے لگے۔ ایک طرف ملاحظات میں عصری سیاست کا جائزہ لیا گیا دوسری طرف استفسارات وجوابات کے دائرے میں ہر قسم کے علمی اور فکری

مسائل چھیڑے گئے پھر اسی رسالے کے صفحات مذہبیات تاریخ اقتصادیات علم فراست الید علم تحریر بھاشا کی شاعری شہوانیت تک کے مسائل و موضوعات کے لئے وقف رہے۔ اس نے نئی فکری وسعت پیدا کی اور اردو والوں کو ایک کائناتی نگاہ دی۔ اس وسعت ذوق کا اہتمام اس سے قبل بہت کم رسالوں سے ہو سکا تھا۔

اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ نگار نے ہمارے کلاسیکی شعرا کی طرف بھی توجہ کی۔ نگار کے خاص نمبر آج تک خاص اہمیت کے مستحق ہیں مصحفی نمبر، نظیر نمبر، اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان شماروں نے ایسے مشاہیر کی طرف ہماری توجہ مرکوز کر دی جنہیں تاریخ ادب میں مناسب مقام نہیں ملا تھا۔ یہ نمبر حرف آخر نہیں تھے مگر انھوں نے تحقیق و تنقید کے سلسلے میں ایک تحریک پیدا کر دی۔ اس سلسلے کی ایک کڑی خود نیاز کا ذوق تنقید ہے جس کا نمایاں طور پر اظہار رسالہ و ماعلیہ کے سلسلے میں ہوتا رہا ہے۔

نیاز کی تنقید نگاری اصول تنقید سے متعلق کم ہے اور عملی تنقید سے متعلق زیادہ۔ ان کا مذاق شعر بنیادی طور پر غزل کا پروردہ ہے۔ وہ نظم میں بھی تغزل کے زیادہ قائل ہیں نظم نگاری کے سلسلے میں جوش اور علی اختر کے درمیان ان کا محاکمہ بھی اس کی نظیر ہے اقبال کی فن کاری کو پوری طرح تسلیم نہ کرنے میں بھی یہی زاویۂ نگاہ کارفرما ہے۔ نیاز کی تنقید کو منطق کی اصطلاح میں Deductive کہنا چاہیئے وہ پہلے شعر پر غور کرتے ہیں اور پھر اس کی معنوی اور لفظی خوبیوں سے سلسلہ وار نتائج نکالتے ہیں وہ نفس مضمون سے زیادہ انداز بیان کے قائل ہیں اور انداز بیان کی نزاکتوں اور پہلوؤں میں انہیں لطف آتا ہے اسی لئے وہ باستثنائے میر اردو کے سب شعرا کے دواوین میں سے صرف دیوان مومن کو انتخاب کر لینے پر آمادہ ہیں۔

نیاز کی تنقید شعر سے شروع ہوتی ہے اور انداز بیان کی لطافت کے تجزیئے پر ختم ہوتی ہے وہ عام طور پر نہ تحقیق پر زیادہ زور دیتے ہیں نہ نفس مضمون کے سماجی اور فکری پس منظر پر۔ ہاں شعر فہمی اور سخن سنجی ان کے ہاں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں کہیں کہیں وہ اسلوب کے تجزیئے ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تنقید نگاری کے سانچے کو لازمی طور پر قدیم قرار دیا جاتا ہے۔ نیاز تراکیب الفاظ کے برمحل اور صحیح استعمال اور حسن ادا کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اس لئے ان کی تنقید میں اکثر زبان کی خامیوں تراکیب کی ناہمواری کا ذکر اور ان کی گرفت بھی ملتی ہے لیکن بنیادی طور پر نیاز کیفیت کے قائل ہیں اور یہ کیفیت ایک طرح کی پر اسرار جمالیاتی احساس کا نام ہے اسی لئے ان کی تنقید میں جمالیاتی بازآفرینی کی کوشش زیادہ ملتی ہے اور سائنٹفک انداز نظر کم۔ ان کی تنقید کا مقصد قاری کو دوبارہ اس کیفیت سے گزارنا ہوتا ہے جو تخلیق کے وقت خود اصل مصنف پر گزری ہوگی فرق صرف یہ ہے کہ بازآفرینی کے اس عمل میں وہ نفسیات اور سماجیات سے اس قدر کام نہیں لیتے جتنا کہ خود علم بیان اور اصول فصاحت سے لیتے ہیں۔

ان کی تنقید کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام تر تاثراتی اور غیر متوازن نہیں ہے۔ انشائیہ اور افسانے میں جو رومانیت اور شعریت پرستی بلکہ تغزل پرستی کا میلان ملتا ہے وہ تنقید میں تاثراتی رنگ اختیار نہیں کرتا اس میں وہ شدت کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ انھیں شوخ رنگوں سے زیادہ پیچیدگی اور ترچھا تیکھا انداز پسند آتا ہے بشرطیکہ وہ قدیم طرز تغزل کے دائرے میں ہو۔ اسی لئے انہیں بیدل اور مومن پسند ہیں۔ تنقید میں نیاز کا دائرہ کمال محدود ہے مگر اس میں ان کا کھرا ذوق تغزل اور جمالیاتی کیفیت کی رمز شناسی کا کھلا ڈلا انداز صاف جھلکتا ہے۔

جدید اردو ادب کی آرائش و زیبائش میں نیاز کا کیا مقام ہے نیاز کی تخلیقی صلاحیتیں بے پناہ ہیں اور ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ابھی ان کے قلم سے اور کس قدر اہم کارنامے وجود میں آئیں گے اور ان کی روشنی میں ان کا ادبی مرتبہ کس حد تک بلند اور ارفع ہوگا۔ ہر اردو دوست کی یہی خواہش ہے کہ انہیں عمر کی درازی اور صحت کی سلامتی تا دیر میسر رہے اور وہ اردو ادب کی آبیاری پوری سرگرمی اور تندہی سے کرتے رہیں لیکن اب تک ان کی تخلیقات کی روشنی میں ان کے ادبی مرتبے کا تعین کیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نیاز ہمارے ادب میں آزاد خیالی اور آراستگی بیان کے علمبردار ہیں وہ ہماری نثر کے معماروں میں ایک ممتاز درجے پر فائز ہیں ظاہر ہے کہ چراغ راہ ہیں منزل نہیں ہیں اور اردو نثر کا قافلہ ان سے آگے بڑھ گیا ہے اس کا احساس خود ان کو بھی ہے اسی لئے خود نیاز کے طرز میں تبدیلی ہوئی ہے ادھر انھوں نے آراستگی کو کم کیا ہے مگر عربی اور فارسی کی نامانوس تراکیب سے لگاؤ کی وجہ سے اب بھی ان کی نثر کو سادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ انہوں نے اردو دنیا میں جرأت فکر کے چراغ جلائے ہمارے لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کے ذہن کی تربیت کے علوم و فنون کے نئے ذخائر فراہم کر کے کلاسیکی ادب کا نیا شعور پیدا کیا اور قدیم و جدید ذہن کا ایک ایسا امتزاج پیدا کیا جس نے نئی نسل کی پرداخت اور نشو و نما میں مدد دی۔

آزاد خیالی کی ہمارے یہاں بڑی اہمیت ہے۔ ادب میں نئے سوتے کھودنے کے لئے روایت کے سنگ گراں کو ہٹانا ہی پڑتا ہے اس لئے نیاز نے مذہب اور اخلاق کی سطح پر جس طرح آزاد خیالی کا علم بلند کیا وہ نہایت قابل قدر ہے یہ عجیب بات ہے کہ سر سید نے جس اعتزال و اجتہاد کی روایت کی بنیاد ڈالی ہے اس کو آگے بڑھانے میں نیاز کا نام لیا جا سکتا ہے گو نیاز کی آزاد خیالی سر سید سے قطعی مختلف تھی اور سر سید نے ادبی روایت میں سلاست سادگی اور روانی کا جو سرچشمہ لاکر ملا دیا تھا اس کی تراش خراش نیاز کے ہاتھوں نہ ہوئی۔ آج کی نسل کو نیاز سے یہی جرأت فکر سیکھنا ہے ان کی نثر نگاری آراستگی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہے گی مگر ان کی شخصیت زمانے کو یہ بات ضرور یاد دلاتی رہے گی کہ تجسس اور تشکیک حقیقت اور صداقت کی دریافت کے لئے ناگزیر راستے ہیں اور گوہر آبدار انہیں کے ہاتھ آتا ہے جو ان پر خطر راستوں پر چلتے ہیں اور ان پرپیچ منزلوں سے گزرتے ہیں۔

تاثرات و ارتسامات

محمد زکریا مائل

نیاز صاحب ایک صاحب طرز ادیب اور بلند پایہ صحافی ہیں۔ ادب اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے اور صحافت ایک خاص انداز میں کسی مخصوص خیال کو دوسروں تک پہنچانے کا موثر وسیلہ ہے۔ ایک اچھا ادیب اچھا صحافی ہو سکتا ہے لیکن اچھے صحافی کا اچھا ادیب ہونا ضروری نہیں جب کوئی اچھا ادیب صحافت کے پیشے کو اپناتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اس کو بیک وقت متعدد صلاحیتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ تخلیق بھی کرتا ہے اور تنقید و ترتیب کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اس کو نہ صرف اپنے دور کے ادبی، سیاسی، مذہبی یا سماجی رجحانات اور تحریکات سے باخبر رہنا پڑتا ہے بلکہ ماضی کی روایات اور تاریخ بھی اس کی حد نظر میں رہتی ہے۔ جہاں اس کے مزاج میں استقلال اور اس کے ساتھ قوت فیصلہ اور قوت استدلال کی ضرورت ہے، علم میں گہرائی اور مشاہدہ میں وسعت کے اوصاف بھی نہایت ضروری ہیں۔ اس کا نقطۂ نظر ہر مسئلے میں آزاد ہونا چاہیئے۔ جس خوش بخت ادیب میں یہ تمام صلاحیتیں مجتمع ہو جائیں اسے "دیدہ وران چمن" میں امتیازی مقام حاصل ہو کر رہتا ہے۔ حضرت نیاز کی ذات میں انہی صلاحیتوں کے عجیب امتزاج نے جس شخصیت کی تعمیر کی ہے اب وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

۱۸۵۷ء کا دور اردو زبان کے نشاۃ ثانیہ کا دور ہے۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے ادب کو نظری رنگ دینے، زندگی سے قریب تر لانے اور اصلاح قوم کی غرض سے مسائل زندگی کا حل پیش کرنے کے لئے صحافت کو اپنایا اور تہذیب الاخلاق کی داغ بیل ڈالی۔ تہذیب الاخلاق جس اصلاحی مشن کو لے کر نکلا تھا سر سید احمد خاں نے اس کو زیادہ بار آور بنانے کے لئے ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جس سے اردو زبان کی جاذبیت دہ چند ہو گئی اور لوگ ان کے مضامین کا بڑے ذوق و شوق کے ساتھ خیر مقدم کرنے لگے۔

سر سید کے بعد بھی ایسے بزرگان ادب کی تعداد کچھ کم نہیں جنہوں نے ادب اور صحافت کے خوش گوار امتزاج سے اصلاح قوم اور اصلاح زبان کی خدمات انجام دیں۔ ان برگزیدہ شخصیتوں میں چند نام تو زبان زد خاص و عام ہیں مثلاً پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی وحیدالدین سلیم، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق وغیرہم۔ یہ بزرگ معمار قوم بھی ہیں اور مصلح ادب بھی۔ نیاز بھی انہیں بزرگوں کی صف میں ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے نگار ۱۹۲۲ء سے منظر عام پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ نیاز صاحب کا مسکن بھوپال تھا اور ان کی ادیبانہ صلاحیتیں برسوں پہلے نقاد آگرہ، ادیب اور صوفی جیسے ماہناموں کے ذریعے دنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کر چکی تھیں۔ نگار نے اشاعت پذیر ہوتے ہی علم و ادب کے طلبگاروں کے دل موہ لئے۔ اس نے اپنی نمایاں خصوصیت اور امتیازی معیار سے اردو کے رسالوں میں بہت جلد ایک بلند مقام حاصل کر لیا اور اس میں شک نہیں کہ وہ معیار آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ اپنے بانی کی ادبی عظمت کا سنگ نشان بنا ہوا ہے۔

مجھے جناب نیاز کی خدمت میں اسی زمانے میں نیاز حاصل ہوا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مجھے نگار کی بدولت نیاز صاحب سے مستفید ہونے کا موقع ملا

یہ نیاز صاحب کی ملاقات نگار سے استفادہ کا وسیلہ بنی کیونکہ نیاز صاحب اور نگار کچھ ایسے لازم و ملزوم ہو گئے ہیں کہ ان کا ایک دوسرے سے علیحدہ تصور مشکل نظر آتا ہے۔ ایک عرب شاعر جس نے شراب کی تعریف میں کس مزہ سے کہا تھا کہ شراب اور شیشہ شراب دونوں کا رنگ اس طرح مل جل گیا ہے کہ شراب شیشہ معدوم ہوتی ہے اور شیشہ شراب۔ میرے ذہن میں نگار اور نیاز کا تصور بھی اسی شان سے مرتسم ہو گیا ہے۔ تاہم دونوں میں اتنا امتیاز بہرحال قائم رہے گا کہ اگر نگار کو ادبی ماہناموں میں ایک اعلیٰ معیاری مجلے کی حیثیت حاصل ہے تو نیاز صاحب ایک صاحب طرز ادیب اور بلند پایہ انشاپرداز کے نمایاں مرتبے پر فائز ہیں۔

زندگی پر متضاد کیفیات اور حالات طاری ہوتے رہتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ نیاز صاحب عمر کی ۸۰ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ اس طرح ان کی ادبی زندگی کی عمر زیادہ نہیں تو ساٹھ برس ضرور ٹھہرتی ہے۔ اس مدت میں انہوں نے دنیا کے بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ، تغیر پذیر رسم و رواج اور حالات، بدلتی ہوئی حکومتیں سبھی کچھ دیکھا ہے۔ انہوں نے وہ کچھ بھی پڑھا ہے جو کم و بیش ساٹھ برس پہلے پڑھا جاتا تھا اور وہ بھی جو اب پڑھا جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا رہا ہو جو ان کی نظر سے بچ گیا ہو۔ علم اور مشاہدے کی اس وسعت نے انہیں زندگی کی ان تمام کیفیات سے روشناس کرا دیا جو باہم تضاد رکھنے کے باوجود ہر اعتبار سے اہم ہیں اور جنہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یا یوں کہیے کہ زندگی کے جو پہلو بجائے خود مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنی جگہ نئے نئے مسئلے پیدا کرتے رہتے ہیں نیاز صاحب نے ان پر گہری نظر ڈالی اور پھر یہی مسائل ان کے موضوعات بن کر نوک قلم سے قرطاس پر بکھرتے رہے۔ اسی لئے نیاز صاحب کے موضوعات میں تنوع بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے مذہب کو بھی موضوع بنایا اور ادب کو بھی۔ اصلاح زبان پر بھی قلم اٹھایا اور اصلاح نفس پر بھی۔ ایک طرف ان کی ادبی تنقیدوں کو حسن قبول حاصل ہوا تو دوسری طرف جنسی مسائل اور شباب پر بھی ان کی تحریروں کو امتیازی مقام ملا۔ ان تمام متنوع مضامین میں دو خصوصیات مشترک اور بہت نمایاں ہیں۔ ایک ان کا ذاتی انداز نگارش دوسرے ہر مسئلے پر ایک خاص نقطہ نظر۔ یہ درست ہے کہ ان کے خیالات و آراء سے اختلاف کی گنجائش ہے خصوصاً مذہبی مسائل کی تحقیقات میں لیکن ساتھ ہی یہ بھی غلط نہیں کہ انہوں نے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے میں استدلال سے کام لیا ہے اور اپنے وسیع مطالعہ کو بھی نظر میں رکھا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان کا استدلال کس درجہ قوی ہے اور حریفوں کو اپنی قوت سے کس حد تک مطمئن کر سکتا ہے اس پر ہر مذہب خیال کے لوگ اپنے طرز فکر کے مطابق آئے دن بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کے یا نیاز صاحب کے برحق ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرنا میرے موضوع سے خارج ہے۔ جناب نیاز نے مذہبی عقائد پر جو معرکہ آرا بحثیں کی ہیں چونکہ ان میں بیشتر ایسی ہیں جن میں خود مجھے بھی نیاز صاحب کے مسلک سے اتفاق نہیں ہے اس لئے ان سے صرف نظر کرتے ہوئے حضرت نیاز کی دوسری علمی و ادبی کاوشوں کو دل سے سراہتا ہوں۔ میں نے نیاز صاحب کی ان قابل قدر خدمات کی تحسین کی ہے جو انہوں نے اصلاح زبان اور ادبی تنقید کے ضمن میں سر انجام دی ہیں۔ ان کی نو بہ نو تراشیدہ ترکیبوں میں سے اکثر کو قابل داد سمجھا ہے اور زبان میں ایک اضافہ خیال کیا ہے۔ ان کے مرتب کئے ہوئے خاص نمبروں کو ہمیشہ معیار کے مطابق بہت شاندار پایا ہے۔ جن میں صرف شعراء سے متعلق ہی خاص اشاعتیں قابل ذکر نہیں ہیں بلکہ علمائے اسلام نمبر اور فرمانروایان اسلام نمبر بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن کی تیاری میں جتنا وقت اور جتنی تلاش و کاوش سے کام لیا گیا ہوگا اس کا اندازہ اہل نظر کے لئے چنداں دشوار نہیں۔

اسی سلسلے میں نیاز صاحب کی وہ اصلاحیں بھی قابل ذکر ہیں جو انہوں نے بعض شعراء کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے دی ہیں۔ ان اصلاحوں کی بنا پر شعراء کے درمیان اچھی خاصی ہلچل مچ گئی اور ہر قسم کے موافق مخالف خیالات ظاہر کئے جانے لگے۔ فرصت میسر ہوتی تو نگار کے ایسے چند نمبر مہیا کر کے ان پر غور و خوض کرتا اور ان سے متعلق اپنے خیالات بھی ظاہر کرتا جس زمانے میں لکھنؤ سے جگر نمبر شائع ہوا تھا اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے کا موقع ملا اور مجھے یہ ظاہر کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میں نے اس وقت یہی رائے قائم کی تھی کہ نیاز صاحب کی بعض اصلاحیں محل نظر ضرور ہیں۔ یہ ہیں وہ میرے اجمالی تاثرات جو میں نے حضرت نیاز کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے ادبی و تنقیدی کارناموں سے متعلق اپنے ذہن میں مرتسم پائے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان خیالات میں رد و قبول کی خاصی گنجائش نظر آئے مگر میں نے یہ جسارت بحث و مناظرہ کو دعوت دینے کے لئے نہیں کی ہے بلکہ اسے اپنا اخلاقی فریضہ تصور کیا ہے کہ حضرت نیاز سے متعلق اپنے خیالات بے کم و کاست پیش کر دوں۔

نیاز کی ہمہ گیری

مولانا محمد حسین عرشی

"بعض مصنفوں کی تصانیف مسلسل نظر سے گزرتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ وہ قاری کی زندگی میں رچ کر جزو زندگی بن جاتی ہیں۔ میں تقریباً نصف صدی سے مولانا ابوالکلام کی دینیات اور آپ کی "لادینیات" کا مطالعہ کرتا آرہا ہوں، اس طرح آپ میری حیات ذہنی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔"

میں نے ایک ملاقات میں مولانا نیاز سے آغاز ملاقات میں یہ بات کہی، جس کو سن کر وہ مسکرا دیئے۔ آج کی صحبت میں میں اسی بات کی مختصر شرح عرض کروں گا۔

پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ ہے۔ الہلال کلکتہ کا دورِ اول ہے۔ مولانا ابوالکلام کے سیاست آمیز اسلامی مضامین اپنے پورے جوش شباب کے ساتھ سارے ملک (ہند) کے ذہین طبقے کے قلوب و ارواح کو سیلِ بے پناہ کی طرح اپنے ساتھ ساتھ بہائے لئے جارہے ہیں۔ ایک انوکھا اور بھاری بھرکم اندازِ تحریر، نیا اسلوب بیان، نرالی، اسرافیلی قسم کی آواز، اس کے ساتھ ہی اخبار کی وضع قطع، رسم الخط، کاغذ، شان طباعت وغیرہ ہر چیز جدت، ـــ سراپا جدت کی شان لئے ہوئے ـــ ہفتہ بھر مشتاق نگاہیں اور پُرشوق دل الہلال کے انتظار میں بے تاب رہتے ـــ میرے استاذ حکیم فیروز الدین احمد فیروز طغرائی ان دنوں صبح اور عصر سے شام تک مطب کرتے اور دن کے درمیانی وقت میں دفتر اخبار وکیل امرتسر میں حاضری دیتے، وہاں ان کے ذمے دو کام تھے: "وکیل" کے لیے عربی اخبارات کا ترجمہ کرنا اور ماہ نامہ "تہذیب الاخلاق" (یادگار سر سید مرحوم) کی ادارت۔ جب وہ سہ پہر کے بعد واپس مطب میں آتے تو تبادلے میں آئے ہوئے نئے اخبارات و رسائل ساتھ لے آتے مصر کے علامہ رشید رضا کا رسالہ "المنار" اور کلکتے کا "الہلال" ان کی خصوصی توجہ کا مرکز ہوتے تھے۔ الہلال کی صحیح قرأت ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی، حکیم صاحب خود اس کو پڑھتے اور ہم لوگ حلقہ باندھے ان کے گرد بیٹھ کر سنتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان آگ برسانے والے مضامین کا لکھنے والا (ابوالکلام احمد) عن قریب کوئی بہت بڑا دعویٰ کرنے والا ہے۔ جس کو اس کے قارئین تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔

اسی دور کے متصل آگرے سے شاہ دلگیر مرحوم نے ماہ نامہ "نقاد" جاری کیا۔ نقاد اپنی طرز کا یکتا رسالہ تھا۔ اس میں مختلف لوگوں کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ جاذب توجہ اور مسحور کن مضامین ان صاحب کے ہوتے تھے جو برسوں بعد بہت سی کتابوں کے صاحب طرز مصنف اور مدیر نگار کی حیثیت سے ملک میں معروف ہوئے۔ پہلے پہل مولانا نیاز اور یلدرم صاحب کے انداز میں کچھ مماثلت تھی۔ جس کو ترکی ادب کا عکس سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں تدریجاً معلوم ہوتا گیا کہ مولانا نیاز اتنے مقلد نہیں جتنے مجتہد ہیں۔ ان کی تحریر و تصنیف کے ہر گوشے میں ان کا اپنا طبع زاد حصہ بہت زیادہ ہے۔

میرا دینی و سیاسی ذوق ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ میں "الہلال" سے پوری طرح مستفید ہو سکتا۔ لیکن ادبی ذوق سے میری عمر اور طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی۔ اس لئے "نقاد" اور خصوصاً اس میں مولانا کی نگارشات مجھے تمام ملکی جرائد میں یکتا نظر آنے لگیں۔ نقاد نے زیادہ عمر نہ پائی۔ مجھے اس کا دکھ ہوا، اس کے کچھ عرصہ بعد بھوپال سے "نگار" نے جنم لیا۔ نگار، نقاد کا بدل ہی نہیں بلکہ نعم البدل ثابت ہوا۔ وہ جہاں تک میرا خیال ہے خالص ادبی قسم کا پرچہ تھا۔ لیکن "نگار" اپنے دامن میں مختلف علوم و فنون کے جواہر آب دار کے منقش صفحات پر جلوہ گر ہوا۔ اس میں مولانا نیاز کو اپنے ذہن و دماغ کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملا۔

مدت ہوئی ایک دفعہ کسی مستفسر نے استفسار کیا تھا کہ ایک اچھے ایڈیٹر کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے جلد کم از کم اسے کیا کچھ جاننا چاہیئے؟ مولانا نیاز نے اس کا جو جواب دیا تھا وہ اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔ اس کا دھندلا سا عکس جو ذہن میں رہ گیا ہے ایسا ہے کہ ایڈیٹر کے لئے تمام مروجہ علوم میں دست رس رکھنا لازم ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی مشہور زبانوں کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے۔ نظم و نثر پر ماہرانہ قدرت، تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، موسیقی، دینیات، مذاہب عالم، علم الاسنہ، سیاسیات عالم، منطق، فلسفہ قدیم و جدید۔ مغرب و مشرق کے قدیم و جدید علوم وغیرہ وغیرہ پر اس کی گہری نظر ہو ———

اس کے ساتھ ہی مولانا نیاز نے اپنے ہم عصروں میں تین نام پیش کئے تھے۔ جن کو صحیح معنی میں ایڈیٹر یا مدیر مسئول کہا جا سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں ——— میں نے جب یہ استفسار اور مولانا کا جواب پڑھا تو معاً میرے ذہن میں ایک چوتھا نام بھی آیا اور وہ خود مولانا نیاز کا نام تھا۔ وہ تینوں بزرگ تو اپنا اپنا فرض ادا کر کے دنیا سے رخصت ہوئے اور مولانا بفضلہ تعالیٰ علمی خدمات میں مصروف ہیں۔ اب کہ وہ عالم پیری میں ہیں۔ لیکن ان کے قلم میں پختگی و ثقاہت کے ساتھ جوانی کی دل کشی بھی موجود ہے۔

تراجم میں انہوں نے تاریخی، فلسفی، جنسی، ادبی وغیرہ مختلف قسم کی کتابوں کے ترجمے کئے۔ ان سب میں زبان بیان کا حسن اور اسلوب ان کا اپنا ہے۔ ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو۔ بلکہ تصنیف کی شان رکھتا ہو۔ ٹیگور کی مایہ ناز تصنیف کا (غالباً) انگریزی سے اردو میں سب سے پہلا ترجمہ انہوں نے کیا۔ میں بنگالی نہیں جانتا۔ اس لیے اندازہ نہیں لگا سکتا کہ شاعر اپنے اندر کیا کیا خوبیاں رکھتا ہے۔ لیکن مولانا نیاز کا اردو ترجمہ دیکھ کر طبیعت اتنی ہی متاثر ہوئی جتنی کسی اعلیٰ درجے کے شاعر کا اصل کلام دیکھ کر متاثر ہو سکتی تھی۔ میں نے جب پہلے پہل اس کتاب کو دیکھا تو ایک الہامی کتاب کی طرح بار بار اس کو پڑھا اور اہل ذوق احباب کو بڑھ بڑھ کر سنایا اس کی قرات سے جی اکتاتا ہی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بائبل کے صحیفے "غزل الغزلات" اور "کتاب الامثال" وغیرہ ایک نئی شان سے سامنے آ رہے ہیں۔

مولانا کے طبع زاد افسانے "شہاب کی سرگزشت"، "ایک شاعر کا انجام" "نقاب اٹھ جانے کے بعد" کو پڑھنے کے بعد میں نے اپنے اندر سے ہمیشہ "ہل من مزید" کی آواز سنی۔

"جواب" استفسارات" کو دیکھیے تو ایک وسیع انسائیکلوپیڈیا کے دروازے کھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جواب لکھنے والا صرف ناقل معلوم نہیں ہوتا، ہر سوال کے جواب میں اس کی اپنی ایک جچی تلی رائے اور فیصلہ کن تحریر ملتی ہے۔ جس سے اختلاف ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں۔ مذہبی سوالوں کے جواب میں ان کی جدت طرازیاں ضرور محل نظر ہیں۔ (چنانچہ میں اپنے رسالہ "البیان" امرتسر میں ان کی تردید میں مضامین لکھتا رہا ہوں) لیکن اس سے ان کی وسعت معلومات پر حرف نہیں آتا۔

ان کی زبان دانی کا یہ عالم ہے کہ اردو ان کی اپنی زبان ہے۔ لیکن اس کو انہوں نے نئی زندگی بخشی۔ وہ اپنے اسلوب میں کسی

سابق مصنفین کے پیرو نہیں، انہوں نے بہت سی نئی ترکیبیں ایجاد کیں۔ جن سے زبان کا دامن یکسر خالی تھا۔ ان سے متاثر ہو کر بعض لوگوں نے تتبع کی کوشش کی لیکن کسی کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

مشکل اشعار کی شرح میں ان کو جو ملکہ حاصل ہے۔ شاید ہی کوئی دوسرا شخص ان کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا۔ اردو میں سب سے زیادہ مشکل غالب ہے اور فارسی میں مرزا عبدالقادر بیدل۔ ان دونوں کو جس احتیاط سے وضاحت سے مولانا حل کرتے ہیں۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ شرح غالب کا تو انہوں نے ایک ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ بیدل پر کام کرنے کی ان کو فرصت نہیں ملی۔ میں نے ایک دفعہ ان کو اس طرف توجہ دلائی تھی۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ بیدل کا ذوق رکھنے والے ملک بھر میں کتنے ہیں جن کی خاطر یہ مشقت برداشت کی جائے؟ (یہ بات بہت مدت کی ہے۔ شاید اب ان کو یاد بھی نہ ہو۔)

عربی اشعار کی شرح میں ان کا اسلوب سابق شارحین مولانا ذوالفقار علی شارح حماسہ و متنبی و سبعہ معلقہ وغیرہ سے مختلف ہے۔ لیکن توضیح اور تشریح اور تسہیل و تفہیم میں ان کا اسلوب محض مدرسانہ نہیں۔ بلکہ اپنے اندر دلکشی اور دلچسپی بھی رکھتا ہے۔ انہوں نے اس پر کوئی مستقل تصنیف تو نہیں کی لیکن نگار کے بعض مضامین (مثلاً ابو نواس وغیرہ) سے ان کی اس اہلیت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

ہندی شاعری کی جن باریکیوں تک وہ پہنچتے ہیں۔ وہ ان کی "جذبات بھاشا" اور نگار کے "ہندی شاعری نمبر" سے پوری طرح نمایاں ہیں۔

اردو، فارسی، ہندی اور عربی میں کامل مہارت کے علاوہ انگریزی کا مطالعہ بھی بہت وسیع رکھتے ہیں۔ جن کا ثبوت ان کے رشحات قلم سے واضح ہوتا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترکی سے بھی انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اور بھی بعض زبانوں میں دسترس رکھتے ہوں، جن کا مجھے علم نہیں۔

ہر سال کے آغاز میں "نگار" کا خاص نمبر اپنے موضوع پر ایک منفرد مثال پیش کرتا ہے۔ اس کا دائرہ ادب، تاریخ، اسلامیات، عالمی معلومات وغیرہ مختلف موضوعات پر حاوی ہوتا ہے۔ پھر جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس میں قاری کو تشنگی محسوس نہیں ہونے دیتے۔ اقبال نمبر، مصحفی نمبر، مومن نمبر، غالب نمبر، نظیر نمبر، ہندی شاعری نمبر، علمائے اسلام نمبر، شاہان اسلام نمبر، خدا نمبر وغیرہ اپنے اندر ایسی خصوصیات رکھتے ہیں جن سے پاک و ہند کے معروف جرائد کے خاص نمبر یک سر محروم ہیں۔ ایسے خاص شماروں کی تصنیف ایک ایسے ہی دماغ کی متقاضی ہے جو ہمہ جہتی معلومات کا حامل ہو۔ اس کے ساتھ ہی محض نقال و مترجم نہ ہو۔ بلکہ اپنی فکر و رائے اور اسلوب و انداز میں تجدید و اجتہاد کا ملکہ بھی رکھتا ہے۔

فن تنقید میں مولانا اپنے طرز خاص کے مالک و موجد ہیں۔ ان کی تنقیدات کا گہرا مطالعہ کر کے ایک ذہین دماغ اپنے اندر بہت سی علمی دولت سمیٹ سکتا ہے۔ "انتقادیات" اور "مالہ و ماعلیہ" ان کی ایسی تصانیف ہیں۔ جن کو پڑھ کر بڑے بڑے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے کم زور پہلو بالکل بے لوث اور مدلل انداز سے سامنے آجاتے ہیں۔

ان کے مکتوبات بھی اپنی صوری و معنوی رعنائی میں آپ ہی اپنی مثال ہیں۔ اردو میں غالب کے بعد مکتوبات کا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ "نقوش" کا ایک خاص نمبر ہی مکتوبات کی انسائیکلو پیڈیا کی شان میں شائع ہو چکا ہے۔ سرسید، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، اقبال اور ابوالکلام کے اصلی اور فرضی خطوط اپنی اپنی خصوصیات کے حامل ہیں۔ بعض خطوط پر افادیت غالب ہوتی ہے اور بعض پر ادبیت۔ اور بعض ان دونوں صفات سے بے نیاز صرف واقفیت سے سروکار رکھتے ہیں۔ مولانا نیاز کے مکتوبات میں زندگی چلتی پھرتی اور شوخیاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس پر ایک مخصوص اور ممتاز ادبیت کا رنگ و روغن اس کی قدر

حیثیت میں نمایاں اضافہ کر رہا ہے۔ کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ہی قاری کو سامنے بیٹھے ہوئے مصروف مکالمہ دکھائی دینے لگتے ہیں یوں سمجھئے کہ وہ خطوط نگاری میں بھی منفرد اور اپنی طرز کے مالک ہیں۔

شعر و شاعری کو انہوں نے پیشہ نہیں بنایا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس طرف توجہ کرتے تو عام روش سے الگ اپنی راہ نکال لیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوانی میں انہوں نے کچھ دنوں شعر گوئی کا شغل ضرور بنا لیا ہوگا۔ پھر اس مختصر ذخیرے کو محفوظ رکھنے یا شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس وقت مجھے ان کا اسی رسالے کا صرف ایک شعر یاد آ رہا ہے نہ صرف یہ کہ یاد آ رہا ہے، بلکہ ہمیشہ ہی یاد رہتا ہے۔ جب پہلے پہل یہ شعر میری نظر سے گزرا تو اس وقت میری عمر کا ابتدائی دور تھا کہ میں سرتا پا اس کی لذت میں ڈوب گیا۔ اور آج جب کہ میں فکر و ذہن اور عمر و جسم کے بہت زیادہ تغیرات سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہوں جہاں غروب کی منزل بالکل قریب دکھائی دے رہی ہے۔ اس وقت بھی میرے لئے مولانا کے اس شعر میں کافی دل ربائی اور رعنائی موجود ہے۔ لیجئے، شعر پڑھیئے اور میرے انتخاب سے اتفاق کیجئے۔ فرماتے ہیں ؎

دست نازک جب پھرے سینے پہ وجہ خواب تھا
ہائے یہ کم بخت دل اس وقت بھی بے تاب تھا

میرا تجربہ یہ ہے کہ بعض شعر دنوں، ہفتوں یا مہینوں ذہن و قلب پر چھاتے رہتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کوئی ایسا شعر بھی سامنے آجاتا ہے جو برسوں پیچھا نہیں چھوڑتا۔ مولانا کا یہ شعر (جسے شاید وہ معمولی سمجھتے ہوں) میرے نزدیک اسی آخری قسم میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس میں انہوں نے ایسی شراب بھر دی ہے۔ جس کی لذت پئے بغیر نہیں سمجھی جا سکتی ؎

"ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی"

آخر میں مجھے اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے جس طرح چراغ علی، سرسید، شبلی، حالی، ابوالکلام ظفر علی، اقبال وغیرہ مشاہیر سے بہت کچھ سیکھا۔ اسی طرح نیاز صاحب سے بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ میری ہی طرح اور بھی بہت سے خوشہ چین علم و ادب میرے اس اعتراف میں شریک ہوں گے۔ جہاں ان کے مداحوں کا شمار نہیں، وہاں ان سے مختلف قسم کے اختلاف رکھنے والوں کی بھی کوئی حد نہیں۔ میں ان دونوں طبقوں سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا ہوں۔ لیکن میں ایسے اختلاف کو اپنی ذات پر ظلم سمجھتا ہوں جو آنکھوں کی بینائی اور بصیرت کی روشنی سے محروم کر دے۔ یہاں تک کہ کسی کے ہنر بھی عیب دکھائی دینے لگیں۔ بقول سعدی :۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

اگر کوئی شخص فکر سلیم اور ذہن مستقیم رکھتا ہو تو وہ مخالف و موافق دونوں ہی سے بہت کچھ اخذ کر سکتا ہے۔

ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم
تمتع ز ہر گوشۂ یافتم (سعدی)

بلکہ اختلافی تحریروں سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اپنے خیالات کی صحت و سقم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اذہان و افکار کا تنوع سامنے آتا ہے۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان کوئیں کا مینڈک بن کر نہیں رہ جاتا، بلکہ فطری طور پر کائنات کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ بقول شیخ شیراز

تا بدکان خانہ در گرو دی ہر گز اے خام آدمی نشوی!

مولانا نیاز کی بعض دینی تعبیرات سے بنیادی اختلاف کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ بہت سے معاصر مصنفین کی طرح میری حیات ذہنی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ جو لوگ آج ان کی عظمت کے اعتراف میں بخل کرتے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب وہ یا ان کی نئی نسلیں تو اختلافی امور میں مبالغہ آرائی کو ترک کردیں گے۔ اور مولانا کی علمی خدمات کا فراخ دلی سے اعتراف کریں گے۔

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

شکستِ ناروا

"کسی لفظ کا ایک حصّہ ایک رکن میں اور دوسرا حصّہ دوسرے رکن میں آئے تو یہ شکستِ ناروا نہیں ہے۔ یہ تو ہر بحر کی تقطیع میں ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا۔ لیکن بعض بحریں ایسی ہیں جن میں ہر مصرع کے دو ٹکڑے برابر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر مصرع میں کوئی لفظ یا فقرہ ایسا ہے جس کا مفہوم ٹکڑے کئے بغیر ہی پورا ہو سکتا ہے لیکن تقطیع میں اس کے دو ٹکڑے علٰحدہ علٰحدہ ہو جاتے ہیں تو اسے شکستِ ناروا کہیں گے۔ مثلاً اقبال کا مشہور شعر ہے:۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ شعر "کامل مثمن سالم" بحر کا ہے اور چار متفاعلن پر برابر منقسم ہے۔ اس کی تقطیع یوں ہوگی:۔

کبھی اے حقی	قتِ منتظر	نظر آ لبا	سِ مجاز میں
متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن

کہ ہزاروں سج	دے تڑپ رہے	ہیں مری جبی	نِ نیاز میں
متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن

دوسرے مصرع میں "تڑپ رہے ہیں" پورا فقرہ ہے لیکن تقطیع کرنے پر "ہیں" مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں شامل ہو جاتا ہے اور اسی کو شکستِ ناروا کہتے ہیں۔ میر کا شعر ہے:۔

نہ گیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں   نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں

یہ شعر "بحر رمل مثمن مشکول" کا ہے:۔ "فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن" پہلے مصرع میں "زلفِ سیہ" ایک مکمل فقرہ ہے لیکن تقطیع میں زلف مصرع کے پہلے ٹکڑے میں چلا جاتا ہے اور یہ شکستِ ناروا ہے۔

نہ گیا خیالِ زلفِ	سیہ جفا شعاراں
فعلات فاعلاتن	فعلات فاعلاتن

اسی طرح بحر متقارب مثمن سالم کو دیکھئے جس میں فعولن چار بار یعنی مصرع کے ہر ٹکڑے میں دو بار آتا ہے۔ اسی بحر کا ایک مصرع ہے:۔

چو روئے تو تابندہ اختر نباشد

اس کی تقطیع یوں ہوگی:۔

چو روئے تو تابن	دہ اختر نباشد
فعولن فعولن	فعولن فعولن

(نیاز)



حضرت نیاز اپنے ایک مخلص دوست
جناب مجیب احمد انصاری کے ساتھ



جناب فرمان فتحپوری مرتب نیاز نمبر
معاون مدیر نگار پاکستان
←

سمندر کے کنارے



حضرت نیاز اپنے عزیزوں کے درمیان



مدرسہ اسلامیہ فتحپور کی مسجد جہاں
حضرت نیاز نے درس نظامی عربی کی تکمیل کی

نیاز فتحپوری — ایک مردِ آہن

نسیم انہونوی

جناب نیاز فتحپوری سے میری ملاقات ۱۹۲۶ء میں اس وقت ہوئی تھی جب موصوف کا دفتر نظیر آباد لکھنؤ میں تھا اور میں ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کے ماہنامہ انکشاف کا اڈیٹر تھا۔ یہ ملاقات بھی اسی رسالہ کی طباعت کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ اسی احاطے میں جناب وصل بلگرامی مرحوم کا ایک پریس تھا اور انکشاف اسی میں چھپتا تھا۔ بعد میں اس پریس کو نیاز صاحب نے خرید لیا تھا۔ کیوں خرید لیا تھا۔ میں آج تک نہ سمجھ سکا۔ اس لئے کہ نیاز صاحب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن ایک کاروباری کبھی نہ تھے اور نہ ہیں جبکہ پریس ایک خالص کاروباری مشین کا نام ہے۔

انکشاف کی اشاعت ختم ہوئی تو میں نے حریم کے نام سے ایک ماہنامہ خواتین کے لئے شائع کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں تمام ابتدائی مشورے مجھے نیاز صاحب ہی نے دیئے اور کئی مضامین بھی اس کے لیے موصوف نے لکھے۔ حریم کے دفتر کے لئے اپنے آفس ہی میں ایک میز کی جگہ دی اور اپنی ایک الماری بھی اس کے کاغذات رکھنے کے لئے عنایت فرمائی۔ شکرگزاری کے طور پر میں نیاز صاحب کے پریس کی نگرانی کرتا تھا ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر میں نے اپنا دفتر علیحدہ ایک عمارت میں قائم کیا اس لئے کہ میں نے اخبار سرپنچ بھی شوکت تھانوی کی ادارت میں نکالنا شروع کر دیا تھا۔

میں برابر نیاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا لیکن رفتہ رفتہ کاروبار کی مصروفیتوں نے مجھے ایسا عدیم الفرصت بنا دیا کہ باوجود اس کے کہ نگار آفس میرے آفس سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلہ پر تھا، مہینوں اور کبھی کبھی برسوں موصوف کی خدمت میں حاضری کے لئے وقت نہ نکال پاتا۔ اور ملاقات یا تو گاہے گاہے سرِراہ ہو جاتی یا پھر اگر کبھی کسی ضرورت سے نیاز صاحب خود مجھے بلاتے یا میں اپنی کسی غرض سے موصوف کی خدمت میں پہونچ جاتا، ہو جاتی۔

میں اس مضمون میں نیاز صاحب کی علمی اور ادبی صلاحیتوں پر کسی طرح کی روشنی ڈالنا نہیں چاہتا اس لئے کہ یقیناً میری یہ کوشش چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہوگی۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے

اہل علم یقیناً بہت کچھ لکھیں گے۔ ہاں نیاز صاحب کے کردار کا صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں جس سے میں مثالی طور پر متاثر ہوا تھا۔ اور اس واقعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ نیاز صاحب واقعی ایک مردِ آہن ہیں۔

جب میرا دفتر ترجیم نیاز صاحب ہی کے آفس میں تھا تو میں اکثر موصوف کی چہیتی بیٹی شوکت کو اپنی گود میں لے کر کھلایا کرتا تھا۔ اس لڑکی کو نیاز صاحب شاید دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اس کی شادی ایک ایسے لڑکے سے کی جو انہیں کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا اور اس طرح شادی کے بعد بھی نیاز صاحب کو شوکت کی جدائی کا صدمہ نہ اٹھانا پڑا۔

دن گزرتے رہے۔ شوکت کئی بچوں کی ماں بن گئی تھی اور یہ بچے بھی نیاز صاحب کو بہت عزیز تھے۔ گھر پر شوکت ہی کا اقتدار تھا۔

اچانک ایک روز ۶ بجے شام کو مجھے یہ خبر ملی کہ شوکت کا انتقال ہوگیا ہے میں گھبرایا ہوا نگار آفس پہونچا اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ شوکت کا انتقال نیاز صاحب کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ ہوگا وہ مرحومہ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

تعزیت کے طور پر کیا کہوں گا۔ کون سے الفاظ نیاز فتحپوری جیسے انسان کو سکون بخش سکیں گے۔ سوچتا ہوا میں ان کے کمرۂ نشست میں داخل ہوا۔ چند لوگ اور بھی وہاں موجود تھے۔ کمرہ میں اسی طرح کی خاموشی طاری تھی جیسی موت کے بعد کسی گھر پر طاری ہوتی ہے۔

ایک کرسی پر میں بھی بیٹھ گیا۔ شوکت کو میں نے گود میں کھلایا تھا۔ گو اب برسوں سے میں نے اسے دیکھا بھی نہ تھا لیکن اس کے باوجود ۲۵ سال قبل کی محبت یکسر فنا نہ ہوئی تھی۔ میرا دل بھی اس کی جواں مرگی پر رو رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے کے لئے تیار تھے۔ اور یقیناً میں سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب اگر اس سانحہ کا ذکر فرماتے تو میں زار و قطار رونے لگتا۔ لیکن آپ باور نہ کریں گے کہ ابھی میں اپنے تعزیتی الفاظ کو زبان تک لا بھی نہ سکا تھا کہ نیاز صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے دفتری قادر کو آواز دی۔ اور پھر مجھے مخاطب کرکے انہوں نے کہا۔

"آپ خوب آگئے میں آپ کو بلوانے ہی والا تھا۔ ایک کتاب چھپ رہی ہے اس میں ایک نقشہ ہے کیسے چھپے گا، آپ ہی اس کا انتظام کر دیجئے۔"

قادر آگیا تھا، نیاز صاحب نے اسے اس کتاب کا فائل لانے کا آرڈر دیا۔ فائل آگیا اور موصوف مجھے وہ نقشہ دکھا کر سمجھانے لگے۔

میں اس وقت کی ذہنی حالت کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچوں سمجھ میں نہیں آتا خیال تھا کہ نیاز صاحب مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں گے۔ لیکن نیاز صاحب اس طرح پیش آئے کہ اگر اس خبر کا راوی مستند نہ ہوتا اور تفصیل کے ساتھ تمام باتیں مجھے معلوم نہ ہو چکی ہوتیں تو یقیناً میں اس وقت یہی سمجھتا کہ خبر غلط تھی۔ شوکت زندہ ہے اور خوش ہوتا اس بات پر کہ میں نے تعزیت کے وہ الفاظ ادا نہ کئے تھے جو سوچتا ہوا آیا تھا ـــ لیکن شوکت

واقعی مرچکی تھی اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ نیاز صاحب کے دل کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ ان کی سب سے زیادہ چہیتی نازوں کی پلی بیٹی ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔ مگر وہ قدرت کے اٹل فیصلوں سے واقف تھے وہ سمجھتے تھے جو کچھ ہو چکا ہے، ہو چکا۔ رونے دھونے اور آہ وزاری کرنے سے شوکت زندہ نہ ہو سکتی تھی۔

ایسے مردِ آہن کے سامنے میری زبان کس طرح کھل سکتی تھی کافی دیر تک بیٹھا رہا لیکن تعزیت کے سلسلہ میں کوئی لفظ میری زبان سے ادا نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں واپس آگیا اور تمام رات یہی سوچتا رہا کہ نیاز فتح پوری کے سینہ میں دل ہے یا کوئی پتھر۔ اس شوکت کی موت پر بھی انہوں نے آنسو نہ بہائے جس کی موت نے ان کی زندگی میں بھیانک اندھیرا پیدا کر دیا تھا۔

"انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں کہ جب وہ محو خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت آپ ہی بیدار ہوتی رہتی ہے۔ اس کے قواء بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری حدود آکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکونِ جان" کی منزل سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑتی ہے، قلب و دماغ نشۂ کامیابی و نشاط سے سرشار ہو جاتے ہیں اور آخرکار انسان بھی چونک پڑتا ہے۔ اس کے اعضا بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتی جسم و روح" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اسی کا دوسرا نام دنیائے عمل ہے اسی کو "عالم تگ و دو" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعرانہ زبان میں "شک زمیان رفت و یقین جلوہ کرد" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر تا ایں دم، کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے جس میں قدرت کے اس نظام فطرت کے اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشودکار کا انحصار نہ رہا ہو۔ جواہر فرد اور قوت کا باہمی تعلق، مادّہ کی مختلف صورتیں، ایتھر بلکہ ماورا ایتھر میں عناصر آفرینش کا نواۃ اور برق پاروں کی صورت اختیار کرنا، لطخات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مختلف کروں، سیاروں، چھوٹے چھوٹے ستاروں، چاندوں اور شہاب ثاقب میں تبدیل ہو جانا۔ یہ کیا ہے؟ کیا سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں، کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری نہیں۔ کیا برق پاروں کی گردش ان کا نشاطِ عمل نہیں، کیا آفتاب کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس ابتسام خداوندی کی جھلک موجود نہیں جس کے پرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعتہً جگمگا اٹھتی ہیں۔"

نیاز

نیاز اور حیدر آباد

نظر حیدر آبادی

کہا جاتا ہے کہ آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہ ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقیوں کا دور ہے، آج کا بدبخت اور باخبر انسان اس بات پر نازاں ہے کہ وہ انسان کم اور مشین زیادہ بنتا جا رہا ہے کائنات کی طنابیں ضرور کھنچ گئی ہیں لیکن دلوں کے فاصلے بھی بڑھ گئے ہیں، جامد عقیدوں سے نجات پا کر ہم کسی فولادی مشین کا بے حس پرزہ بن کر رہ گئے ہیں روایات کی قید سے نکلے تو نظریات کے دام میں پھنس کر رہ گئے۔ انسانی تاریخ کا دھارا بدلنے والوں کی نگاہیں اگر انسان کے اس انجام کو دیکھ لیتیں تو شاید ہماری ترقیوں کا رُخ آج کسی اور طرف ہوتا۔ بہر حال جب عقل انسانی نے آسمانوں پر اڑانوں کے خواب دیکھنا شروع کئے تو یہ وہ زمانہ تھا جب میری نسل کے لوگوں کے دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے تھے، اور ہمارے ادب کی دنیا میں نئے اور پرانے کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ اقبال کی شاعری اور ابو الکلام آزاد کی تحریروں نے "نظم" کو فطری تقاضوں سے ہمکنار اور نثر کو تجزیئے اور علمیت کی وسیع بنیاد پر استوار کر دیا تھا۔ جناب نیاز کی شخصیت بھی اسی عہد انقلاب کی ایک نامور اور عظیم شخصیت ہے۔

آج کل کے ادب کُش ماحول میں جب کہ نئی نسل کے لوگ پاگل پن کی حد تک ماضی کو بھلا دینے کی سعیٔ بلیغ فرما رہے ہیں اور نام نہاد جدید سماج کے دل و دماغ سائنس کی ترقی کے لئے علم و ادب کے سارے شاندار سرمائے کو دریا بُرد کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، ناقص طرز کی مغربی تعلیم کی پیدا کردہ مقلدانہ اور مجنونانہ فضا میں اس نکتہ کو کون سمجھائے کہ۔

جس قوم نے تعمیرِ ادب کی نہیں محکم
وہ قوم ہے منجملۂ خاشاکِ پریشاں (علی اختر)

خدا کا شکر ہے کہ علم و ادب سے اس عام بے نیازی کے ماحول میں بھی جناب نیاز کی سی ہمہ گیر اور ہمہ رنگ شخصیت ہم میں موجود ہے اور اس کہن سال لیکن جواں ہمت صاحب طرز انشا پرداز کی تحریروں میں اب بھی وہی آن بان پائی جاتی ہے جس نے نصف صدی پہلے بھی ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جناب نیاز کے شاندار ادبی کارناموں نے جہاں غیر منقسم اقطاع ہند و سندھ کے اور علاقے متاثر ہوئے وہاں جنوبی ہند کے قلب میں آصفی پرچم اڑانے والی مملکت حیدر آباد کے نیم جاگیردارانہ اور نیم ترقی یافتہ ماحول میں بھی جناب نیاز کے قلم نے بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ عام طور سے حیدر آباد کے ادبی حلقے نیاز صاحب کے گرویدہ تو تھے ہی لیکن وہاں سے اُن کی شخصی وابستگی اور ربط و ضبط چند احباب کی وجہ سے تھا۔ جن میں سب سے نمایاں جناب ہوش بلگرامی مرحوم (نواب ہوش یار جنگ) کی شخصیت تھی، جناب نیاز اور ہوش صاحب کے تعلقات بہت قدیم اور برادرانہ تھے یہ ہوش صاحب ہی کی دوستی کی نادر آفرینی تھی کہ جناب نیاز سال دو سال میں ایک بار ضرور حیدر آباد آتے اور ہوش صاحب

ہی کے وہاں ہفتوں قیام فرماتے۔ نیاز صاحب کے دوران قیام میں حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں ایک ہل چل سی مچی رہتی، دعوتیں اور مشاعرے، مشاعرے اور دعوتیں، ان دعوتوں میں نواب معظم جاہ شجیع اور مہاراجہ کشن پرشاد کی دعوتوں سے لے کر ہمارے اپنے گھر کی دعوتیں تک شامل ہیں۔ ہوش صاحب کے گھر پر ایک جمگھٹا سا رہتا، نوجوان ادیبوں کی ٹولیاں وہاں پہنچتیں اور ادبی مباحث اور استفسارات سے نیاز صاحب کا ناک میں دم کر دیتیں لیکن وہ بڑی خندہ پیشانی سے سب کی باتوں کا جواب دیتے اور مطمئن کر دیتے۔ انہیں محفلوں میں میں نے محسوس کیا ہے کہ جناب نیاز بہت کم آمیز اور کم سخن سے بزرگ ہیں، ایسے رنگین عبارت آرا کو میں نے تھوڑا سا خشک بھی پایا، نپے تلے جواب اور پھر چپ کا روزہ۔ ممکن ہے اس طرز تخاطب کی وجہ ہماری خورد سالی ہو اور وہ اپنے مخصوص احباب کے حلقے میں کسی "اور رنگ" میں ہوتے ہوں، ویسے اس "وضع احتیاط" کے باوجود ان کی ذہین اور گہری آنکھوں میں کبھی کبھی شوخیٔ طبع کی جھلکیاں بھی میں نے دیکھی ہیں۔

جناب نیاز کے "نگار" کو ایک دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ "نگار" نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا ہے، ان متعارف ہونے والے لوگوں میں حیدرآباد کے نامور اصحاب کی بڑی تعداد شامل ہے۔ جن میں سے چند کا تذکرہ اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان اصحاب میں سرفہرست میرے والد بزرگوار حضرت علی اختر مرحوم کا اسم گرامی ہے، حضرت علی اختر طبعاً نہایت خاموش اور عزلت پسند انسان تھے۔ محفلوں اور مشاعروں کی ہنگامہ آرائی سے انہیں وحشت ہوتی تھی اور اپنے خاص احباب ہی کو اپنا کلام سناتے تھے اور اشاعت کے لئے بھیجنا تو ان کے بس کا روگ ہی نہ تھا حیدرآباد میں شائع ہونے والے رسائل "تاج" "مکتبہ" "شہاب" وغیرہ میں ان کا کلام کبھی کبھی چھپ جاتا تھا وہ بھی اس طرح کہ ان رسائل کے مدیران زبردستی ان سے اچک لیتے تھے۔ جناب ہوش بلگرامی والد صاحب کے شفیق ترین احباب میں سے تھے اور ان کے کلام کے بڑے قدر دان، چنانچہ انہیں کے توسط سے جناب نیاز سے ان کا تعارف ہوا اور نیاز صاحب بھی اس عزلت نشین شاعر کے قدر دان ہو گئے اور ان کی نظموں کو بڑے اہتمام سے "نگار" میں شائع کرنے لگے۔ "نگار" میں ان کے کلام کا شائع ہونا تھا کہ اس نئی آواز نے ساری ادبی دنیا میں ایک دھوم سی مچا دی اور تھوڑے ہی سے عرصے میں حیدرآباد کا ایک گوشہ گیر گمنام شاعر ہندوستان گیر شہرت کا مالک بن بیٹھا اور اس کا شمار جدید شعرا کی صف اول میں کیا جانے لگا اور اس وقت کے تقریباً تمام مؤقر جرائد میں ان کا کلام شائع ہونے لگا۔ اس زمانے میں جوش صاحب کا قیام بھی حیدرآباد ہی میں تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب ایک نظم نگار کی حیثیت سے جوش صاحب کی شہرت کا آفتاب بھی نصف النہار پر تھا، اگرچہ جوش صاحب والد مرحوم کے خاص احباب میں سے تھے اور ان کے بڑے قدر دان بھی، لیکن اس نئی صورت حال نے جوش صاحب کے انداز راہ و رسم میں ایک خاموش لیکن غیر متوقع تبدیلی سی پیدا کر دی حیدرآباد کے ادبی حلقے دو گروہوں میں بٹ گئے اگرچہ بڑا حلقہ جوش صاحب ہی کا تھا کیونکہ حیدرآباد میں وہ ایک قابل لحاظ عہدے پر بھی فائز تھے اور حیدرآباد میں اس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی ؎

پھول کوئی بے نسیم حیثیت کھلتا نہیں
یاں دکن میں آدمی سے آدمی ملتا نہیں (علی اختر)

بات بڑھتی گئی، پھر سنانے والوں نے سنایا کہ جوش صاحب اپنی نجی محفلوں خصوصاً "عالم سرخوشی" میں اکثر کہا کرتے ہیں کہ "اختر تو میری نظموں کے چربے اتارا کرتے ہیں"۔ اس بات نے والد صاحب جیسے درویش صفت انسان کو بھی ہلا کر رکھ دیا، انہوں نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "جواب" ؎

یہ میرا فیض ہے گن گا رہا ہے اک جہاں تیرا
کہاں میں اور کہاں طفلانہ انداز بیاں تیرا

یہ نظم بھی "نگار" ہی میں شائع ہوئی تھی۔ کچھ عرصے بعد کسی زندہ دل نے جناب نیاز سے دونوں کی شاعری کے بارے میں استفسار کر لیا اور نیاز صاحب نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کر دیا۔ پھر کیا تھا ایک حشر نقد و نظر برپا ہو گیا بہت عرصے کے بعد یہ تضیہ نامرضیہ ختم ہوا اور دلوں کے میل دور ہوئے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم، پروفیسر عبد القادر سروری، نصیر الدین ہاشمی، تمکین کاظمی مرحوم، اور ڈاکٹر محتشر عابدی بھی حیدر آباد سے باہر "نگار" ہی کی وجہ سے جانے پہچانے گئے اور ان میں سے اکثر حضرات کے مضامین زمانۂ طالب علمی ہی سے "نگار" میں شائع ہونے لگے تھے اور نیاز صاحب کی ہمت افزائیوں نے ان میں کام کرنے کی ایک نئی لگن پیدا کر دی تھی۔ نئے شاعروں میں تمکین سرمست، مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، صاحبزادہ میکش مرحوم، اکا وتش حیدر آبادی سلیمان ادیب اور راقم الحروف کا کلام بھی شروع میں "نگار" ہی کے ذریعے حیدر آباد سے باہر متعارف ہوا۔ تمکین سرمست کی غزل کو نیاز صاحب بہت پسند کرتے تھے اور تمکین کے ساتھ ان کے مراسم بھی دوستانہ تھے، افسوس کہ تمکین صاحب نے اب تک اپنا مجموعۂ کلام شائع نہیں کیا ورنہ آنکھوں سے لگانے کی چیز ہوتا۔ حیدر آباد کے افسانہ نگاروں میں ناکارہ، بادشاہ حسینی، ج نقوی صاحب اور مرزا ظفر الحسن کو بھی جناب نیاز کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔

ظفر کے تو سبھی افسانے سب سے پہلے "نگار" ہی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ تو تھا حیدر آباد سے نیاز صاحب کے تعلق کا ایک پہلو اب "دیگر احوال" بھی سنتے چلئے غالباً ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کی بات ہے مہاراجہ کشن پرشاد کو فلم سازی کی سوجھی فلم کی کہانی کے لئے انہوں نے اپنی مثنوی "پریم درپن" کو منتخب کیا۔ اس نظم کو نثر میں اور اس کے بعد فلمی ڈرامے میں منتقل کرنے کا کام بہت دشوار تھا اس کے لئے مہاراجہ کی نظرِ انتخاب جناب نیاز پر پڑی اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ نیاز صاحب نے یہ کام نپٹا بھی لیا تھا اور اس سلسلے میں وہ بمبئی بھی گئے تھے اور غالباً اس فلم کے چند سین بھی فلمائے گئے تھے، پھر اچانک یہ اسکیم ختم کر دی گئی، پتہ نہیں کیوں۔ بمبئی ہی کے دورانِ قیام میں جناب نیاز کی ملاقات اس زمانے کی مشہور ادا کارہ سروپ رانی سے ہوئی تھی۔ پھر کچھ عرصے بعد "نگار" کے صفحات پر سروپ رانی المتخلص بہ نگار کا کلام بھی دیکھنے میں آیا!۔

تقسیم ملک سے پہلے شہر حیدر آباد ادبی جلسوں، مناظروں، مشاعروں اور دعوتوں کا شہر تھا؛ ہر سال کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا رہتا تھا لیکن ۱۹۴۴ء کی اردو کانگرس تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اس سے پہلے حیدر آباد میں کبھی اتنا بڑا ادبی اجتماع نہیں ہوا تھا۔ اس کانگرس کا انتظام ادارۂ ادبیاتِ اردو نے کیا تھا اور ڈاکٹر زور مرحوم اس کے روح رواں تھے، اس میں برصغیر کے تقریباً سبھی قابلِ ذکر ادیب اور شاعر شریک ہوئے تھے۔ اس کانگریس میں جناب نیاز نے بھی شرکت کی تھی اور غالباً کسی ایک اجلاس کی صدارت بھی کی تھی، اس کانگریس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک نشست ترقی پسند مصنفین کے لئے مختص کر دی گئی تھی۔ اسی زمانے میں فراق صاحب کی تالیف "مداوا" کی بڑی دھوم تھی اور ترقی پسند مصنفین کا اس کتاب کے بارے میں عام طور پر یہ خیال تھا کہ یہ حکومت کی ایما، اور سرمائے سے شائع کی گئی ہے۔ "مداوا" میں اور اصحاب کے ساتھ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز کے مضامین بھی شامل تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں جس کی صدارت سید سجاد ظہیر کر رہے

تھے اور یہ دونوں بزرگ بھی تشریف فرما تھے۔ علی سردار جعفری نے اپنی تقریر میں اچانک "مداوا" کا ذکر کرتے ہوئے ان دونوں بزرگوں کو ہدف ملامت بنایا اور بری طرح ان پر برس پڑے خصوصاً جناب نیاز کی ذات ان کے تبرول کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اہل حیدرآباد کے لئے یہ حادثہ بالکل غیر متوقع اور عجیب وغریب تھا اور ان کی روایات تو اضع اور میزبانی کے بالکل خلاف۔ سبھی ہکا بکا رہ گئے۔ جعفری کی تقریر کے بعد یہ دونوں بزرگ اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے اور میزبان اس وقت اور زیادہ پشیمان ہوئے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے معافی مانگنے سے پہلے ہی وہ انہیں معاف کرچکے ہیں۔ ایسی وضع کے لوگ اب کاہے کو دیکھنے میں آئیں گے۔!

نواب صاحب چھتاری کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں جناب ہوش بلگرامی کی تحریک پر نیاز صاحب کو مستقل طور پر حیدرآباد بلانے کی کوشش کی گئی۔ تجویز یہ تھی کہ انہیں ناظم معلومات عامہ کے عہدے پر فائز کیا جائے۔ یہ خبر جیسے ہی عام ہوئی حیدرآباد کے رجعت پسند طبقے میں کھلبلی سی مچ گئی اور اس طبقے کے چند رہنما "نگار" کے فائل بغلوں میں دبائے رام جلسوں میں آنے لگے اور "مذہب خطرے میں ہے" کی گھنٹی بجنے لگی۔ ان جلسوں کے جواب میں نیاز صاحب کے نیازمندوں اور قدر دانوں نے بھی جلسے منعقد کئے نتیجہ یہ نکلا کہ خود نیاز صاحب نے اس ہنگامے میں وہاں آنا گوارا نہ کیا، اور اس طرح جہاں ان کو اپنی بیباک نگاری اور اجتہاد کا یہ صلا ملا وہاں اہل حیدرآباد بھی ایک ادیب جلیل سے استفادہ کے حق سے محروم ہو گئے۔ بعد میں اس عہدے پر قاضی عبدالغفار مرحوم کو مامور کردیا گیا تھا۔

حیدرآباد کی مٹی بڑی سوندھی ہے جس نے ایک بار وہاں قدم رکھا وہ اس کی جاں بخش خوشبو کی لپٹوں کو کبھی فراموش نہ کرسکا۔ جناب نیاز بھی انھیں بزرگوں میں سے ہیں جن کے اہل حیدرآباد سے تعلق خاطر میں وہاں کے عروج وزوال سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی لئے ہم انھیں بڑے خلوص و احترام سے سلام کرتے ہیں، خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے۔

ایک سگ پرست فلسفی

یہ فلسفی جس کا نام دیوجانس کلبی تھا، حضرت مسیح سے چار سو تیرہ سال قبل صوبہ مبلسٹ (یونان) کے شہر سینوب میں پیدا ہوا اس کا باپ اسکیوس صرافی کیا کرتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی کھوٹے روپے بھی چلاتا تھا، اس لئے گرفتار کرلیا گیا اور قید ہونے کے بعد حالت قید ہی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ باپ کے مرنے کے بعد دیوجانس وہاں سے بھاگ کر ایتھنز چلا آیا اور یہیں رہنے لگا۔ یہاں اس کی حالت نہایت حقیر و ذلیل فقیروں کی طرح تھی، شہر کے اندر لکڑی لیکر ننگے پاؤں پھرتا اور پیٹھ پر ایک گٹھری رکھ کر سارے شہر کا گشت لگانا اس کا روز کا معمول تھا جس پر لوگ ہنستے اور مذاق اڑاتے تھے، خاص کر اس کی داڑھی تو لوگوں کے لئے کشت زعفران کی حیثیت رکھتی تھی اور ان کی تضحیک اس پر صرف ہوا کرتی تھی۔

ان باتوں سے دیوجانس تمام باشندگان شہر کے لئے مسخرہ بن گیا تھا، لیکن بایں ہمہ اس نے فلسفہ ادبیہ کی اشاعت شروع کردی اور اس مسئلہ میں وہ بالکل "انستھنیز" کی تقلید کرنے لگا۔ یہ حالت اس کی دن بدن بڑھتی رہی اور نہایت استقلال کے ساتھ وہ نشر فضائل اور اشاعت علم میں مصروف ہوگیا اور اس قدر مصروف ہوا کہ اس کی اس علمی زندگی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا۔"

(نیاز)

نیاز اور نژادِ نو

رئیس امروہوی

جناب نیاز فتح پوری اپنی معاصر فکر پر جس شدت سے اثر انداز ہوئے ہیں اور حال و مستقبل کی رفتارِ خیال کو متعین کرنے میں ان کے قلم نے جو حصّہ لیا ہے۔ ان سوالات کا جواب دینا اور جواب پانا یوں سرسری طور پہ ممکن نہیں جب تک نیاز صاحب کی صحافت سے لیکر نیاز صاحب کے ادب اور علمی تحقیقات سے لیکر ان کے فکری اجتہادات تک علم و نظر کے تمام گوشوں کا جائزہ نہ لیا جائے نیاز صاحب کی موثر و متحرک ادبی و تخلیقی شخصیت کی پیمائشِ قد اور فکر و نظر کے اس قدِ بالا کی تاثر آفرینی کا اندازہ ممکن نہیں۔ میں صرف اپنا تاثر پیش کر سکتا ہوں۔ بلاشبہ میری فکر اور ذہنی تشکیل میں نیاز اور نگار۔ دونوں کو ہمیشہ متحرک عامل اور موثر محرک کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بالکل ابتدا ہی میں اُن کے عقلیت پسندانہ علمی و تحقیقی رجحان اور سجے سجائے اسلوب بیان نے مجھے مسحور کر لیا تھا۔ یہ سحر آج تک قائم ہے۔ یہ نشہ ابھی تک نہیں اترا۔ ان کے تفکر کا اجتہاد ایک ایسی روشنی تھی جو ہمیشہ ادب و صحافت کی دنیا میں میرے آگے آگے چلتی رہی ہے۔ ان کے علم و ادب یا ان کی علمی و ادبی کاوشوں سے بعض حضرات نے منفی اثرات قبول کئے بعض نے مثبت۔ بہرحال متاثر دونوں گروہ ہوئے نکتہ چینوں کا گروہ بھی خوشہ چینوں کا قبیلہ بھی۔ یہ تاثر آج بھی مختلف گوشوں میں مختلف انداز سے قائم اور جاری ہے۔ نیاز صاحب بغیر کسی قصد اور ارادے کے زندگی بھر اپنے علم و ادب کے ذریعے ایک پیام بنے رہے ہیں ایک پیام دیتے رہے ہیں۔ روایات کی کھلی ہوئی ہوا میں سانس لینے کا پیام۔ اور علم و تحقیق کے اجنبی گوشوں میں دلیرانہ قدم اٹھانے کا پیام۔ ان کے سوچنے۔ لکھنے اور پرکھنے کا ہر ڈھنگ اجتہادِ فکر کا علم بردار ہے۔ اس اجتہادِ فکر کی تقلید ہر اس شخص کو۔ کرنی پڑے گی جو علم و تحقیق کی سنگین حقیقتوں سے بچنا نہیں ٹکرانا چاہتا ہے۔ سر پھوڑنے کا خواہش مند ہے۔ یقیناً اس عہد کے قلم کاروں اور نئی نسل کے دانشوروں کے لئے بھی نیاز صاحب کی تحقیقی و تخلیقی اور ادبی و علمی شخصیت میں اک پیام موجود ہے کیا ہے یہ پیام۔ ؟۔ اجازت دیجئے کہ اسے نثر کے بجائے نظم میں پیش کروں میرے لئے یہی پیرایۂ بیان موزوں ہے بھی۔ البتہ یہ خوف دامن گیر ہے کہ اس منظوم پیام کو پڑھ کر (جو انہیں کی ادبی تخلیقات اور علمی تحقیقات گو میرے اپنے الفاظ و اسالیب میں منظوم ہے) نیاز صاحب خفا نہ ہو جائیں کہ اس شخص نے "پیام بری" کے فرائض صحیح طور پر ادا نہیں کئے۔ یہ خطرہ لاحق حال سہی۔ تاہم کیا گونا گوں خطرات کا مقابلہ کرنے کی دعوت خود جناب نیاز کے پیام علم و تفکر میں مضمر نہیں؟ ہے تو پھر میں اس خطرے سے کیوں ڈروں کہ مجھ سے نئی نسل کے قلم کاروں کے سامنے نیاز کا پیام اور ان کا ادبی و اجتہادی نقطۂ نظر پیش کرنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی۔

یہ منظوم پیام ذیل میں درج ہے :۔

ہم دمو - ہم نواؤ - ہم کارو!
اے نئے عہد کے قلم کارو!

اے نئے قافلوں کے ہم سفرو! — اے نئی زندگی کے راہ برو!
نئی محفل کے بزم آراؤ — نئی دنیا کے کوہ پیماؤ!
تازہ گفتار و تازہ کار ہو تم — زندگی کی نئی بہار ہو تم
عہدِ نو کا ہر اولی دستہ — تم ہر اک راہ میں کمر بستہ
آخرِ شب کی نرم سیر ہوا — تم سحر خیز طائروں کی نوا
وقت کا جلوۂ جہاں افروز — تم حیاتِ جدید کا نوروز
تم ہو پاکیزہ و شگفتہ و صاف — پہلی بارش کا قطرۂ شفاف
صبحِ نو کی شعاعِ پیشینہ! — تم ہو فرداوِ دے کا آئینہ
زندگی کا دماغ وقت کا دِل — تم جبینِ عروسِ مستقبل
ثمرِ بیش رس برنگِ قبول — شاخِ عصرِ رواں کا پہلا پھول

نازپروردگانِ لوح و قلم!
تم سے تخلیق و ارتقا کا بھرم

اے کشایندگانِ پردۂ جاں! — اے نمایندگانِ فکرِ جواں!
جانفزا خامشی کا گیت سہی — آج کچھ تم سے بات چیت سہی

تم نے سوچا برادرانِ عزیز!
شعر کیا شے ہے؛ زندگی کیا چیز!

اصلِ اندیشہ و سخن کیا ہے؟ — اہلِ فن کس لئے ہیں؟ فن کیا ہے؟

ہم کہ ہیں آب و خاک آتش و باد　　کیوں ازل گیر کیوں ابد بنیاد؟
ہم میں با وصفِ قیدِ و جہت　　کیوں ہے یہ لامکانیت کی صفت؟
ہم میں یہ ماورائے نقش و نگار　　کیوں ہے اک حسن سرمدی کا نکھار؟
کس زمان و مکاں سے آئی ہے؟　　زندگی خود کہاں سے آئی ہے؟
جسم و جاں میں یہ ہجر و وصل ہے کیا؟　　خود زمان و مکاں اصل ہے کیا
صورتِ نشو و ارتقا کیا ہے؟　　روح آدم کی انتہا کیا ہے؟
ہم کہ زندانیٔ سنین و شہور　　ہم میں کیوں لانہایتی کا شعور؟
موت اگر زندگی کا وقفہ ہے　　پھر یہ اندیشۂ اجل کیا ہے؟
جب شمار نفس ہے نفسِ حیات　　کیوں گمانِ حیات بعدِ ممات؟
ایک سے بڑھ کے ایک ہے یا ایک　　مختلف ہے کہ اصلِ اشیا ایک؟
اور پھر یہ لطیفہ ہائے جمال　　خوبی و خیر و صدق و حسن و کمال
دلبری کیوں ہے دلربا کیا ہے　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
عاشقی کس بلا کو کہتے ہیں　　حسن کس کس ادا کو کہتے ہیں؟
کیا ہے آرامِ جان و لذتِ تن　　نقشۂ قامت و نقوشِ بدن
خالِ مشکین و خدِ نورانی　　شکنِ زلف و چینِ پیشانی
کیوں یہ نظارۂ و نظر کا فسوں　　لبِ گل رنگ و چہرۂ گل گوں
دست و داماں میں کیا تعلق ہے؟　　جان و جاناں میں کیا تعلق ہے؟
کیا ہے سرمایۂ سکوت و سخن؟　　لطفِ فن کاری و لطافتِ فن
عالم سرخوشی و خوش باشی　　نغمہ و شعر و رقص و نقاشی

کیوں یہ آخر "انا" کی خودنگری   ذوقِ تزئین و شوقِ جلوہ گری
حُسن کے شعبدوں سے قطعِ نظر
کیا ہے خود سرگزشتِ نوعِ بشر؟
کیوں یہ انسانیت کا اوج و زوال   کیوں یہ تہذیب کا ہبوط و کمال
مختلف دور مختلف انساں   مصر و یونان و بابل و کنعاں
کبھی انجام اور کبھی آغاز   کیوں یہ تہذیب کا نشیب و فراز؟
کارفرما سماج میں اضداد   کیوں یہ آخر معاشرے میں فساد
کیا ہے قوموں کی اصل رگِ حیات   کیوں ثقافت کے تہ بہ تہ طبقات؟
نئی تخلیقِ فکر و فن ہر آن   فلسفہ۔ شعر۔ تجربہ۔ وجدان
اے نئی زندگی کے معمارو!   اے نئی نسل کے قلم کارو!
تم کہ فکرِ جدید کے فرزند   فکرِ نو کے سوال ہیں یہی چند
آج موضوعِ فکر و فن ہے یہی
یہی سرمایۂ سخن ہے یہی

نگار اور اس کی روایات

سید ابوالخیر کشفی

آج کے بیشتر اردو رسالوں کی یہ کیفیت ہے کہ اگر آپ ایک کا سرورق دوسرے پر لگا دیں تو شاید پڑھنے والوں کو کسی تبدیلی کا احساس نہ ہوگا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کی طرح ہمارے رسالے بھی "فارمولا" کے مارے ہوئے ہیں۔ چند مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے جمع کر لیے، لیجئے رسالہ تیار ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب اگر کتابت کے مرحلے طے کرنے کے بعد اپنے آپ کو ادیب بھی سمجھتے ہیں تو ایک صفحہ کا اداریہ بھی لکھ دیا اور اس تیور کے ساتھ جیسے یہ ایک صفحہ مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کا جواب ہے۔ اُس ایک صفحہ میں کسی کرکٹ ٹسٹ میچ کا تذکرہ ہوگا یا اپنے قیام مری کی تفصیلات، یا اس بات کا اظہار کہ "میں فرسٹ کلاس ریلوے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں" وغیرہ وغیرہ۔ ہاں ادب کا کہیں ذکر نہ ہوگا۔ دوسرا رجحان رسالوں میں ادبی فیل پا کا ہے۔ بعض لوگ ایسے نمبر نکالتے ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ مواد سے نہیں بلکہ وزن سے ہوتا ہے۔ صاحب یہ میرا کارنامہ ہے کہ "میں نے چھ سیر کا نمبر نکال دیا"

جس صدی میں اردو کی ادبی صحافت پر یہ بُرا وقت پڑا ہے کہ یوں دعا مانگنے کو جی چاہتا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے
پرچوں پہ ترے آکے عجب وقت پڑا ہے

اسی صدی کی پہلی تین چار دہائیوں میں اردو کی ادبی و علمی صحافت نے ان بلندیوں کو اپنے قدموں کی زمین بنا دیا تھا جو ہمیں آج آسمان کی طرح دور نظر آتی ہیں ــــ بہت دور ــــ

اردو کی ادبی صحافت نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ وسعت اور قوت حاصل کر لی تھی جس نے ہمارے ذہنی افق کو نئے فکری ستاروں سے جگمگا دیا، زندگی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا، ادب کے نئے تصورات سے ہمیں آگاہ کیا۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق سے یہ سفر شروع ہوا۔ بیسویں صدی میں اگر ایک طرف الہلال، البلاغ اور ہمدرد جیسے اخبارات نے تحریکِ آزادی کو آگے بڑھایا تو دوسری طرف مخزن، تمدن، الناظر، نقاد، معارف، زمانہ، ادیب، نیرنگ خیال، جامعہ، ادبی دنیا، نگار اور ساقی جیسے رسالوں نے ہمارے ادب کی آبیاری کی۔ ان رسالوں میں (سوائے ایک رسالہ کے) مشترک بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ ان کے ایڈیٹر خود بھی اہم ادیب اور اہلِ قلم تھے اسی لئے وہ اپنے رسالوں کی حد بندی کرنے اور مقاصد کے تعین میں کامیاب ہوئے۔ معارف نے ادب کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ کو جلا دی۔ مخزن نے جدید شاعری کے رجحانات کو فروغ دیا، نقاد نے ادب کی لطافت کو اپنایا۔ ادیب اور نیرنگ خیال نے ادبی رسالوں کو حسن کے ایک نئے معیار کا حامل بنا دیا۔ تصاویر کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا اور سالناموں اور خاص نمبروں کی روایت کی بنیاد رکھی۔ زمانہ نے اردو میں افسانہ کے فن کو اس کے ابتدائی مرحلوں میں استحکام عطا کیا اور سیاست کو شجرِ ممنوعہ نہ جانا۔ ایسی ہی انفرادی خصوصیات

دور کے دوسرے رسالے بھی رکھتے تھے۔

اردو رسالوں کے اُس تابناک عہد میں نیاز فتحپوری نے نگار جاری کیا۔ نگار کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے شائع ہوا۔ یہ وہ دور تھا جس کے ساتھ ان رسالوں میں سے بیشتر کے نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں جن کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ رسالہ ادیب الٰہ آباد کی تاریخ آغاز جنوری ۱۹۱۰ء ہے۔ اس رسالہ کو نوبت رائے نظر اور شاکر میرٹھی جیسے ایڈیٹر نصیب ہوئے۔ پہلے شمارہ کے لکھنے والوں میں چکبست، سرور جہاں آبادی، منوہر لال زتشی، اکبر الٰہ آبادی، علی حیدر نظم طباطبائی، محشر لکھنوی اور نادر کاکوروی جیسے اکابر شامل تھے۔ پہلے چھ شماروں میں "۳۴ سادہ و رنگین پورے سائز کی ہاف ٹون تصاویر پیش کی گئیں۔ رسالہ تمدن دہلی کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر راشد الخیری اور شیخ اکرام تھے۔ پہلے شمارہ کے لکھنے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد، شوق قدوائی، علامہ اقبال، عزیز لکھنوی، سید احمد دہلوی اور شاد عظیم آبادی شامل تھے۔ تمدن میں بھی تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ نگار کے ہم عصروں میں سب سے اہم رسالہ "اردو" ہے جس کی تاریخ کا دامن مولوی عبدالحق کی عظمت سے بندھا ہوا ہے۔ اردو کا سال اجرا ۱۹۲۱ء ہے۔

ان چند رسالوں کی کسی قدر تفصیل میں نے اس لئے پیش کی ہے کہ ہم اس دور کی ادبی صحافت کی روایت کو کسی قدر سمجھ سکیں اور اس فضا میں سانس لے سکیں۔ نیاز نے اردو رسالوں کے اس تابناک دور اجتماع میں نگار جاری کیا۔ اس لئے نہیں کہ اردو جرائد میں ایک اور جریدہ کا اضافہ ہو جائے بلکہ اس لئے کہ نیاز کے ذہن میں اردو کی ادبی صحافت کے لئے چند ایسے تصورات و خیالات تھے جنہیں وہ لباسِ مجاز میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وہ جذبہ مسحر کہ تھا جس نے نگار کو ہمارے ادب کی ایک روایت بنا دیا اور آج ہم نگار کو ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک ادارہ، ایک تحریک سمجھتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نگار اپنے نئے وطن میں ایک تحریک کا درجہ حاصل کرتا ہے یا نہیں — یہ ہجرت نگار کی زندگی کی پہلی ہجرت نہیں ہے — نگار، بھوپال سے لکھنؤ منتقل ہوا تھا اور آب و ہوا کی اس تبدیلی نے اس نوخیز تحریک کی نشوونما کو متاثر نہیں کیا تھا۔ یقین ہے کہ بلوغ کے بعد ہجرتِ تازہ، نگار میں نئی وسعت پیدا کرے گی۔

میرے اس مضمون کا مقصد اُن افکار و تصورات کی نشان دہی ہے جنہوں نے نگار کو جنم دیا، اُسے قوت عطا کی اور ایک تحریک کا درجہ دیا لیکن ۴۱ سال لمبے اس سفر پر نکلنے سے پہلے نگار کے شیرازہ بند، خالق اور نقاش کے بارے میں کچھ اشارے مناسب ہوں گے ویسے میں نیاز کی ادبی شخصیت پر کوئی طویل مقالہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا — آپ مطمئن رہیں — میں فی الوقت اُن کی ادبی شخصیت سے صرف "نگار" کی حد تک دلچسپی رکھتا ہوں۔

نگار کا اجرا ادب کی دنیا میں نیاز کے لئے شہرت طلبی کا بہانہ نہ تھا۔ وہ ۱۹۲۰ء تک ادب میں اپنی اہمیت کا احساس سب کو دلا چکے تھے۔ تمدن ہو یا ادیب، نقاد ہو یا زمانہ — ان رسائل میں نیاز کی شمولیت عزت کی بات سمجھی جاتی تھی "شہاب کی سرگزشت" اور "شاعر کا انجام" یہ دونوں تحریریں نیاز کے اسلوبِ خاص کا نقش ثبت کر چکی تھیں — نثر کے ساتھ ساتھ اردو نظم کے اس تشکیلی دور میں نیاز کی نظمیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ ادبی افکار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہبی اور علمی تبحر کا اظہار بھی کر چکے تھے نیاز ایک طرف عربی زبان کی گہرائیوں سے آگاہ تھے۔ اور دوسری طرف فارسی ادب کی لطافتیں اُن کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھیں۔ انگریزی میں ادبیات و فنون کے مطالعے سے وہ نئے افق تلاش کرنے کے اہل بن چکے تھے — ان کی فکر اور مطالعہ ایک مستقل مرکز کی تلاش میں تھا اور نیاز نے اس مرکز کی تخلیق "نگار" کی صورت میں کی۔ عزیز احمد نے نیاز پر ٹیگور یت کے طرزِ مہمل کے فروغ کا الزام لگایا ہے لیکن وہ نیاز کے ارتقائے ذہنی سے افسوس ناک حد تک بے خبر ہیں۔ نیاز نے نگار کے دور اول ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ طرزِ ٹیگور میں ایک سطر بھی شائع نہ کی جائے گی۔ اگر اس میں کوئی خاص بات نہ ہو۔ ادب کی دنیا میں ایسے کتنے ہی اسالیب ملتے ہیں جنہوں نے اپنے خالقوں

اور درجۂ اول کے فن کاروں کو بقاءعطا کر دی۔ لیکن جب ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے اس کی تقلید کی تو صرف خوف ریزے ہاتھ آئے ——— لیکن کیا اس کے لئے اُن فن کاروں کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے؟ ——— میرا جواب نفی میں ہے ——— اور اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو پہلے غالبؔ اور اقبالؔ کو مجرم قرار دیجیے جن کی تقلید ان لوگوں نے سطحی انداز میں کی جو غالبؔ و اقبالؔ کی فنی عظمت، ذہنی پس منظر اور علمی پیش منظر سے محروم تھے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نیازؔ کی شخصیت میں ایسی دل آویزی رہی ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی "تنہا" نہیں رہے (ادب کی حد تک) ——— نگار کی زندگی کے ہر مرحلہ میں اہم اور ابھرتے ہوئے فن کار نیازؔ کے رفیق رہے ہیں ——— ان میں سے کئی حضرات کی شہرتیں نیازؔ اور نگار کی مرہونِ منت ہیں ——— یہ سلسلہ مخمورؔ اکبر آبادی سے فرمانؔ فتحپوری تک پھیلا ہوا ہے۔ ابھرتے ہوئے فن کاروں کی زندگی پر نیازؔ کا گہرا اثر پڑا ہے۔ نیازؔ نے کسی کو اپنے طور پر سوچنے پر مجبور نہیں کیا لیکن ان موضوعات کی ہمیشہ نشان دہی کی جن پر قلم اٹھانے سے ایک طرف تو ہمارا ادب روداد بنا اور دوسری طرف لکھنے والوں نے درجۂ اعتبار حاصل کیا۔ ہماری ادبی تاریخ کی ہر کمی اور خلا پہ نیازؔ کی نظر ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو REVALUATION کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اردو کے ایسے نقاد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جنہوں نے ادبی اقدار اور ادبا و شعرا کے مراتب کا از سرِ نو تعین کیا ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی، مصحفیؔ اور مومنؔ کو آج جو مرتبہ حاصل ہے اس کا ایک سبب نیازؔ کی ذات اور نگار بھی ہے۔

تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ نیازؔ نے اپنے دور کی ادبی تبدیلیوں کا ساتھ دیا ہے۔ ادبی ابنائے وقت کی طرح نہیں بلکہ ایک جیتے جاگتے انسان اور ادیب کی طرح۔ ہم میں سے بیشتر لوگ چالیس سال کی عمر کے بعد "ماضی" میں رہتے ہیں۔ جیتے جی وہ مر جاتے ہیں لیکن ایسی "موت" سے نیازؔ کی ذات بلند تر ہے۔ ادبِ لطیف سے ادب کے سماجی کردار کی تفہیم تک نیازؔ ہر مقامِ شوق سے آسان گزرے ہیں۔ وہ اپنے تصورات کے اسیر کبھی نہیں رہے۔ انہوں نے ادبی فضا میں خلاقانہ انداز میں سانس لی ہے اور ہر مرحلہ پر اپنی زندگی کا ثبوت دیا ہے ———

ان چند معروضات کے بعد اب ہم نگار کے ذریعہ نگار کی روایت کو سمجھنے کی مہم پر نکلتے ہیں۔ آج کے نگار سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اسی لئے شاید ہمارا مطالعہ نگار کی ابتدائی فائلوں کی مدد سے مکمل ہو جائے گا۔ ویسے دبی زبان سے یہ عرض کردوں کہ میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اُس سے نگار کی روایت کا ایک خاکہ مرتب ہو جاتا ہے۔ آیئے اب اِس خاکے میں رنگ آمیزی کریں۔

اِس سفر میں کتنے لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ ایسے لوگ جو بہت دُور چلے گئے لیکن جن کی یاد ایک شیریں خلش کی طرح باقی ہے۔ ایسے لوگ جو ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن خود ایک ادبی روایت بن چکے ہیں ——— ایسے لوگ جن کا تخلیقی سفر جاری ہے ——— اور ایسے لوگ جنہوں نے ادب پہ کوئلہ کی دلالی کو ترجیح دے کر اپنے سفر کا رُخ بدل دیا۔

——— (۲) ———

نگار کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے شائع ہوا۔ اگرچہ اس کا تجارتی شعبہ آگرہ میں تھا۔ اِس ماہ کے انتخاب کو میں محض اتفاق نہیں سمجھتا ——— میرا خیال ہے کہ جنوری کی جگہ فروری کو نقطۂ آغاز قرار دے کر نیازؔ نے نگار کو غالبؔ کی معنوی یادگار بنایا ہے۔

نیازؔ نے پہلے شمارہ میں اپنے اغراض و مقاصد کی کوئی فہرست نہیں دی۔ یہ ہے ان کا اعتمادِ ذات۔ وہ پڑھنے والوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ قارئین رسالہ کے مندرجات کی روشنی میں اغراض و مقاصد کا خود تعین کریں ———

نیاز نے اگرچہ دو تین سال بعد ہی اپنے آپ کو بڑی حد تک تنہا پایا، کیونکہ بعض ابتدائی سال ایسے بھی گزرے جن میں آدھے سے زیادہ مضامین خود نیاز کو لکھنے پڑے تاکہ نگار کی خصوصیات قائم رہیں ـــ لیکن پہلے شمارے میں انہوں نے "عناصر نگار" کا تذکرہ بڑے خلوص سے کیا ہے۔ یہ عناصر تھے ل۔احمد، ضیا عباس ہاشمی، امام الدین اکبرآبادی اور محمود اکبرآبادی۔

"نگار کے اجراء و اشاعت کا خیال سب سے پہلے جس کے دماغ میں سوئے زن ہوا، وہ میرے نہایت عزیز دوست لطیف اکبرآبادی ہیں۔"

"ضیائی (ضیا عباس ہاشمی) کی سلامتِ ذوق اور صحتِ مذاق کے متعلق گفتگو کرنا بے کار ہے۔"

نیاز نے امام الدین اکبرآبادی کی "محبت، خلوص اور پرسکون آمادگی" اور محمود کی "محویت" کا بڑے لطیف انداز میں ذکر کیا۔

پہلے شمارہ میں نیاز نے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اپنے اغراض و مقاصد کی کوئی فہرست پیش نہیں کی، لیکن چند اہم اشارے ضرور ملتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ "وہی شخص جو کل صرف قصص و حکایات سے آسودہ ہو جاتا تھا، آج زیادہ کارآمد لٹریچر کا خواہش مند ہو سکتا ہے"۔ اس کا بنیادی سبب زمانے کے رجحانات کے ساتھ ذوقِ ادب کی تبدیلی ہے اور اسی تبدیلی نے عہد حاضر کے "مذاق" کو زیادہ "وزنی" بنا دیا ـــ دوسرا اہم اشارہ یہ ہے کہ ادبیت کے ساتھ فنونِ لطیفہ، تاریخ، مذہب، علوم و فنون اور سیاست ـــ ان میں سے کوئی موضوع "حلقۂ بیرونِ در" نہیں رہے گا۔ مغرب میں اُس عہد (۲۲ء) میں بھی کتنے ہی رسالے مختلف شعبوں اور علوم و فنون کے لئے مخصوص تھے، لیکن اردو صحافت میں یہ صورتِ حال نہ تھی، اس لئے نیاز نے نگار کو تمام مضامین و موضوعات کا اُفق بنانے کو اپنا مقصد قرار دیا ـــ انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں اعلان کیا

"نگار کو خالص ادبی رسالہ تو نہ بننے دوں گا"

اور یہ اعلان اس شخص نے کیا، جو اپنی گذشتہ زندگی کی چاندنی راتیں، "ادب کے سوز و گداز" کے حضور نذرانہ کے طور پر پیش کر چکا تھا۔ نگار کے پہلے شمارہ کے لکھنے والوں میں ل۔احمد، ضیائی، محمود، پوردا ؤد، نیاز جانشی اور امتیاز علی تاج شامل تھے۔ لیکن کئی ایسے مضامین خود نیاز نے لکھے جن کی وجہ سے "نگار" "خالص ادبی رسالوں" کی حلقہ بندی کو توڑ سکا ہے۔

ملاحظات کا سلسلہ اپریل ۲۲ء سے شروع ہوا۔ مارچ کے شمارے میں پہلا مضمون فوضویت (انارکزم ہے)۔ اس اصطلاح پر رسالہ اردو نے تنقید بھی کی تھی ـــ اور نیاز نے بعد میں اس کی ثقالت کو تسلیم کر لیا تھا۔

۱۹۲۲ء کے ملاحظات کے چند اقتباسات سے نگار کی روش اور رجحانات کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"میں ہمیشہ کے لئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اِس رنگ (ٹگوریت) کا کوئی ادبی مضمون شایع نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں کوئی خاص ندرت نہ پیدا کی جائے" (اپریل)

یہ اقتباس نیاز کے ادبی سفر کو سمجھنے کے لئے نشانِ راہ کا درجہ رکھتا ہے اور اس نشانِ راہ کو دیکھے بغیر عزیز احمد نے "ترقی پسند ادب" میں نیاز کے بارے میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

اردو افسانہ کے فروغ میں "زمانہ" اور اس کے بعد "ساقی" کی خدمات نگار سے زیادہ وسیع ہیں۔ لیکن نگار کے ابتدائی دور میں مجنوں گورکھپوری، ل۔احمد اور نیاز کے افسانوں نے اردو افسانہ نگاری کے بعض نہایت اہم پہلوؤں کو مستحکم اور روشن کیا ـــ پریم چند اور ان کے اسکول کی عظمت مجھے تسلیم ہے، لیکن اردو افسانہ میں وہ فلسفیانہ گہرائی (کہیں کہیں غیبت پرستی اور روحانیت بھی) نیاز اور مجنوں ہی نے پیدا کی ہے، جس کی تکمیل پروفیسر احمد علی نے کی، نیاز نے نگار کے ذریعہ ہر اس کوشش اور تحریک کو سراہا ہے جس کا مقصد افسانہ اور ڈرامہ کا فروغ تھا۔

جون ۱۹۲۲ء کے ملاحظات میں ہزار داستان کا خیر مقدم کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

"ہمیں یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی کہ حکیم احمد شجاع (بی-اے) جو افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کا خاص ذوق رکھتے ہیں، ایک رسالہ "ہزار داستان" لاہور سے جاری کر رہے ہیں جس کا تنہا مقصود مختصر افسانہ نویسی کو رواج دینا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ سرزمینِ لاہور نے جس قدر خدمت اردو ادب کی انجام دی ہے وہ ہمارے لئے باعث صد تشکر ہے۔"

یہ اقتباس اس حقیقت کا شاہد ہے کہ یوپی والوں میں سب سے پہلے غالباً نیاز ہی نے "لاہور" کو اردو ادب کا جدید مرکز تسلیم کیا علاوہ ازیں وہ افسانہ کے رواج کو ادب کی اہم خدمت تصور کرتے ہیں۔ نگار کو انہوں نے ادب و علوم کا سنگم بنایا، مگر ادبی صحافت کی ترقی کے لئے انہوں نے ہر دور میں اس بات کی اہمیت تسلیم کی کہ اردو میں مختلف اصناف سے متعلق جداگانہ رسالے ہوں۔

۱۹۲۲ء میں ہی نگار کے وہ بعض خاص سلسلے شروع ہو چکے تھے، جو اس کی امتیازی خصوصیات رہے ہیں مثلاً ملاحظات، استفسار و جواب، معلومات وغیرہ ــــ لیکن ملاحظات کے دامن میں پہلی بار وسعت دسمبر ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے نیاز نے ملاحظات کو صرف "احوال نگار" تک محدود رکھا۔ دسمبر کے ملاحظات سے انہوں نے اہم مسائل پر قلم اٹھانا شروع کیا اور اس کا آغاز "ارتقائے تمدن" اور "ہیئتِ اجتماعی کی حقیقی روح" سے ہوا۔ نگار کے سالِ اول میں اگر کوئی حصہ تشنہ معلوم ہوتا ہے تو وہ "انتقاد" کا ہے یعنی کتابوں کے تبصرہ کا نیاز نے اکثر تبصرے روایتی انداز میں کئے ہیں۔ بعد میں ان تبصروں میں گہرائی آتی گئی۔ اکثر طولِ کلام سے نیاز نے کبھی کام نہ لیا اور مختصر الفاظ میں کتابوں کی قدر و قیمت کا تعین یوں کیا کہ اسے "سند" کا درجہ مل گیا۔

ایک اور تبدیلی یہ نظر آتی ہے کہ دسمبر ۱۹۲۲ء سے مخمور اکبر آبادی کا نام بحیثیت "معاون مدیر" لوحِ نگار سے غائب ہو گیا۔

۱۹۲۳ء میں نگار کا دفتر آگرہ سے بھوپال منتقل ہو گیا۔ نہ جانے اس وقت "یارانِ نجد" پر کیا بیت رہی تھی۔ اس دور میں مجنوں نے بنیادی طور پر نقاد یا افسانہ نویس کی حیثیت سے بزمِ نگار میں شرکت نہ کی، بلکہ شاعر کی حیثیت سے ــــ یہ اور جدید ادیبوں کے ذہنی ارتقا کے ایسے ہی کئی باب نگار کی مدد سے مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ مئی ۱۹۲۳ء کے ملاحظات نیاز کے خط و عکسِ تحریر میں پیش کئے گئے ہیں ــ یہ رسم آج کل بے حد مقبول ہے ــــ ۱۹۲۳ء میں ملاحظات کی وسعت بڑھتی گئی اور اس میں وہ شان پیدا ہو چلی تھی جس کی بنا پر "ملاحظات" کی خاطر ہی کتنے لوگ حلقۂ نگار سے وابستہ ہوئے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے نیاز نے ہندی مسلمانوں کے مسائل کا احاطہ یوں کیا کہ اس تحریر کو ہماری ذہنی تاریخ کی ترتیب میں اہم مواد کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

نیاز نے اول اول ایڈیٹر کی جگہ "رئیس التحریر" کی ترکیب اپنے لئے اختیار کی تھی، لوگوں کو اس میں خود ستائی کا رنگ نظر آیا۔ نیاز نے اس ضمن میں مئی ۲۳ء میں لکھا ــ "یہ لفظ محض اڈیٹر کا مترادف ہے اور مصر میں عام طور پر ایک چیف اڈیٹر اسی لفظ سے یاد کیا جاتا ہے"....

نیاز صاحب نے غالباً بعد میں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کی اور "رئیس التحریر" اڈیٹر اور مدیر میں بدل گیا۔

۱۹۲۳ء میں نیاز کا مشہور افسانہ "شہاب کی سرگزشت" کی اشاعت کا سلسلہ بھی نگار میں شائع ہوا۔ پہلی قسط میں نیاز نے ہمیں اس مشہور تحریر کے سنِ تصنیف سے بھی آگاہ کیا ہے "۱۹۱۸ء میں اس افسانہ کے صرف ابتدائی اجزا رسالہ تمدن میں شائع کر سکا تھا کہ رسالہ بند ہو گیا"

۱۹۲۲ء میں نگار کے اہم قلمی معاون ضیائی، ل۔ احمد، مخمور اکبر آبادی، مانی جائسی، امتیاز علی تاج، قمر الحسن قمر، سہا علیگ فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، مولانا حامد حسن قادری، آغا حیدر حسن دہلوی، عزیز لکھنوی، حکیم احمد شجاع، وحشت کلکتوی، خلیق دہلوی

راز چاندپوری، امین حزیں اور شاد عظیم آبادی تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اس فہرست میں شاہ دل گیر، مجنوں گورکھپوری، پروفیسر نعیم الرحمٰن، سیماب اکبرآبادی، مولانا حسرت موہانی اور ساغر نظامی کے ناموں کا اضافہ ہوا۔

۱۹۲۳ء ہمیں نگار کے سرورق پر ایک تصویر نظر آتی ہے۔ تصویروں کی اشاعت کا سلسلہ اس سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا... زیب النساء کی ایک نادر تصویر کے علاوہ بعض سائنسی مضامین کے ساتھ رنگین تصاویر بھی شایع ہوئی تھیں۔ عبدالرحمٰن چغتائی کے قضیہ کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ لیکن آخر الامر نیاز نے اس حسنِ ظاہری کو نگار کی روایت کا جز نہ سمجھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ بعض دوسرے رسالے اس کام کو بہتر طور پر کر رہے تھے اور دوسری وجہ مالی مشکلات ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ نیاز نے جنوری ۱۹۲۴ء میں لکھا کہ "الائنس بینک میں نصف سرمایہ تلف ہو گیا" ـــــ علاوہ ازیں نگار کے اس تشکیلی دور میں نیاز ایک طرف نگار کے لئے مضامین و موضوعات کا دائرہ وسیع کر رہے تھے اور دوسری طرف اس کی ظاہری صورت کے باب میں بھی تجربے کر رہے تھے۔ نگار نے اپنے آپ کو تسلیم کرا لیا تھا، لیکن اس کا خالق مطمئن نہ تھا۔

"گذشتہ حیاتِ دو سالہ پر ایک بسیط تبصرہ کرنے کی خواہش میں اپنے اندر شدت سے محسوس کر رہا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا، کیونکہ رسالے کے متعلق اس وقت تک میری وہ آرزوئیں بھی پوری نہیں ہوئیں، جو اس سے قبل پیدا ہو چکی ہیں" [جنوری ۱۹۲۴ء]

مئی ۱۹۲۴ء سے ہمیں نگار کے تبصروں میں زیادہ تفصیل اور وسعت نظر آتی ہے۔ غیر اہم کتابوں پر تو تبصرے "رسید" کی حد سے آگے نہ بڑھے لیکن اہم کتابوں کا ذکر خاصی تفصیل سے شروع کیا گیا۔ نیاز نے بعد میں تو اہم کتابوں کا ذکر ملاحظات میں کر کے ادبی صحافت میں ایک مستحسن روایت کو مستحکم کیا (اس کا ذکر آگے آئے گا)۔ مئی کے شمارے میں ابنِ رشد (مولوی محمد یونس انصاری فرنگی محلی) اور دیوان شاد حصہ اول پر سیر حاصل تبصرے کئے گئے ـــــ اس سال بھی دو اہم سلسلے نگار میں شایع ہوئے۔ ہندی شاعری (نیاز) اور زبانِ اردو (رشید احمد صدیقی) ـــــ نگار نے اپنے تمام تر تنوع کے باوجود اہم اور طویل مضامین (خصوصاً ہی میں سہی) اپنی حیات کے ہر دور میں شایع کئے ہیں ـــــ ایسے مضامین جنہیں مستقل کتابچوں کی حیثیت حاصل ہے۔

اسی سال نگار میں مذہبی (میں "دینی" کی اصطلاح کو بہتر سمجھتا ہوں اور ویسے بھی اسلام نیاز کے یہاں مذہب کے تنگنائے کا نام نہیں، بلکہ زندگی کا بحرِ بیکراں ہے) تحریروں کو زیادہ اہم جگہ دی گئی اور یہیں سے ملک کا ایک طبقہ نیاز کا مخالف بن گیا۔ یہ طبقہ ہے ان علماء کا جو دین میں "تفکر" کو "کفر" سمجھتے ہیں اور اس کتاب پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں جس نے بے شمار مقامات پر تفکر کا حکم دیا ہے اور جس نے اپنے مخالفین کو یوں چیلنج کیا ہے کہ "اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ" ـــــ نیاز نے اس تحریک کو جاری رکھا جو سرسید سے شروع ہوئی تھی۔ سرسید کا ذکر میں نے یوں کیا ہے کہ میری گفتگو اسی دور (نشاۃ الثانیہ) تک محدود ہے، ورنہ اسی سرزمین سے شاہ ولی اللہ بھی اٹھے ہیں ـــــ نیاز پر کفر کے فتوے لگائے گئے مگر یہ حربہ اپنا سارا اثر کھو چکا تھا، (اگرچہ ہمارے علماء کافر سازی میں آج بھی مصروف ہیں) نیاز نے بیشتر مقامات پر اپنے قلم کو اصولی تحریروں تک ہی محدود رکھا ہے، مگر بات کہیں کہیں ذاتیات کے دائرے میں بھی داخل ہو گئی اور اس کے لئے وہ شاید کسی دور میں بھی ذمہ دار نہیں گردانے جا سکتے، کیونکہ جن لوگوں کے متعلق انہوں نے لکھا، ان کی ذات سے زیادہ ہمیشہ افکار پر نکتہ چینی کی۔ نیاز کی دینی تحریروں سے قرآن حکیم پر ان کے غیر متزلزل ایمان کا اندازہ ہوتا ہے اور "با محمدؐ ہوشیار" کے شعور کا بھی۔

اگست ۱۹۲۴ء میں "معجزات و کرامات" کے متعلق نیاز نے لکھا:۔

"اگر" خرقِ عادت" سے مراد کسی ایسے فعل کا ظہور ہے جو" قانونِ قدرت" کے خلاف ہو تو قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ اِس کی تردید خود نصوصِ قطعیہ سے ہوتی ہے کلام اللہ میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جو چیز جس اندازہ پر پیدا کی گئی ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی"۔

آگے چل کر نیاز نے اسی مضمون میں سورۂ عنکبوت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے معجزہ پیش کرنے سے خود انکار فرمایا تھا اور رسول اللہ کا اگر کوئی معجزہ تھا تو قرآن پاک تھا اور ہے"

نیاز نے اپنی مذہبی تحریروں میں اگرچہ شاہ ولی اللہ اور دوسرے اکابر کی اسناد بھی پیش کی ہیں مگر ان کا فکری سرچشمہ قرآن حکیم ہی ہے۔ نیاز کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوئی ——— دین کو قرآنی بنیادوں پر پیش کرنے والے اُن کے بعد آئے اور اُن کے اثرات روز بروز تابندہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ نیاز نے جو آواز بلند کی تھی' اس کی تکمیل جناب پرویز ڈائرکٹر قرآنک ریسرچ سنٹر نے اپنی تصانیف اور تحریک طلوعِ اسلام کے ذریعہ بڑی حد تک کر دی ہے۔ یہاں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ جس طرح نیاز صاحب کا فکری سرچشمہ' ان کی دینی تحریروں میں قرآنِ پاک ہے' اسی طرح پرویز صاحب بھی اسی چشمۂ جاوداں سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ ——— لیکن بڑی سے بڑی شخصیت اپنے دور کی تحریکوں سے متاثر ہوتی ہے اور اسی طرح پرویز صاحب نے اپنے راستہ پر اپنے پیش رووں کے نقوش قدم پائے ہوں گے' جن کو دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھا ہوگا ——— اِس جادہ پر نیاز کے نقشِ قدم بھی چمک رہے تھے ——— اب مختصراً یوں کہہ لیجئے کہ نگار ایک ایسی ہمہ گیر تحریک ہے جس نے مذہبی فکر پر بھی دور رس اثر ڈالا ہے۔

۱۹۲۳ء میں نگار کے لکھنے والوں میں اِس عہد کے کئی اور اہم ادیب و شاعر شامل ہوئے مثلاً محمد اکبر حیدری، آزاد انصاری، رشید احمد صدیقی' ثاقب کانپوری، حامد اللہ افسر، بادی مچھلی شہری، سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مسعود ذوقی اور سید عابد علی عابد

نگار کے اربابِ قلم میں ہر سال ہمیں نئے ناموں کا اضافہ ملتا ہے' لیکن ان میں سے بیشتر لکھنے والوں کا دائرہ ادبیات تک محدود تھا اور نیاز یہ طے کر چکے تھے کہ نگار کبھی خالص ادبی رسالہ نہ بنے گا۔ اسی لئے اِن ابتدائی برسوں میں انہیں نگار کے صفحات کو لہو" خونِ جگر" کھلانا پڑا ——— ایک تحریک اور ایک روایت کے قیام کی خاطر کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ نیاز نے ابتدائی تین سال میں کم و بیش ڈھائی تین ہزار صفحات خود مختلف موضوعات پر لکھے۔ اگر یہی وقت جو کتابوں کی تصنیف پر صرف کرتے تو اہم موضوعات پر کم از کم چھ سیر حاصل کتابیں وجود میں آ سکتی تھیں۔ اکتوبر ۲۵ء میں نیاز نے اس" صورتِ حال" کی تفصیل بیان کی ہے۔

"اس مہینہ تقریباً سارا رسالہ مجھی کو اپنے مضامین سے پُر کرنا پڑا ہے ...... نگار کے دورِ حیات میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور گذشتہ تین سال ۹ ماہ کے رسالوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ۴۴۷۳ صفحات میں مشکل سے ایک ہزار صفحات مضامین غیر کے ہوں گے اور باقی تقریباً تین ہزار صفحات ادارت ہی کی طرف سے پیش ہوئے ہوں گے"

اس کے کئی اسباب تھے' پہلا سبب تو یہ کہ نگار کے تنوعِ مضامین کا ساتھ لکھنے والے نہیں دے رہے تھے۔ اور دوسرا سبب نیاز کے الفاظ میں یہ تھا کہ" سب سے پہلے مجھے نگار کے مخصوص حلقۂ احباب سے گلہ ہے کہ اس نے اپنے افکارِ دماغ سے میرا ساتھ نہیں دیا" نہ جانے مخصوص حلقۂ احباب کی اس بے التفاتی کی وجہ کیا تھی؟ ——— نیاز میں خوئے دل نوازی کی کمی یا اس مخصوص حلقۂ احباب میں نیاز کے متعلق جذبۂ رشک ——— پرانے لکھنے والوں کی گروہ بندی اور شکایت کے بعد نیاز نے اس عہد کی نئی نسل سے اپنی توقع وابستہ کرتے ہوئے لکھا کہ" پس ضرورت ہے کہ ملک میں نئے لکھنے والے پیدا ہوں اور نوجوانوں میں یہ ذوق رونما ہو"۔

۱۹۲۹ء میں نیاز نے ایک نیا سلسلہ جاری کیا "تاثرات"۔ اس سلسلہ کی وضاحت نیاز نے یوں کی تھی "نتائج مطالعہ صرف کتابی مطالعہ تک محدود نہ ہوں گے، بلکہ وہ دلچسپ مشاہدات و تجربات بھی اس میں داخل ہو سکیں گے، جو روز کی زندگی میں پیش آتے ہیں"۔ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، ورنہ اس کے ذریعہ زندگی اور انسانوں کے کتنے ہی روپ سامنے آجاتے ــــ اور یقیناً "تاثرات" کا مجموعہ "استفسارات" کے مجموعوں سے کہیں قیمتی ہوتا

نیاز صاحب کو علمی اصطلاحات کی اہمیت کا ہمیشہ احساس رہا ہے، لیکن وہ اس سلسلہ کو کبھی پابندی کے ساتھ جاری نہ رکھ سکے ــــ ویسے بھی یہ کام افراد کا نہیں، اداروں اور مختلف علوم کے ماہروں کی جماعت کا ہے۔ نیاز صاحب نے اگرچہ سادگی اور سلاست کو اصطلاحات کے لئے اہم قرار دیا ہے لیکن اپریل ۱۹۲۵ء میں پیش کردہ اصطلاحوں میں "تلازم الشرطیات" اور "القصور لذہنیہ" جیسی ثقیل اصطلاحیں ملتی ہیں

۱۹۲۵ء سے ملاحظات کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔ جس سیاسی شعور اور سیاسیات کا ذکر انہوں نے نگار کے پہلے شمارے میں کیا تھا۔ اس کا حقیقی آغاز نومبر ۱۹۲۵ء سے ہوا ــــ دوسری خوشگوار اور اہم تبدیلی ۱۹۲۵ء میں یہ نظر آتی ہے کہ اہم کتابوں کا ذکر نیاز نے ملاحظات میں شروع کیا پہلے پہل دسمبر ۱۹۲۵ء میں یاس یگانہ کی کتاب "شہرتِ کاذبہ یا خرافاتِ عزیزیہ" پر نیاز نے تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی۔۔۔۔ نیاز نے وقتی اور سستے ہنگاموں کو ہمیشہ ادب کے لئے مضر سمجھا ہے، ویسے وہ ہمیشہ سے مرد میدان رہے ہیں اور اہم مسائل پر کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔

نگار میں حصۂ نظم ہمیشہ سے انتہائی مختصر رہا ہے۔ یہ بھی نگار کی ایک روایت ہے کہ اس نے ہمیشہ شاعری کے ان نمونوں کو اپنے دامن میں جگہ دی جن میں فنی پختگی، عہد رواں کے تقاضے اور فکری عنصر موجود ہو۔ نیاز نے نگار کے ابتدائی دور میں بار بار حصۂ نظم کی کمی (اور بعض اوقات اس کی کم مائگی) کا شکوہ کیا ہے ــــ اقبال اور ان کے اکابر ہم عصروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی لیکن شاعروں کی اکثریت اس وقت بھی "رگِ گل" سے "بلبل کے پر" باندھ رہی تھی۔ نگار نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور بڑی قوت سے۔

"اجرائے نگار سے قبل میرا خیال تھا کہ ملک کے ذوقِ شعری میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور گل و بلبل کی داستان پارینہ سے لوگ بیزار ہو چکے ہیں، لیکن اب معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا اور ہندوستان (علی الخصوص یو۔پی) ان دماغوں کے پیدا کرنے میں ابھی تک فیاضی سے کام لے رہا ہے جن کی عامیانہ نگاہ، حسن کو صرف ظاہری سطح پر سمجھنے پر قانع ہے اور جن کے یہاں فرسودگیٔ خیال اور کہنگیٔ بیان کا پابند۔ ہنا، پاسِ وضع میں داخل ہے"۔ (نگار۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

۱۹۲۵ء میں نگار کے اربابِ قلم میں جو نئے نام نظر آتے ہیں ان میں مولانا احسن مارہروی، اثر لکھنوی، وصی احمد بلگرامی، ابوالخیر مودودی ضیاءالدین برنی، طالب الہ آبادی اور جلیل قدوائی کے نام ممتاز ہیں۔ وصی احمد بلگرامی اردو کے ان صاحبِ طرز انشا پردازوں میں سے ہیں، جن سے ہمارے نقادوں نے حد درجہ بے اعتنائی برتی ہے۔ ایسی بے اعتنائی جو مجرمانہ ہے۔ ضیاءالدین برنی نے "عہدِ لارڈ ریڈنگ" کے بارے میں ایک طویل مضمون کئی قسطوں میں لکھا۔

۱۹۲۶ء میں نیاز نے پہلی بار اردو صحافت کے ایک اہم مسئلہ پر اظہار خیال کیا یعنی لیتھو کی جگہ ٹائپ قبول کرنے کے بارے میں

"کسی ملک کی صحافت، اس وقت تک ترقی کر ہی نہیں سکتی جب تک لیتھو کو ترک نہ کیا جائے"۔

اپنے اس یقین کے باوجود نیاز، نگار کو ٹائپ میں نہ پیش کر سکے۔ یہ بھی شاید ایک المیہ ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے نگار کے ابتدائی برسوں میں ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۲۶ء سے ان کی نثری تحریریں التزام کے ساتھ نگار میں شائع ہونے لگیں۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں ان کی "سالومی" کا ذکر ہمیں ملاحظات میں ملتا ہے۔

نگار کے فائل ہمیں کئی اہم لیکن فراموش کردہ علمی کارناموں سے بھی آگاہی بخشتے ہیں۔ مئی سنہ ۲۶ء کے ملاحظات میں نیاز صاحب نے جناب منہاج الدین پروفیسر طبیعات اسلامیہ کالج پشاور کی کتاب "نظریہ اضافیت" کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی کتاب، بہت دنوں بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی تھی اور آج رضی الدین صدیقی کی کتاب نظریۂ اضافیت پر اردو کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

ع غلطیہائے مضامین مت پوچھ۔

نیاز نے منہاج الدین صاحب کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"نظریۂ اضافیت (RELATIVITY) زمانۂ حال کا جدید ترین نظریہ ہے جسے جرمنی کے ایک ماہر طبیعیات آئین اسٹین نے پیش کیا ہے۔ یہ نظریہ کیا ہے؟ اس سے طبیعیات کے اصول میں کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے اور ہم اس کی مدد سے کائنات کا کس قدر علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جنہیں فاضل پروفیسر نے نہایت سہل و آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ چونکہ نظریۂ اضافیت کے سمجھنے کے لئے طبیعیات کے بعض ابتدائی مسائل علی الخصوص علم الحرکت کا سمجھ لینا ضروری ہے، اس لئے اس کتاب میں سب سے پہلے طبیعیات کے بعض ایسے ضروری مسائل کو سمجھایا گیا ہے تاکہ اصل مدعا کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو جائے۔"

اس تبصرہ میں نیاز نے کتاب کی اردو اصطلاحات پر بھی گفتگو کی ہے اور بعض مشکل اصطلاحوں کے مترادف خود تجویز کئے ہیں جن سے نیاز کی اصطلاح سازی کی صلاحیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مجوزہ اصطلاحات ان اصطلاحوں سے بہتر اور آسان تر ہیں جو نیاز نے پہلے پیش کی تھیں مثلاً "انعطاف شعاع" کی جگہ "انحرافِ نور" "امر بدیہی" کے بجائے "بدیہیہ" وغیرہ

جون سنہ ۲۶ء میں نیاز نے خواتین کے ادبی ذوق کی "تحدید" کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

"ہمارے ملک کی عورتوں کو صرف معاشرتی لٹریچر کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، تغزل اور عشقیہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو جانا ایک تاریک مستقبل کا پتہ دیتا ہے"

نیاز کے اس نقطہ نظر کی مخالفت کی گئی اور نیاز نے فراخ دلی کے ساتھ مخالفانہ مضامین نگار میں شایع کئے۔ یہ علمی فراخ دلی اور وسعت "نگار" کی قائم کردہ ادبی روایات میں سے ایک اہم روایت ہے ـــــ ویسے ہمیں یقین ہے کہ اب نیاز نے خواتین کے ادب کے بارے میں اپنی رائے بدل دی ہوگی ـــــــــــ ادب کو ریں کے "زنانہ" اور "مردانہ" ڈبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ "عشق" محض مردوں کی جاگیر یا خالص مردانہ جذبہ ہے ـــــ یقین ہے کہ عصمت، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ اور خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم وغیرہ کی تحریروں کو نیاز صاحب بھی اب ہمارے ادب کے لئے وجہِ افتخار سمجھتے ہوں گے۔ بہرحال یہ "مسئلہ زن" ہے ہی کچھ ایسا کہ اقبال اور نیاز جیسے لوگ بھی اس طرح الجھے کہ ان پر مولانا اشرف علی تھانوی رح کا گمان ہونے لگتا ہے۔

سنہ ۲۶ء میں مجنوں کا ایک نہایت اہم افسانہ "سمن پوش" نگار میں شایع ہوا اسی سال جون میں نیاز نے عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں کی اشاعت کے منصوبہ کا ذکر کیا اور امیچر ڈرامیٹک کلب لاہور کی سرگرمیوں کو سراہا۔ اگست میں انہوں نے ایک بار پھر پنجاب کی ادبی خدمات کا بڑی قوت کے ساتھ ذکر کیا۔

"عام طور پر صوبہ یوپی میں اس امر کی شکایت کی جاتی ہے کہ پنجاب اپنی "مجیدہ خیز" سرزمین سے اردو میں نہایت ناقص لٹریچر کا اضافہ کر رہا ہے۔ لاہور وہاں کا ممتاز سے ممتاز رسالہ بھی زبان کی فاحش اغلاط سے پاک نہیں ہوتا، یہاں تک کہ یوپی کے اہل قلم بھی وہاں پہنچ کر "طوطی در پسِ آئینہ"

ہو جاتے ہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف کبھی نہیں کیا جاتا کہ وہ کس "زندہ دلانہ طریقہ پر خدمتِ زبان کے لئے مستعد نظر آتے ہیں اور جس ولولہ و نشاط کے ساتھ وہ کام کر رہے ہیں، اُس سے کس درجہ ان کے تقدم ادبی پر روشنی پڑتی ہے"۔

نیازؔ نے یہ تحریر انجمن اربابِ علم لاہور کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں لکھی تھی جس نے نظم نگاری کو فروغ دینے کے لئے مقررہ موضوعات پر نظم نگاری کے مقابلے شروع کرائے تھے اور ۲۶-۱۹۲۵ء میں اول و دوم انعامات ابو محمد ثاقب کانپوری اور علمدار حسین صاحب واسطی (بقول نیاز دو سیدوں) کو دیئے گئے تھے۔ دونوں انعامات (غالباً) یو پی کے شاعروں کے حصہ میں آئے جس سے اہلِ پنجاب کی ادبی دیانت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔۔۔ اور نیازؔ کے ان اعترافات کو پڑھتے ہوئے یو پی و پنجاب کی اس ادبی کشیدگی کو سامنے رکھئے جو اس وقت کی ادبی فضا پر چھائی ہوئی تھی، اور جس کی شہادت کاروانِ لاہور اور یو پی کے ادبی رسالوں کے فائل آج بھی دیتے ہیں۔ بہرحال دونوں صوبوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو ادب کو کسی کا اجارہ نہ سمجھتے تھے۔

۱۹۲۶ء میں دینی موضوعات پر نیاز کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ نیازؔ کو اسلام اور انسانی مستقبل کی تعمیر میں اسلام کے رول کا جس درجہ یقین ہے اس کا اندازہ ذیل کی چند سطروں سے ہو سکتا ہے۔

"ہر چند اہلِ اسلام کے لئے یہ دور سخت انحطاط و زوال کا دور ہے لیکن بایں ہمہ جو محرمِ بادِ صبا ہے، وہ جانتا ہے کہ اسلام میں اب بھی:

بادجودِ خزاں بوئے یاسمن باقی ست

۱۹۲۶ء میں نگار کے اربابِ قلم میں علامہ دتاتریہ کیفی، میر ولی اللہ، عبدالباری آسی، فراق گورکھپوری اور سید محی الدین قادری زور شامل ہوئے۔ ڈاکٹر زورؔ جو اس وقت سید محی الدین قادری زور بی اے تھے۔

"نگار" کے پہلے دو تین برسوں میں کبھی کبھی تصاویر شایع ہوتی رہیں۔ ۱۹۲۵ء میں تصویروں کے لئے قارئین کرام کا اصرار بڑھ گیا اور اس سلسلہ میں نیازؔ نے جولائی ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا ۔۔ "اس کا کیا علاج کہ میں نگاہِ تماشا پسند کے لئے کوئی سامانِ تفریح مہیا نہیں کر سکتا" ۔۔۔ یہ بات نگار کے موقف کے مطابق نہ تھی، کیونکہ نگار نے فنونِ لطیفہ کو اپنے دائرہ میں بڑی اہمیت دی تھی اور مصوری پر محض مضامین کی اشاعت کافی نہیں، جب تک مصوری کے اعلیٰ نمونے پیش نہ کئے جائیں۔ شاید اسی احساس کے تحت نیازؔ اور نگار کو "نگاہِ تماشا پسند" کا احترام کرنا پڑا اور نگار جنوری ۱۹۲۶ء میں عبدالرحمٰن چغتائی کی دو تصویریں (نقوش، "ماہِ نو" اور "بلبل اسیر") نگار میں شایع ہوئیں۔ بلبل اسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے نیازؔ نے اسی شمارہ میں لکھا۔

"بلبلِ اسیر میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ باوصف اس کے کہ بلبل ایک پر آزادانہ بیٹھی ہوئی ہے، لیکن وہ پھر قفس میں جانے کے لئے تیار ہے، جس کے پاس اس کی حسین مالکہ نے ایک پھول لٹکا رکھا ہے۔ گویا اس تصویر سے اُس تاثر اظہار مقصود ہے جس نے میر سے یہ شعر کہلوایا تھا

در پہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر
ہائے کس طرح کی پابندی ہے"

لیکن فروری کے شمارے میں ان تصویروں کے متعلق ہمیں نیازؔ کی یہ سطریں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

"یقیناً یہ تصویریں مجھے پسند نہ تھیں ۔۔۔۔۔ آئندہ کے لئے عہد کرتا ہوں کہ کبھی کوئی تصویر ایسی پیش نہ کروں گا جس میں حسن، فن سے مغلوب ہو کر مسخ ہو گیا ہو"۔

جن دو تصویروں میں سے ایک تصویر میں نیاز کو ایک گلدان نظر آیا تھا (جس میں بلبل کی مالکہ انہیں "حسین" نظر آئی تھی۔ اس کے بارے میں یہ اظہارِ خیال یقیناً عجیب ہے پھر "نگاہِ تماشا پسند" کا یہ احترام کہ فن کا غلبہ انہیں حسن کو مسخ کرنے کے مترادف معلوم ہو۔

۱۹۲۷ء میں مکانی اعتبار سے نگار کا نیا دور شروع ہوا فروری ۱۹۲۷ء میں نگار بھوپال سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اس انتقالِ مکانی کا کوئی اثر نگار کی خصوصیات اور روایات پر نہ پڑا، لیکن لکھنؤ ایک بار پھر نگار کی بدولت زندہ ادبی مرکز بن گیا۔ وہ لکھنؤ جس کی فضا ادبی جرائد کو راس نہ آتی تھی، وہاں سے نگار تقریباً ۳۵ سال تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اس نقلِ مکانی کا ذکر مارچ ۱۹۲۷ء کے نگار میں نیاز نے یوں کیا ہے

"اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کو (جس حد تک صحافت کا تعلق ہے) اب کوئی علمی و ادبی مرکزیت حاصل نہیں ہے اور نہ یہاں کا ذوقِ عام ایسا ہے جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص نشاطِ عمل اپنے اندر پیدا کر سکے اور یہی سبب ہے کہ یہاں کی آب و ہوا کو رسائل کے لئے ناموافق کہا جاتا ہے، لیکن اگر مصر کی شاہنشاہی پر کنعاں کی گداگری کو ترجیح دی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں لاہور و دہلی کی آسانیوں پر لکھنؤ کے مصائب و مشکلات کو ترجیح نہ دوں جسے فتح پور سے زیادہ نزدیک ہونے کا فخر حاصل ہے"

نیاز کے اس احترامِ ذات کو دیکھئے کہ لکھنؤ کا فتح پور سے قریب ہونا باعثِ فخر" —— یہ "انا" ادیب کے لئے زندگی بسر کرنے کا ایک بہانہ اور وسیلہ ہے —— یہ ایسی ادا ہے جس پر پیار آتا ہے۔

۱۹۲۷ء میں تمکین کاظمی، نظیر لدھیانوی، ڈاکٹر اعجاز حسین (اس وقت اعجاز حسین بی۔اے) ملا رموزی، پروفیسر محفوظ الحق، اعظم کریوی، آسی غازی پوری، روش صدیقی، علی عباس حسینی، سید علی اختر حیدر آبادی اور عبد القادر سروری کے افکار نظم و نثر پہلی بار نگار میں شائع ہوئے، اردو کے مشہور نقاد اور ادبی مورخ جناب حامد حسن قادری نگار کے اس دور میں ایک نئے روپ میں نظر آتے ہیں۔ یعنی "افسانہ نگار" کے روپ میں۔

۱۹۲۷ء اس اعتبار سے بھی نگار کی زندگی کا ایک اہم سال ہے کہ اربابِ قلم نے اس کی اہمیت کو پانچ سال میں تسلیم کر لیا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ تین چوتھائی رسالہ نیاز کو خود بھرنا پڑتا تھا اور کہاں یہ تبدیلی ہوئی کہ

"رفتہ رفتہ اربابِ قلم نے خود (بغیر کسی استدعا کے) نگار کو توجہ کے قابل سمجھا اور اپنے مضامین بھیجنے شروع کئے، یہاں تک کہ آج اگر میں تمام جمع شدہ مقالات کو رسالہ کی ضخامت دوچند کرنے کے بعد بھی شائع کروں تو دسمبر سے قبل ان کی اشاعت ختم نہیں ہو سکتی" (ستمبر ۱۹۲۷ء)

۱۹۲۸ء کا فائل میرے سامنے نہیں ہے، اسی لئے میں اس سال نگار کے ارتقا کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ ۱۹۲۹ء کا پہلا شمارہ (شمارہ جنوری) ۱۹۲۷ء کے مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے، اسی اعتبار سے اسے نگار کا پہلا خاص نمبر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک نیاز کے ذہن میں خاص نمبروں کا کوئی منصوبہ نہ تھا اگرچہ نگار کے خاص نمبر بعد میں اردو کی ادبی صحافت کا گراں قدر سرمایہ بنے فروری ۱۹۲۹ء میں نیاز نے لکھا

"نگار کا نہ کوئی خاص نمبر نکلتا ہے اور نہ اس کا کوئی سالنامہ شائع ہوتا ہے، البتہ کبھی کبھی بغیر کسی التزام و تعین کے ضخامت زیادہ کر دی جاتی ہے .... اگر کوئی صاحب نگار کے کسی ایسی مخصوص اشاعت کو سالنامہ وغیرہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری انہیں پر ہے"۔

نیاز نے اسی شمارے میں ایک بار تصاویر کی اشاعت کی اہمیت کا ذکر کیا ہے لیکن اس بات پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ "اس وقت

تک نگار کی مالی حالت اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ اسی معیار کی تصاویر بھی شایع کر سکے جو اس کے مضامین کا ہے۔"

اسی شمارہ میں نیاز نے چند اہم ہم عصر رسالوں کا ذکر بھی نہایت تعریف کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی ہمایوں، نیرنگ خیال اور مخزن کا ذکر۔ ہمایوں کے بارے میں انہوں نے لکھا۔

"رسالہ ہمایوں اور نگار کی ابتدا ساتھ ساتھ ہوئی جس طرح نگار نے ایک روش قائم کرنے کے بعد اس کو ترک نہیں کیا، اسی طرح ہمایوں نے بھی اپنا سمتِ مقصود نہیں بدلا۔ بلکہ اس کو یہ امتیاز اور زیادہ حاصل ہے کہ وہ تصاویر بھی شایع کرتا رہتا ہے جن میں سے اکثر اچھے ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔"

اسی طرح نیاز نے نیرنگ خیال کے حسن، مخصوص نمبروں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ "آج غالباً اس سے زیادہ کامیاب رسالہ اس باب میں کوئی نہیں" "لیکن" (اور یہ "لیکن" بہت اہم ہے)۔

"لیکن ایک عجیب و غریب بات جو پنجاب کے رسائل و جرائد میں پائی جاتی ہے اور جس سے ہمایوں بھی اپنی انتہائی متانت و سنجیدگی کے نہ بچ سکا، وہ باہمی تضحیک و توہین اور سب و شتم ہے ... خود اُن کا آپس میں افتراق و نشقاق عجیب بات ہے"

۱۹۲۹ء سے ملاحظات پر سیاسی اور ملکی و قومی رنگ غالب آگیا۔ نگار اس دور سے گزر گیا جہاں اپنا ذکر لازم ہوتا ہے۔ اور ملاحظات کا یہی اسلوب نگار کی مستقل خصوصیت بلکہ روایت بن گیا۔ اسی سال نظری مسائل پر نیاز اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے اختلافات کا ذکر دوسرے رسالوں میں بھی ہونے لگا اور ایک ایسا سلسلۂ مضامین جاری ہوا جس سے مختلف نقاطِ نظر ابھر کر سامنے آگئے۔ مذہبی مسائل میں نیاز کی تحریروں نے لوگوں میں عقلی نقطۂ نظر پیدا کر دیا اور اسے نیاز نگار کے سلسلہ میں اپنی محنتوں کا معاوضہ سمجھتے ہیں۔

"نگار نے جو عظیم الشان انقلاب، ہندوستان کے مذہبی عقولِ انسانی میں پیدا کر دیا ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ "معاوضہ" میری حقیر مساعی کا ہے کہ بعض اوقات میں متحیر ہو جاتا ہوں کہ

تا چہ فراہم شد دست اجرتِ جانکاہ ایم"

[نگار - جولائی ۱۹۲۶ء]

اگست ۱۹۲۶ء کے ملاحظات میں نیاز نے لکھنؤ کا تجزیہ جس طرح کیا ہے اور اس میں جو شخصی عنصر شامل ہے اس کے پیش نظر "ملاحظات" کا یہ حصہ نیاز کی بہترین تحریروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ یہ حصہ "نیاز نمبر" میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۲۹ء کے نگار میں رشید احمد صدیقی کے وہ اہم مضامین شائع ہوئے ہیں جنہیں ان کے اسلوب خاص کی نمائندگی کا حق حاصل ہے اور جن کی بنا پر رشید صاحب کا مقام اردو ادب میں محفوظ ہے۔ یہ مضامین ہیں "مغالطہ ذرا ہٹا کر (جون)، شیطان کی آنت (جولائی)، ارہر کا کھیت (دسمبر)۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں "مرقع چغتائی" پر نیاز کا مفصل تبصرہ شائع ہوا۔ جس مصوّر کی تصویروں کے بارے میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ مجھے قطعاً پسند نہ تھیں، اُس کے اس کارنامے کی نیاز نے دل کھول کر داد دی ہے۔ یہ بات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ نیاز نے کبھی اپنی رائے بدلنے میں بخل نہیں کیا اور ان کا ذہن ہر تعصب سے بالاتر ہے۔ تبصرہ کا محض ایک مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ چغتائی کی تصویروں کی آنکھ، ناک، انگلیاں بدنما خلافِ اصل اور مضحک ہوتی ہیں
لیکن یہ وہی لوگ ہیں جو چغتائی کے نقش کی اصلی روح سے واقف نہیں اور جن کی پسندیدگی مادی
نقاشی سے آگے نہیں بڑھتی"۔

۱۹۳۰ء نگار کی زندگی کا ایک اور اہم سال ہے۔ خاص نمبروں اور سالناموں کی روایت کا آغاز "نیرنگ خیال" اور دوسرے رسالے کر چکے تھے۔ ۱۹۳۰ء تک نگار نے "نمبر بازی" سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ لیکن جب ۱۹۳۰ء سے نگار نے خاص نمبر پیش کرنے شروع کئے تو اس کے یہی نمبر ہماری تاریخ ادب کا نہایت اہم باب بن گئے۔ اردو رسالوں میں سے کسی رسالہ کے نمبروں سے تاریخ ادب کی شخصیتوں کے مقامات کے ازسرِنو تعین کا عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں پایا۔ یہ فخر نگار کے حصہ میں آیا۔ آج نظیر اکبر آبادی، مصحفی بہادر شاہ ظفر اور ریاض خیر آبادی کا جو کچھ چرچا سنا جاتا ہے اور کیا جاتا ہے، اس کا سبب نگار کے وہ نمبر ہیں جنہوں نے ان بزرگوں کے مراتب کو تنقیدی بنیادوں پر پیش کیا۔ اسی طرح ہندی شاعری سے جو آگاہی اردو داں طبقہ کو پیدا ہوئی وہ بھی نگار کا کارنامہ ہے ان خالص ادبی نمبروں کے علاوہ "دنیائے اسلام"، "تاریخ اسلام" اور اسلامی علوم و فنون پر جو خاص نمبر نگار نے شائع کئے، اُن سے اس کی علمی روایت کو استحکام حاصل ہوا۔

جنوری ۱۹۳۰ء میں نگار کا شاہ ظفر نمبر شایع ہوا۔ ۱۵۰ صفحات کے اس نمبر میں ۶ مضامین ہیں، لیکن ان کے موضوعات کی تقسیم ایسی ہے کہ شاہ ظفر کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کی ادبی و سیاسی و تمدنی فضا بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس نمبر میں ذیل کے مضامین شامل تھے۔

ظفر کی شاعری	۔ نیاز فتحپوری
بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر	۔ مرزا فرحت اللہ بیگ
دہلی کا آخری دیدار	۔ سید وزیر حسنین دہلوی
عہدِ ظفر میں دہلی کی شاعری	۔ طاہرہ خاتون
عہدِ ظفر کے سیاسی و تاریخی حالات	۔ عبدالمالک آروی
دربارِ ظفر اور عہدِ ظفر کے شعرا	طاہرہ خاتون

نگار کے خاص نمبروں کی کامیابی اور جامعیت کا راز میرے خیال میں یہ ہے کہ غالباً نیاز مضامین کے موضوعات کا انتخاب خود کرتے رہے ہیں اور اس کے مختلف اربابِ قلم کی صلاحیتوں اور رجحانات کے پیش نظر وہ مختلف موضوعات انہیں "الاٹ" کرتے رہے ہیں۔ ادبی رسالہ کے ایڈیٹر اور فلم کے ڈائرکٹر کے درمیان مجھے ہمیشہ بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ پردۂ سیمیں پر مختلف اداکار ہنستے بولتے روتے، آنسو بہاتے اور جذباتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی معمولی سے معمولی جنبش کے پیچھے ایک ذہن اور ایک شخصیت نظر آتی ہے۔ فلم کے ڈائرکٹر کی شخصیت ــــ یہی صورتِ حال رسالوں کی ہے۔ تمام مضامین اور ان کی ترتیب کے پیچھے ایک ذہن سوچتا ہوا اور ایک دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے ــ رسالے کے ایڈیٹر کا ذہن اور اس کا دل۔ لیکن کتنے رسالے ایسے ہیں جن میں چھپنے والی ہر سطر اُن کے مدیروں کی شخصیت کو پیش کرتی ہے؟

۱۹۳۱ء کے نگار میں "سنت" کے مفہوم و حدود کے بارے میں کئی شماروں میں علامہ سید سلیمان ندوی اور سید مقبول احمد کے درمیان بحث شائع ہوئی ہے۔ یہ مضامین اہم اور دلچسپ ہیں۔ اسی طرح مومن و کلام مومن" پر کیفی چریا کوٹی کا طویل مقالہ کئی قسطوں میں

شایع ہوا۔ امتیاز علی خاں عرشی، جگر مراد آبادی اور ظفر قریشی دہلوی نے غالباً اسی سال پہلی بار بزمِ نگار میں شرکت کی۔

نومبر اور دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کے "ملاحظات" عہدِ حاضر میں اردو زبان کی تاریخ کے سلسلہ میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیاز سے منسوب ملاحظات اگر یکجا کئے جائیں تو "خطباتِ عبدالحق" جیسی ایک اور اہم کتاب عالم وجود میں آسکتی ہے جس سے بیسویں صدی میں اردو زبان کی تاریخ کے اہم پہلو بیک نظر سامنے آسکیں گے۔ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء میں نیاز نے اُن کوششوں کی مخالفت کی ہے جو اردو کو مصنوعی طور پر آسان بنانے کے لئے کی جارہی تھیں۔ نیاز کے نزدیک اس کا نتیجہ یہی مرتب ہو سکتا تھا کہ اردو عوامی سطح سے بلند نہ ہو پاتی۔ اس تحریر کو مولوی عبدالحق صاحب کے مضمون "آسان اردو" کے ساتھ پڑھنا ایک دلچسپ تقابلی مطالعہ ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کے نگار کو بھی خاص نمبر قرار دینا چاہیئے۔ اگرچہ اس میں دو افسانے اور ایک دینی مقالہ بھی شامل ہے لیکن اس نمبر کا خاص مقالہ علم فراست التحریر (سید یامین ہاشمی) ہے۔ اس مقالہ یا کتاب کا پہلا حصہ اس نمبر میں شایع کیا گیا جو اردو رسم الخط سے متعلق ہے۔ اسی مقالہ کا دوسرا حصہ انگریزی رسم الخط سے متعلق اسی سال کسی دوسرے شمارہ میں شایع ہوا۔ دوسرا حصہ کلام بی اے (غالباً محمد یعقوب کلام بی۔ اے) نے لکھا تھا۔

۱۹۳۱ء میں دو اہم سلسلے شایع ہوئے۔ ایک تو "مطالعۂ حدیث تنقیدِ صحیح کی روشنی میں" صاحبِ مضمون کا نام ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ "حق گو" کا قلمی نام دیا گیا ہے۔ اگر یہ "حق گو" خود حضرت نیاز تھے تو اخفائے نام کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ نیاز نے اپنے عقیدتی خیالات کے اظہار میں کبھی مصلحتوں سے کام نہیں لیا۔ اور ادبی نقطۂ نظر سے اہم تر سلسلہ "ریاض اپنے آئینہ میں" تھا۔ حضرت ریاض خیرآبادی کی یہ خود نوشت ادبی سوانح اس قدر اہم ہے کہ اسے علیحدہ کتابی صورت میں شایع کرنا ادب کی بڑی خدمت کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تحریر نظروں سے کچھ ایسی اوجھل ہوئی کہ اردو سوانح کے باب میں شاید ہی کسی نے اس کا تذکرہ کیا ہو۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں کچھ نئے نام بزمِ نگار میں نظر آتے ہیں۔ نئے خون کی شمولیت اور اہلِ کارواں میں نئے ساتھیوں کا اضافہ نگار کی بڑی اہم روایت ہے۔ پرنسپل عبدالشکور، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، عدم اور سید بادشاہ حسین کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ نگار کے فائلوں سے ہی عدم کی شعر گوئی کی حقیقی عمر ہمارے سامنے آتی ہے۔ انہیں اہمیت اور شہرت بہت بعد میں نصیب ہوئی۔

سنہ ۱۹۳۲ء کا شمارہ جنوری ایک خاص موضوع سے متعلق ہے۔ یعنی "مرزا غالب کی شوخیاں" — یہ مولانا عبدالباری آسی کی اہم ترین ادبی تحریر ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے تمام ضروری مواد اس میں یکجا کر دیا۔ اسی سال مولانا عبدالباری آسی کے "تذکرۂ معرکہ سخن" کی اشاعت کا سلسلہ نگار میں شروع ہوا — اپنے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد آج مولانا آسی ہم میں سے بیشتر لوگوں کے لئے افسانۂ دیروز بن گئے ہیں — لیکن یہی آسی سنہ ۱۹۳۲ء میں نگار کی اہم ترین ادبی شخصیت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں عہدِ حاضر کی ایک اہم دینی شخصیت مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی زندگی کے بارے میں بھی ایک دستاویزی تحریر شایع ہوئی ہے "عبدالماجد بے نقاب" (نظ۔ خاتون) — وہ عبدالماجد جو شہرِ فقہ و دین میں آج مسند نشینی کے مدعی ہیں کل کی بات ہے، وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں یوں گُل فشانی فرماتے تھے۔

"دیکھو کہ آنحضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سا ہمہ تن مذہب شخص اپنی سطوت کے بقا و تحفظ کے لئے ناگزیرانہ کیا کیا وسائل اختیار کرتا ہے"

اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر یوں کیا ہے۔ خاک بر قلم من کہ مجبوراً اس ٹکڑے کو نقل کر رہا ہوں:-

"بیت اللحم میں ایک مجہول النسب بچہ پیدا ہوتا ہے جس کی والدہ کی عصمت کو اہلِ وطن مشکوک

نظر سے دیکھتے ہیں"

یہ اقتباس ماجد میاں کی کتاب فلسفۂ اجتماع سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اور اب ذرا ان اقتباسات پر نگار ۱۹۳۲ء میں "ملحد" اور "شیدائے دین" نیازؔ کے تبصرہ کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"لیکن دنیا انبیائے کرام کے حضور میں ان تمام گستاخیوں، دریدہ دہنیوں اور توہین و استہزا کو
دیکھتی رہ سکتی ہے اور گزر جاتی ہے۔"

عبدالماجد "شیخ الاسلام" اور نیازؔ "ملحد" ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد

۱۹۳۲ء میں شوکت تھانوی کا خاکہ "افیونی" نگار میں شایع ہوا۔ یہ تھی شوکت کی پہلی بزم آرائی نگار میں۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک .... نگار کی روایات کے تعین کے سلسلہ میں ہم نے یہ سفر بڑی آہستہ خرامی کے ساتھ طے کیا ہے۔ اس اہم اور تشکیلی دور میں نگار نے اپنی وہ روایات قائم کیں، جن کا ذکر سطورِ گذشتہ میں آچکا ہے۔ وقت کم ہے اور سفر طویل ۔۔۔ ذرا اب ہم تیز تر چلیں۔

۱۹۳۳ء کا سالنامہ "شہوانیات" سے متعلق تھا، یہ سالنامہ تمام تر نیازؔ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ اسی کو "ترغیبات جنسی" کہہ لیجئے یہ بات افسوس ناک ہے کہ نیازؔ نے ریولاک ایلیس کا کہیں ذکر نہ کیا، جس کے یہاں سے انہوں نے پورا مواد حاصل کیا۔

۱۹۳۴ء کے سالنامہ میں سید علی اختر حیدرآبادی کی ایک نظم کے علاوہ دو مضامین شامل ہیں "لبوں کی داستاں" از سید یامین ہاشمی اور "بکھرے ہوئے موتی" ۔۔۔ سید یامین ہاشمی کی یہ تحریر تمدنی بھی ہے، ادبی بھی، تاریخی بھی اور جنسی بھی۔ بوسہ کے بارے میں ایسا مواد اردو میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ "بکھرے ہوئے موتی" نیازؔ کے مشاہدات و مطالعہ کا عکسِ لطیف ہیں۔ "تاثرات" کے نام سے جو نا تمام سلسلہ شروع کیا گیا تھا، اس کی تکمیل ہمیں یہاں ملتی ہے ۔۔۔ یہ طرزِ ٹیگور کی نقالی نہیں بلکہ ان تاثرات کا اظہار ہے جنہیں اگر طویل بنایا جائے تو وہ اپنی ساری لطافت کھو بیٹھتے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں اگر ایک طرف سید نجم الدین احمد جعفری، فطرت واسطی اور عقیل جعفری نگار کے قلمی معاون بنے تو دوسری طرف، ہمیں تین ایسے نام بھی پہلے پہل نظر آتے ہیں جنہوں نے ہمارے جدید شعری ادب کی تشکیل میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ میری مراد مخدوم محی الدین (جو اس وقت روایتی ترتیب کے مطابق محی الدین مخدوم تھے)، اخترؔ انصاری دہلوی اور اسرار الحق مجازؔ سے ہے۔ مجازؔ کی نظم "خواب بیداری" اور مخدوم کی نظم "طور" نگار ہی میں شایع ہوئی تھی۔ نگار کی روایات میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے "قدیم" و "جدید" کے درمیان کوئی مصنوعی دیوار (دیوار برلن کی سی) نہیں کھینچی ۔۔۔ ایک طرف اس نے ہمارے دین، اور ہمارے ثقافتی ورثہ سے ہمیں آگاہی بخشی اور دوسری طرف ادب کے جدید رجحانات کو بھی تقویت بخشی۔

اسی سال اردو کی "پُراسرار" افسانہ نویس خاتون طاہرہ دیوی شیرازی کا پہلا افسانہ "دُخترِ کفش دوز" نگار میں شائع ہوا طاہرہ اور شیرازی کے ساتھ "دیوی" کے ٹکڑے نے اس شخصیت کے حقیقی روپ کو کتنے ہی لوگوں کے نزدیک "مشکوک" بنا دیا تھا۔ کچھ لکھنے والوں نے تو یہاں تک کہا کہ یہ خاتون حضرتِ نیازؔ کا زنانہ ایڈیشن ہیں اور اس خیال کی بنیاد "طرزِ طاہرہ" پر رکھی گئی جو نیازؔ کے اسلوب سے خاصی مشابہت رکھتا تھا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ شہادت کچھ ایسی قوی نہیں ہے۔ کئی لکھنے والوں نے نیازؔ کے اسلوب کی

تقلید کی ہے اور یہ ادبیات کی تاریخ میں کوئی انوکھی بات نہیں . . . قصہ مختصر یہ کہ ۱۹۳۲ء میں پڑھنے والے اس کے لئے تیار نہ تھے کہ کسی خاتون کے افسانہ کا پہلا ہی جملہ اس نوع کا ہو کہ

"وہ ہنوز محوِ استراحت تھی ۔ ایک نیم عریاں عالم میں گردن شانہ تک کھلی ہوئی تھی اور دونوں شانے نصف سینہ تک برہنہ تھے"

عورتوں کے "دائرۂ انشا پردازی" سے متعلق ابتدائے نگار میں حضرت نیاز کے خیالات کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور اس جگہ ہم نے اپنے اس یقین کا اظہار بھی کیا ہے کہ یقیناً عورتوں کے ادب اور اس کے حدود کے بارے میں حضرت نیاز نے اپنے خیالات بدل دیئے ہوں گے ۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے اس افسانہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت نیاز اس باب میں اپنے سابقہ خیال اور موقف سے ۱۹۳۲ء ہی میں دست بردار ہو گئے تھے ۔

جولائی ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ اور دہلی دبستانِ شاعری سے متعلق نگار کے اگلے سالنامہ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور اہل قلم کو موضوعات مجوزہ پر لکھنے کی دعوت دی گئی ہے ۔ اس سے نگار کی علمی و ادبی منصوبہ بندی اور اس کے مدیر کی شخصیت کا واضح طور پر اظہار ہوتا ہے

۱۹۳۶ء کا سالنامہ ہندی شاعری سے متعلق ہے ۔ اس نمبر نے اردو داں حلقے میں ہندی شاعری کا ایسا ذوق پیدا کیا کہ اب تک اس موضوع پر اردو میں کئی مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ اردو شاعری پر فارسی اثرات یقیناً غالب رہے ہیں ، لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ ہندی شاعری کی روایات کے اثرات سے اردو شاعری بالکل بے نیاز نہیں رہ سکی ۔ یہ اثرات ہمیں دکنی دور سے عظمت اللہ خاں اور آج کے اردو گیتوں تک نظر آتے ہیں ۔

اس نمبر کے مضمون نگاروں میں نیاز ، رام کمار ورما ، ابو سعید بزمی ، ڈاکٹر اعظم کریوی ، پروفیسر احتشام حسین (اس وقت احتشام رضوی بی ۔ اے) اور رسول احمد صاحبان کے نام ممتاز ہیں ۔ رسول احمد صاحب کے چار ، نیاز فتحپوری کے چار اور ڈاکٹر اعظم کریوی کے دو مضامین شامل ہیں ۔ مضامین میں خاصا تنوع ہے ۔ "ہندی شاعری کی تاریخ" ۔ "ہندی شاعری کے تین خاص دور" "ہندی شاعری کی بعض نادر تشبیہات" "مغلیہ حکومت اور ہندی شاعری" وغیرہ عمومی مقالے ہیں ۔ ان کے علاوہ بہاری ، تلسی داس ، کبیر داس ، بھوشن اور ہندی کی شاعرات پر بھی مقالے شامل کئے گئے ہیں ۔

۱۹۳۷ء کا سالنامہ کسی خاص موضوع تک محدود نہیں ہے ۔ اس میں ایک حزینہ ڈرامہ "اصحاب کہف" کے علاوہ "مسئلہ خلافت و امامت" پر حضراتِ تشیع کے نقطۂ نظر سے متعلق ایک طویل مقالہ شامل ہے ۔ اس مقالہ کے اختتام پر نیاز کے اختتامی نوٹ کی یہ سطریں بڑی اہم ہیں : ۔

"بدقسمتی سے میرا شمار ان لوگوں میں سے ہے جنہیں نہ تشیع سے کوئی واسطہ ہے ، نہ تسنن سے (اور اگر ہے تو دونوں سے یکساں)"

نیاز دین میں فرقہ سازی کے خلاف ہیں ـــــ وہ محض "مسلم" ہونے کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں ۔ اس باب میں ان کا وہی مسلک ہے جو عہدِ حاضر میں اقبال ، علامہ اسلم جے راج پوری اور جناب پرویز کا رہا ہے ؎

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکر رضؓ و علی رضؓ ہشیار باش

ان دو اہم تحریروں کے علاوہ سائنس کے "بعض دل چسپ معلومات" ، اور آسکر وائلڈ کے خطوط و نادرات بھی اس

خاص شمارہ میں پیش کئے گئے ہیں۔

اس دوران حضرت نیاز کے "مکتوبات" کا سلسلہ بھی نگار میں پابندی کے ساتھ شایع ہوتا رہا۔ یہ خطوط اسلوب، انشا اور ادبی معلومات کا گنجینہ ہیں مگر ان میں وہ گرم انسانی فضا نہیں، جن کی توقع ہم خطوط سے کرتے ہیں۔ دینی مباحث کی وسعت بھی بڑھتی گئی۔ ۱۹۳۷ء کے مضمون نگاروں میں جلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کا نام ممتاز ہے۔ اسی سال حضرت عندلیب شادانی کا نام بھی ہمیں بزم نگار میں نظر آتا ہے۔ مئی ۱۹۳۶ء کے نگار میں "یوپی کا ایک نوجوان ہندو شاعر" کے عنوان سے نیاز صاحب نے فراق گورکھپوری کی غزل گوئی کا جائزہ پیش کیا ہے اور غالباً یہی وہ مضمون تھا جس نے ہمارے نقادوں کو فراق کا "نوٹس" لینے پر مجبور کیا۔ آج فراق "خاصانِ غزل" میں شمار کئے جاتے ہیں ——— ۱۹۵۱ء میں مدت کے بعد مجنوں گورکھپوری اور "ل۔احمد" پھر اپنی انجمن میں نظر آتے ہیں ——— اسی سال فراق کے رد تنقیدی مضامین بھی نگار میں شایع ہوئے۔ ایسے مضامین جو فراق کی تنقیدی اہمیت کی بنیاد بنے۔

۱۹۳۶ء سے ترقی پسند تحریک نے ایک واضح شکل اختیار کر لی تھی۔ نگار و نیاز کا اس تحریک کے متعلق کیا ردِ عمل تھا، کیا تاثرات تھے اور اس تحریک کی اشاعت و تہذیب میں نگار کا کیا حصہ رہا ہے؟ ——— یہ موضوع خود ایک مقالہ کا طالب ہے ... اور اگر میں نے ان مسائل کو چھیڑا تو شاید یہ جائزہ توازن و تناسب سے محروم ہو جائے گا ——— علاوہ بریں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۷ء تک کا یہ جائزہ نگار کی روایات و خصوصیات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کافی ہے۔ ترقی پسند تحریک اور نگار سے متعلق چند اشارے کرتا چلوں، سرِ دست یہی کافی ہوگا۔

نگار نے ترقی پسند تحریک کو کوئی بدعت نہ سمجھا، بلکہ اسے ہمارے ادب اور زبان کی قوتِ نمو کا سبب جانا ... لیکن نگار اس افراط و تفریط کا شکار نہ ہوا جو ترقی پسند تحریک کے آغاز میں ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس عہد کے ترقی پسند ماضی کے ادب العالیہ کو افیون قرار دیتے تھے۔ اسالیبِ فن سے بے اعتنائی برتتے تھے۔ ایک طرف نگار نے ان رجحانات کا مقابلہ کیا اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک کے صحت مند عناصر کو سراہا اور انہیں تقویت بخشی۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۶۲ء تک نگار کے خاص نمبروں نے ہماری ادبی تاریخ کے کئی اہم خلا پُر کر دیئے۔ ان میں "مصحفی نمبر" "نظیر نمبر" "ریاض نمبر" "اردو شعرا نمبر" اور پھر اس پر "تنقید نمبر" "جدید شاعری نمبر" "انتقاد نمبر"، "اصناف سخن نمبر" "افسانہ نمبر"، "عملی تنقید نمبر" "داغ نمبر" "حسرت نمبر" "غالب نمبر" اور "اقبال نمبر" وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ "مصحفی نمبر" نے پہلی بار لوگوں کو مصحفی کی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ وہ مصحفی جو "بے رنگ" شاعر کہا جاتا تھا اسے ہمہ رنگ سمجھا جانے لگا ——— اور پھر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اس شاعر سے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی۔ اس تذکرہ سے مراد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ادبی REVALUATION کے سلسلہ میں نگار کی کوششیں ہمیشہ بارآور ثابت ہوئیں ——— اسی طرح "انتقاد نمبر" نے اس وقت تک اردو میں تنقید کے موضوع پر کسی جامع کتاب کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا۔ ان نمبروں میں میرے نزدیک سب سے اہم "اردو شعرا نمبر" ہے جس میں عہدِ حاضر کے ممتاز شاعروں نے اپنے حالات اپنے قلم سے لکھے ہیں اور اپنے کلام کا انتخاب بھی خود کیا ہے ——— یہ نمبر آئندہ اس عہد کی شاعری کے بارے میں ایک نہایت اہم دستاویز سمجھا جائے گا۔ اس عہد میں نگار کا نہایت اہم رجحان یہ بھی رہا ہے کہ ماضی کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ عہدِ حاضر کے شاعروں پر بھی خاص نمبر شایع کئے گئے۔ "ریاض نمبر" کے بعد "حسرت نمبر"۔ حسرت کے مرتبہ اور عظمت کا اعتراف تو سب ہی نے کیا ہے۔ انہیں اپنی زندگی میں روایتی ناقدری سے واسطہ نہ پڑا

(ادب کی حد تک) ۔ ان کے حالات و کلام پر ان کی زندگی ہی میں کتنے ہی مقالے اور دو ایک کتابیں شایع ہو چکی تھیں لیکن نگار کا حسرت نمبر اپنی کیفیت و اہمیت کے اعتبار سے دوسرے مجموعوں سے مختلف اور ممتاز ہے ۔ نیاز نے حسرت کی نثر کے نہایت عمدہ نمونے بھی اس نمبر میں شایع کر کے اسے دقیع تر بنا دیا ـــ یہ میرا ادبی عقیدہ ہے کہ حسرت کی نثر اور تنقیدی حیثیت کو نظر انداز کرنے والے انہیں شاعر کی حیثیت سے بھی نہیں سمجھ سکتے ۔

ان ادبی نمبروں کے علاوہ اس دور میں نگار نے کئی علمی و تاریخی نمبر بھی شایع کئے مثلاً "پاکستان نمبر" علمائے اسلام اور اسلامی نمبر، فرمان روانِ اسلام، شیخ اسلام نمبر، خدا نمبر اور اسلامی ہند نمبر وغیرہ ۔

پاکستان کے بارے میں نیاز کا موقف کیا رہا ہے" ۔ اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتا لیکن اس حقیقت کا اظہار لازم ہے کہ قیام پاکستان کے بعد نیاز نے بڑی جرأت کے ساتھ ہندوستان میں رہتے ہوئے پاکستان کی خیر خواہی کا اظہار کیا اور کئی بار صاف صاف الفاظ میں لکھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے پاکستان سے بھی ہمیں اسی قدر دلچسپی ہے جس قدر دوسرے اسلامی ملکوں سے

اس جائزہ کے بعد آپ اس باب میں مجھ سے یقیناً متفق ہوں گے کہ نگار نے ایک طرف ماضی کے ادب اور ثقافتی ترکہ سے ہمارے رشتہ کو استوار کیا، دوسری طرف ہمیں حال کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور مستقبل کے مسائل کو سمجھنے کی بصیرت عطا کی ۔ نگار کی تاریخ ل ۔ احمد اور مجنوں گورکھپوری سے خورشید الاسلام تک پھیلی ہوئی ہے ۔ خورشید الاسلام جو جدید تنقید کا سب سے سجیلا اور البیلا نقاد ہے، وہ بھی حقیقی معنوں میں ہمارے لئے نگار کی "دین" اور نگار کا "تحفہ" ہے

نگار ۴۲ سال کا ہو گیا ہے ۔ مغرب میں کسی جریدہ کے لئے یہ مدت بہت طویل نہیں لیکن اردو صحافت کی حد تک ۔ بات خود ایک ادبی معجزہ ہے ۔ ورنہ نگار کے کتنے ہی ہم عصر اب ماضی کی داستاں بن گئے ہیں ۔ نگار کو اپنے درمیان دیکھ کر اقبال کا یہ مصرع ذہن سے ہونٹوں تک اور ہونٹوں سے زبانِ قلم تک بے اختیار آ رہا ہے کہ

ع ۔ تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

نیاز صاحب ــــ نہ دیدہ نہ شنیدہ

(تاثراتی جھلکیاں)

ارشد کاکوی

نیاز صاحب کو نہ دیکھا نہ سنا۔ ہاں جانا اور پہچانا ضرور ہے، میں اگر اُن کو دیکھ چکا ہوتا، اُن سے مل چکا ہوتا تو شاید اس سے زیادہ جان پہچان نہ ہوتی۔ یہ وہ جان پہچان ہے جو ملاقات کے بغیر بھی ممکن ہے۔ یہ اتنی پرانی اور گہری ہے کہ اس کا قطعاً افسوس نہیں ہوتا کہ نیاز صاحب سے کبھی صحبت نہیں رہی۔ اُن سے اگر کبھی ملنے کا اتفاق ہوا تو پہلی ملاقات پر بھی بیسویں بائیسویں ملاقات کا احساس ہوگا یہ احساس کی باتیں ہیں، ان کو منطق اور عقل کی میزان پر نہ تولئے۔ مندرجہ ذیل محض تاثرات ہیں، ان جھلکیوں سے نیاز صاحب کی شخصیت کے کچھ جلوے اُبھرتے ہیں۔

میری عمر اس وقت بتیس (۳۲) سے زیادہ نہیں اور نگار کی عمر بیالیس (۴۲) سے کم نہیں۔ نگار، اردو کا وہ رسالہ ہے جس کا مطالعہ ادبی شوق نہیں ادبی ذوق چاہتا ہے، اب تو معیاری رسائل کئی ہیں لیکن نگار عرصۂ دراز تک تنہا بلند پایہ معیاری جریدہ رہا ہے۔ اس نے معیار قائم ہی نہیں رکھا، معیار پیدا کیا ہے۔ میرا ادبی ذوق اس وقت اُبھرا جس وقت میری عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی۔ ہاں ادبی شوق کی عمر البتہ اس سے زیادہ ہے لیکن باوجود اس کے کہ میرے ادبی ذوق کی عمر پندرہ برس کے لگ بھگ ہے اور نگار کی عمر بیالیس سال، میں نے نگار کا ہر وہ شمارہ دیکھا اور پڑھا ہے جو میری پیدائش اور میرے ادبی ذوق کی نمود کے قبل بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ بڑے ابا، سید شاہ ولی الرحمان ولی کاکوی کے مضامین کثرت سے نگار میں چھپتے تھے، والد گرامی پروفیسر شاہ سید عطا الرحمان عطا کاکوی کے بیشتر مضامین بھی نگار ہی میں شائع ہوئے ہم لوگوں کے خاندانی کتب خانے میں (جس کا نام رحمانی کتب خانہ، کاکو تھا) نگار کی پوری فائل موجود تھی۔ بچپن میں نگار دیکھتا تھا، لڑکپن میں چھُو چھپا کر رکھ دیتا تھا، نوجوانی میں ورق گردانی کرنے لگا اور جوانی میں نگار سے وہ تعلق ہوا جو واقعی جوانی میں کسی نگار سے ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے۔

یوں تو میری ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اچھے بُرے رسالوں میں چھپنے بھی لگا تھا لیکن میں اپنی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز ۱۹۵۲ء سے سمجھتا ہوں، اسی سال میں نے نگار میں لکھنا شروع کیا اور کئی سال تک جتنے بھی تنقیدی مضامین لکھے، وہ نگار ہی میں چھپتے رہے۔ نگار میں RECOGNITION ملنے کے بعد ہی مجھ میں خود اعتمادی آنے لگی اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے ادبی کیریر کے فروغ میں نگار کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان دنوں کتنے ہی اپنے پرائے ایسے تھے جو مجھے صرف اس لئے نالائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے کہ میری تحریریں نگار میں چھپتی تھیں۔ نگار میں چھپنا گویا بڑی بات تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ باتیں اپنی بڑائی جتانے کے لئے کہی گئی ہیں۔ یہ تو بڑے ہی لوگ ہوتے ہیں جو چھوٹوں کو بڑا بناتے ہیں۔

بقول شادانی ؎ ع "پرتو مہر سے ذرّوں میں چمک آتی ہے" (شادانی)

میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں، میرا خیال ہے کہ فراق اور مجنوں جیسی ہستیاں بھی نگار ہی کے ذریعہ متعارف ہوئی ہیں۔ نیاز نے کتنوں کو دریافت کیا، کتنوں کو متعارف کرایا۔ کتنوں کو بنایا (کتنوں کو مٹایا بھی) اس کی فہرست خاصی طویل ہوگی۔

عموماً کسی رسالے میں اگر دو یا تین بار کسی کا کوئی مضمون چھپ جاتا ہے تو ایڈیٹر اس کے مضامین کو بغیر پڑھے کاتب کے حوالے کر دیا کرتے ہیں، مطلب یہ کہ کسی رسالے میں جب ایک بار کسی کا کوئی مضمون چھپ جاتا ہے تو پھر اس میں چھپنے کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ نگار میں میرے تین چار تنقیدی مقالے چھپ چکے تھے۔ ایک بار میں نے صوبۂ بہار کے ایک کم معروف مرحوم صوفی شاعر شاہ اکبر داناپوری کا تعارف کراتے ہوئے اُن کی شاعری پر مضمون لکھکر نگار کو بھیجا تھا اور ٹھیک اس وقت جبکہ میں نیاز صاحب کے حسبِ معمول دو سطری شکریئے کے خط کا منتظر تھا، مجھے ایک بھاری لفافہ ملا۔ نیاز صاحب نے مضمون واپس کر دیا تھا، اس لئے کہ وہ تشنہ تھا۔ نمونۂ کلام بھی کم تھا۔ کیا اس سے اس امر پر روشنی نہیں پڑتی کہ نیاز صاحب نگار کے پُرانے قلمی معاونین کی نگارشات بھی آنکھیں بند کرکے شائع نہیں کر دیتے؟ وہ ہر مضمون کو از اول تا آخر پڑھتے ہیں۔ کم ہی ایڈیٹر حضرات ایسا کرتے ہیں۔ بعض ایڈیٹر حضرات اپنے جریدے کے تمام مطبوعہ مضامین بھی نہیں پڑھتے۔ نیاز صاحب کی ادارت میں بڑی چھان پھٹک ہوتی ہے۔

اسی نوعیت کا ایک اور تجربہ ـــــ نیاز صاحب، جمیل مظہری کی شاعری کے بڑے قدردان رہے ہیں اور ان کا خیال رہا ہے کہ جمیل صاحب کے قلم سے ہمیشہ درجۂ اول کی چیز نکلتی ہے۔ اس ستایش اور قدردانی کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ اُن کے کلام کی طرف سے انھوں نے اپنی نگاہ انتقاد و انتخاب کو موند لیا ہو۔ جمیل صاحب کی ایک نظم نگار کو بغرض اشاعت بھیجی جاتی ہے۔ جب چھپ کر آتی ہے تو نظم کے تین اشعار محذوف پائے جاتے ہیں۔ جمیل صاحب کو اشتیاق ہوتا ہے کہ وہ اشعار کیوں حذف کئے گئے۔ مجھ سے ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں خط لکھکر نیاز صاحب سے دریافت کروں کہ ایسا کیوں ہوا۔ میں نے خط لکھا، نیاز صاحب نے جواب دیا جو مجھے قائل کرنے کو کافی تھا

جوش اور نیاز کا تعلق بڑا "معنی خیز" رہا ہے لیکن اب جبکہ جوش "چھیڑنے اور اُکسانے" کے جذبہ ہائے شوخ وحوال سے تائب ہو چکے ہیں، نیاز صاحب سے اپنی دیرینہ جھنکوں کے باوجود اُن کی فضیلت کا اعتراف بڑی فراخدلی اور بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ اس سے جوش کے ظرف اور نیاز کی عظمت دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی وفات کے بعد پاکستان میں اُن کی جانشینی اور انجمن ترقی اردو کی سرپرستی کا مسئلہ زیرِ غور تھا اور اس باب میں خود جوش کا نام بھی لیا جا رہا تھا۔ جوش نے اس افواہ کے پیشِ نظر جنگ (کراچی) میں جو بیان دیا وہ یہ ہے:

"اگر میں اس فرہنگ نویسی میں مصروف نہ بھی ہوتا اور اُس بیکاری کے عالم میں بھی بابائے اردو کی نیابت کے سلسلے میں میرا اور نیاز صاحب کا نام دوش بدوش پیش کیا جاتا تو میں پوری ذمہ داری اور کامل دیانت شعاری کے ساتھ اپنے نام پر نیاز صاحب کے نام کو ترجیح اور نمبر اول ترجیح دیتا اور اس بنا پر ترجیح دیتا کہ حضرت نیاز کی ذات میں جو تنظیم و تجربہ کاری اور جو علمی و ادبی شہریاری پائی جاتی ہے اس پر نگاہ کرکے بابائے اردو کی نیابت کے واسطے اُن سے بہتر اور کوئی نام پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

نگار ـــــ نیاز صاحب کی شخصیت کا ایسا بھرپور اظہار ہے کہ "نیاز و نگار" لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک کے بغیر

دوسرے کا تصوّر محال ہے۔ کبھی کبھی بولنے اور لکھنے میں مجھ سے "نگار فتحپوری" اور "مدیر نیاز" کی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ نگار کا اپنا منفرد مزاج ہی نہیں بلکہ ایک واضح شخصیت ہے۔ بیالیس سال سے جس آن بان جس رکھ رکھاؤ سے نگار شائع ہو کر ادبی، علمی، معاشرتی، دینی (جی ہاں دینی بھی) خدمات انجام دیتا رہا ہے اس کا ذکر نہ کیجئے تو ضروری معلوم ہو کہ ذکر کیجئے اور ذکر کیجئے تو معلوم ہو کہ یہ ذکر غیر ضروری تھا۔ نیاز صاحب پاکستان آنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ادارے کا پورا انتظام نقل و نشر کی زد میں آجاتا ہے۔ نگار بجائے بھارت کے پاکستان سے چھپنے لگتا ہے لیکن تعویق و تاخیر نہیں ہوتی۔ ـــ وضع قائم، انداز برقرار، روش بدستور۔ نگار ہی اردو صحافت کی وہ واحد شمع ہے جو تند و تیز ہوا کی زد پر بھی جلتی رہی ہے۔ اُن کا رسالہ کاسۂ گدائی کبھی نہ بنا۔ اشتہارات کی اُس نے پرواہ کی پوری نیازمندی سے ادب کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ حالات سے جنگ کی، اور اس کا ایڈیٹر کبھی نہیں بکا۔ انھوں نے رونے بسورنے کو کبھی اپنا مسلک نہیں بنایا وہ پوری تنومندی سے ڈٹے رہے۔ اب بھی جبکہ ان کے عناصر بے اعتدالی کی زد میں آنے لگے ہیں انھوں نے جیتے جی اس خیال کو عملی صورت پہنانا شروع کیا ہے کہ وہ مر جائیں مگر نگار زندہ رہے۔ یہ محض اُن کے مزاج کا استقلال اور اُن کے عزم کی پختگی نہیں بلکہ یہ ان کا مسلکِ عشق ہے۔

ع   دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے (اقبال)

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان بھائیوں ہی پر منحصر نہیں، زمانہ ہر مجتہد، ہر انقلاب پسند شخص کا دشمن ہوتا ہے لوگ پرانی لکیروں کو پیٹنے کے علاوہ نئے جادوں کو بہت مشکل سے قبول کرتے ہیں۔ جب کوئی نئی آواز ابھرتی ہے تو گالیوں سے اس کا خیر مقدم ہوتا ہے۔ ہماری ادبی دنیا کو خانقاہی فضا بہت راس رہی ہے۔ فکر و نظر کی جب بھی کوئی نئی شمع جلتی ہے تو مخالفت کی کالی پیلی آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔ کچھ راہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں، کچھ وہیں ڈیرا ڈال دیتے ہیں، کچھ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ نیاز صاحب کا تعلق بھی انھیں آگے بڑھتے رہنے والوں میں ہے۔ انھوں نے ادب و معاشرت کے معمار کی حیثیت سے اپنا کام شروع کیا۔ اُن کو گالیاں دینے والوں کی تعداد تو لامحدود ہے لیکن اُن کی خدماتِ علم و ادب، دین و معاشرت کا نصف حصّہ بھی کرنے کی توفیق کسی میں نہیں ہوئی۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے نیاز صاحب کی کوئی تصنیف بھی ڈھنگ سے نہیں پڑھی لیکن وہ بھی اُن کو بُرا کہنے لگے ـــ اُن کی تقلید میں جو ان کو بُرا کہا کرتے تھے اور اسی میں اپنی بھلائی جانتے تھے۔ ہمارے یہاں یا تو اندھی تقلید ہے یا پھر گونگی تردید ـــ تیسری کوئی راہ نہیں۔ مجھے نہیں یاد آتا کہ جس نزاعی مسئلے پر نیاز نے قلم اُٹھایا ہو۔ اس کی رد میں کسی نے اسی وزن کے ساتھ معقول اور مدلّل تردید کی ہو۔ انھوں نے بارہا علما حضرات کو دعوتِ فکر دی، اظہارِ خیال کا پیغام دیا لیکن جواباً سوائے "کف دردہانے" کے اُن کے سامنے اور کچھ نہیں آیا۔ نیاز صاحب کو کافر و مرتد کہنے والے مولوی حضرات مجھے بہت ملے لیکن اُن کو مسلمان بنانے والا کوئی بندہ نہ ملا۔ نیاز صاحب کی وسعتِ علم، شاہینیٔ فکر، اور قوتِ نظر کے علاوہ اُن کی تحریر کا جو مخصوص منفرد، پُروقار اسلوب ہے اس کی داد دینے کے لئے محض ایک انصاف پسند دل کی ضرورت ہے اور افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں انصاف پسند دلوں کی اتنی ہی کمی ہے جتنی تیار فصلوں کو تباہ کرنے والے ٹڈیوں کی افراط ہے۔

نیاز صاحب کے اسلوب میں جو توانائی، جو جامعیت، جو چمک ہے اُس سے ہمیشہ ایک پُر جوش اور پُر شباب شخص کے رجائی ذہن و فکر کی نمائندگی ہوتی ہے۔ میں نیاز صاحب کی تصانیف برسوں سے پڑھتا تھا اور اُن کے اسلوب نے میرے

ذہن میں جب بھی اُن کی کوئی تصویر بنائی تھی وہ ایک جوان شخص کا سراپا تھا۔ چند سال قبل، پہلی بار رسالہ نقوش (لاہور) میں ان کی چند تصویروں کو دیکھا تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ نیاز صاحب کی جو خیالی تصویر میرے ذہن میں تھی اس کی زبردست تردید ہو رہی تھی۔ پہلی بار مجھے خیال ہوا کہ نیاز صاحب بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن ان کی تحریر سے آج بھی توانائی ٹپکتی ہے۔ میرا ذہن بڑی مشکلوں سے اس حقیقت سے مانوس ہوا کہ نیاز صاحب کو ضعیفی نے اپنے حصار میں لے لیا ہے اور اب جبکہ وہ اسّی برس سے زیادہ فاصلۂ حیات طے کر چکے ہیں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جب بھی مریں گے تو ہم فلکِ پیر سے یہی پوچھیں گے کہ

ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور (غالب)

نیاز صاحب کو بھی مرنا ہے، یہ حقیقت ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ خواہ نوّے سال کی عمر میں دنیا سے کوچ کریں یا سو سال کی عمر میں، اُن کی موت بہر حال "جواں مرگی" ہی ہوگی۔ مضمون کے آغاز میں لکھ چکا ہوں اور خاتمہ بھی اسی پر کرتا ہوں کہ یہ احساس کی باتیں ہیں، ان کو منطق اور عقل کی میزان پر نہ تولیے۔

ادبیات

"ادبیات میں سب سے زیادہ مشکل فن شعر گوئی ہے، اور بدقسمتی سے آج اسی کو سب سے زیادہ آسان سمجھ لیا گیا ہے۔ جس حد تک صرف وزن شعری کا تعلق ہے، یقیناً اس میں کوئی اشکال نہیں، ہر شخص چند الفاظ کو جمع کر کے ایک خاص وزن کے ساتھ انہیں پیش کر سکتا ہے، لیکن شعر دراصل اس سے ماورا کچھ اور چیز ہے۔ شعر نام صرف عروض و قافیہ کی پابندی کا نام نہیں، بلکہ اس میں ہم کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ:-

۱۔ زبان یا محاورہ کا صحیح استعمال ہوا ہے یا نہیں۔

۲۔ مفہوم رکیک و سخیف یا پامال تو نہیں ہے۔

۳۔ الفاظ و تراکیب میں غلطی یا ثقل یا تنافرِ صوتی تو نہیں پایا جاتا۔

۴۔ جس مفہوم کو ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ پوری طرح ادا ہوا یا نہیں۔

۵۔ اسلوب بیان میں کوئی ندرت و تازگی ہے یا نہیں۔

۶۔ اظہار خیال میں تصنع و تکلف تو پیدا نہیں ہوا۔

۷۔ کوئی تعبیر و توجیہہ بے محل تو نہیں کی گئی۔

۸۔ تشبیہ و استعارہ سریع الانتقال الی الذہن ہے یا نہیں۔

۹۔ کوئی شاعرانہ ادعا بغیر ثبوت کے تو نہیں رہ گیا۔

۱۰۔ غلو و مبالغہ سے اگر کام لیا گیا ہے تو اس میں کوئی ظرافت پائی جاتی ہے یا نہیں۔

۱۱۔ کوئی بلند و عمیق جذبہ ظاہر کیا گیا ہے یا نہیں۔

۱۲۔ عروض و قافیہ کے لحاظ سے تو اس میں کوئی غلطی نہیں پائی جاتی۔

الغرض شاعری محض الفاظ کا کھیل نہیں، بلکہ اس کے لئے خاص ذوق اور بڑی کاوش و مشق کی ضرورت ہے۔"

نیاز

نیاز آخر الزماں

ڈاکٹر اسلم فرخی

یاد ش بخیر۔ ہوش سنبھالنے کے بعد جس چیز نے پہلے پہل اپنی طرف متوجہ کیا وہ نگار کی مختلف جلدیں تھیں جو کتابوں کی الماریوں میں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ مشق ستم کے لئے انہیں کو منتخب کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوا۔ علمی مضامین تو دسترس سے باہر تھے لیکن افسانوں نے تخیل میں گدگدی ضرور کی آج بھی ذہن میں ان افسانوں کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ اس زمانے میں نیاز صاحب اور مجنوں گورکھپوری بڑی تندہی سے افسانے لکھ رہے تھے میں بہت مدت تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ نگار کے ہر شمارے میں نیاز صاحب اور مجنوں کا افسانہ شامل ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ ڈائری کا ایک ورق (چاند کا سفر) ہو یا شرلاک ہومز کی کہانی کی تلخیص، "نقاب اٹھ جانے کے بعد" ہو یا "ایک شام کا انجام"۔ آہستہ آہستہ یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ نیاز صرف افسانہ نگار ہی نہیں سخن سنج اور سخن شناس بھی ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ادب کے مزاج داں ہیں، مومن کے شیدا اور بیدل کے عاشق ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کا ذوق جمال "نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست" میں حسن و نزاکت کی وہ جھلک ڈھونڈھ لیتا ہے جہاں تک دوسروں کی رسائی نہیں ہوتی پھر یہ بھی اندازہ ہوا کہ مذہب کے سلسلے میں ان کا انداز فکر بڑا انوکھا اور باغیانہ ہے۔ "فراست الید" اور "ترغیبات جنسی" سے یہ احساس ہوا کہ وہ وقت کو قتل کرنے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا فن دراصل نئی اور انوکھی بات کہنے کا فن ہے۔ انہیں عام سطح سے ہٹ کر نئی بات کہنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ ان کی طرز فکر میں بڑی انفرادیت پائی جاتی ہے جو ان کے اسلوب میں پوری طرح نمایاں ہے۔ "ملاحظات" نے انہیں ایک معتقد رصحافی کے روپ میں پیش کیا۔ "استفسارات" نے مذہبی عالم کا احساس بیدار کیا۔ "تاج بہترین عمارت ہے" اور "ابن یمین اور حافظ کے موازنے" نے روش عام سے گریز کا خیال پیدا کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ فیصلہ مشکل ہے کہ نیاز کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں "چہ قیامت کہ نمی رسی زکنار ما بکنار ما" نیاز کی شخصیت ایک ایسا ترشا ہوا ہیرا ہے کہ اس کا جو رخ بھی روشنی کے سامنے آجاتا ہے "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است"

نیاز ہیجان شباب کے علمبردار۔ شعور جمال کے ترجمان اور روایات کے باغی ہیں۔ کار و بار دلداری میں غالب کی طرح ان کا مسلک یہ رہا ہے کہ ؎

جب کرم رخصت گستاخی و بیباکی دے کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

اُن کی ابتدائی زندگی پر رعنائی خیال اور رومان پسندی کا گہرا نقش ہے۔ انہوں نے ٹیگور سے بھی اثر قبول کیا ہے اور ابوالکلام آزاد کی شعلہ بیانی اور جوش و خروش نے بھی انہیں کچھ کم متاثر نہیں کیا۔ نیاز نے دونوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے افسانوں میں دونوں رُخ ملتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے فن میں نیاز پر یلدرم کا بھی گہرا اثر ہے۔ یلدرم کی روایت ان کے یہاں پوری طرح نمایاں ہے۔ یلدرم کی طرح نیاز بھی اپنے افسانوں میں زندگی کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کرنے کے قائل نہیں وہ زندگی کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں جس میں عمل کے بجائے خیال کی حکمرانی ملتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر زندگی کو جمالیاتی شعور کے سہارے گزارنا چاہتا ہے اس میں مسائل حیات سے نبرد آزما ہونے کا ولولہ نہیں۔ یہ محبت کی آزادی کا طلب گار ہے اور اسی کو زندگی کا سب سے بڑا حق سمجھتا ہے۔ رومانوی انتہاپسندی نیاز کا مزاج اور اُن کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس انتہاپسندی کو بروئے کار لانے کے لئے نیاز نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ سر درجہ شاعرانہ ہے اس میں عجم کا حسنِ طبیعت، آزاد کی رنگینی اور شبلی کا جوش و خروش ملتا ہے۔ میں یہاں اس بحث کو نہیں چھیڑوں گا کہ نثر کا منصب تحلیل و تجزیہ ہے یا تخیل میں گم ہو کر ندی کرنا۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ نیاز کا اسلوب اُن کے دور اور روایات کا آئینہ ہے جس میں وہ عصر پوری طرح جھلکتی ہے۔

نیاز کے افسانوں کا دوسرا رُخ ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے خلاف احتجاج تھا جو مذہب کو اپنی ہوس رانی کا وسیلہ بنائے ہوئے تھے اس احتجاج میں نیاز کی شخصیت کا جو پہلو ہمارے سامنے آتا ہے وہ آزادی کی جدوجہد سے ہم آہنگ ہے۔ آزادی کا مطلب صرف سیاسی آزادی نہیں ہے۔ فکر و نظر کی آزادی سیاسی آزادی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ رسم و رواج کی غلامی، روایتوں کی پابندی، قدیم اندازِ فکر کی تقلید انسانی عمل کو سلب کر لیتی ہے اور اسے آئینہ خانۂ اجداد سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ نیاز نے اسی رجحان کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ پُرزور اور شدید احتجاج۔ یہ نقاب اُٹھ جانے کے بعد بھی اس احتجاج کی شدت اب بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہاں نیاز کے شاعرانہ اندازِ بیان میں غضب کی تلخی اور تلوار کی کاٹ ملتی ہے۔ وہ طنز کے حربوں سے کام لینے کے اہل ہیں اُن کی چٹکیوں نے 'صاحبانِ جبّہ و عمامہ' کے دلوں میں جو بَل ڈالے ہیں اُن کا شمار ممکن نہیں۔

افسانے کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نیاز نے ایک جگہ لکھا ہے "میں آپ کو بتاؤں کہ افسانے کے ضروری اجزا کیا ہیں۔ ایک کسی واقعہ کا بہ حیثیت واقعہ ہونے کے واقعیت کا پایا جانا۔ دوسرے نفسیاتی طور پر کسی کردار یا سیرت کو نمایاں کرنا جسے انگریزی میں CHARACTERISATION کہتے ہیں۔ تیسرے پلاٹ کو اتنے اور ایسے اجزا میں تقسیم کرنا کہ پڑھنے والے کو ایک سے زائد خلا خود اپنے ذہن سے پُر کرنا پڑیں۔ چوتھے ہلکا سا مزاح، خواہ وہ الفاظ سے پیدا کیا جائے یا مفہوم سے۔ اگر پلاٹ میں کوئی کیفیت رومان کی پیدا کر کے تھوڑا سا تمثیلی رنگ DRAMATIC TOUCH دے دیا گیا تو اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ کسی ایک مسئلے پر مکالمے میں صفحات کے صفحات رنگین کر دینا خلافِ آئینِ افسانہ نگاری ہے — یہ درست ہے کہ بہترین افسانے وہی ہوتے ہیں جن میں ٹریجڈی کا عنصر غالب ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو ایک مستقل عذاب کی طرح سر پر نازل کر دیا جائے کہ ایک خاندان کی تباہی دکھانے پر آئے تو باپ کو ہیضہ میں مبتلا کر کے فنا کر دیا۔ ماں کو طاعون سے ہلاک کرا دیا، بھائی کو سانپ سے ڈسوا دیا اور بہن کو کنویں میں ڈھکیل کر ختم کر دیا۔"

مختصر افسانے کے اصول سب سے پہلے ایڈگر ایلن پو نے وضع کئے تھے۔ اسی نے فن کی حیثیت سے اسے رواج بھی دیا۔ پو کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اور ان کی تحلیل سے مختصر افسانے کی بہت سی اصطلاحیں وجود میں آئی ہیں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ واقعیت

کردار نگاری، حقیقت اور اثر آفرینی کے با وصف اگر افسانے میں خواب و حقیقت کا وہ امتزاج نہیں جو ادب کی روح ہے تو افسانہ افسانہ نہیں محض داستان ہوگا۔ تجربہ گہرائی، فضا اور معنویت کا امتزاج افسانے کو حسن بخشتا ہے اور اشاریت اسے زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔ نیاز نے اپنے تبصرے میں قالب کی رنگ آمیزی کو تو مدنظر رکھا ہے لیکن روح کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی ہے اصول اپنی جگہ پر، اصولوں کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے مگر دنیا کے بہترین فن پارے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے اصولوں سے کچھ اوپر بھی نکل جاتے ہیں۔ تاہم یہ کیا کم غنیمت ہے کہ نیاز نے افسانہ نگاری کے اجزا واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج ہم ان سے متفق نہ ہوں تو ان کی اہمیت اور تاریخی حیثیت پر کیا اثر ہوسکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔

نیاز کی افسانہ نگاری اب اردو افسانے کے مرقعے میں تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ خیالی دنیا میں زندگی گزارنے اور جمال کی لذتوں میں گم رہنے کا وہ دور ختم ہوگیا جس نے ان افسانوں کو وجود بخشا تھا۔ مسائل حیات کی پیچیدگیوں اور زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے ہم سے وہ احساس چھین لیا جو ان افسانوں سے مسکرا اٹھتا تھا اور کبھی کبھی کانپ بھی جاتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیاز کے افسانے یکسر داستان پارینہ بن گئے۔ ان کی ادبی اور تاریخی اہمیت میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں۔ نیاز نے اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو ادب کا کوئی طالب علم ان کے اس کردار سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ نیاز کے افسانے رومانوی دور کی وہ یادگار ہیں جنہیں ماضی کا خوش گوار سرمایہ کہنا بجا ہے۔

نیاز کا نام اردو تنقید میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ جذباتیت اور رومانیت ان کی تنقید کے جزو اعظم ہیں۔ وہ ادب کو تاثرات کا فنی اظہار سمجھتے ہیں اور اپنی تنقید میں صرف ان تاثرات کا اظہار کرتے ہیں جو کوئی تخلیق ان کے دل و دماغ پر چھوڑ جاتی ہے۔ ادب ان کے نزدیک تفریح طبع اور ذاتی لذت اندوزی کا مترادف ہے۔ اس کا تمام تر تعلق وجدان سے ہے چنانچہ وہ تنقید کا مقصد مسرت و مسرت کی ان لہروں کی تصویر کشی سمجھتے ہیں جو کسی تخلیق کی وجہ سے ان کے دماغ میں بیدار ہوتی ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے "میں نے اس مجموعہ کا مطالعہ بالاستیعاب تو کیا نہیں اور نہ شعر و شاعری کی کتابیں بالاستیعاب پڑھنے کی چیزیں ہیں لیکن جب کبھی فرصت نصیب ہوئی تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی نظم کو دیکھا ہو اور کاروبار کی الجھنوں اور علائق دنیا کے مخمصوں سے علیحدہ ہوکر تھوڑی دیر کے لئے اس فضا میں نہ پہنچ گیا ہوں جسے بجز ایک حقیقی شاعر کے کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں کرسکتا۔ لیکن جب ان کی کوئی خالص ادبی نظم سامنے آگئی تو یہ کیفیت زیادہ شدید محسوس ہوئی۔ مثلاً ایک دن شام کو میں گھوڑ دوڑ سے واپس آیا تو بہت مضمحل تھا۔ اضمحلال ہارنے کا بھی اور دن بھر خراب و خستہ پھرتے رہنے کا بھی۔ واپس آکر اس مجموعے کو اٹھا لیا۔ فہرست میں 'رنگین تیتری' پر نظر جمی اور جب ورق الٹ کر اس کو پڑھا تو بڑی حد تک کوفت دور ہوگئی" اس بیان سے بہت سی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ نیاز کا تنقیدی رجحان تو خیر واضح ہو ہی جاتا ہے لیکن یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو کوفت دور کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں اور مظاہر حسن کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔

نیاز اپنے تنقیدی رجحانات میں لان جائی نس، آسکر وائلڈ، اسپنگرن، والٹر پیٹر اور کروچے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اسپنگرن اور وائلڈ کے حوالے بھی ایک آدھ جگہ ان کے یہاں ملتے ہیں۔ ان سب کا ان کی تنقید پر گہرا اثر ہے لیکن نیاز محض ان کے کاسہ لیس نہیں۔ انہوں نے اپنی انفرادیت پوری طرح نمایاں کیا ہے۔ مغرب کے اثرات کے ساتھ ساتھ انھوں نے تنقید کے مشرقی

انداز کو بھی نظر میں رکھا ہے اور غلط یہ لفظ۔ وہ مضمون تراء یہ بندش اسست کے رجحان سے ذاتی پسند و ناپسند یدگی کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ نیاز کی تنقید خشک مباحث کا مجموعہ نہیں۔ وہ اپنے تاثرات کے اظہار میں جرأت گفتار سے بھی کام لیتے ہیں اور ایک مخصوص فضا پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں رنگینی بھی ہے اور کشش بھی۔ آپ اُن کی رائے سے اختلاف ہی کیوں نہ کریں لیکن اس رائے کے خلوص اور پُرکاری میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

نیاز اردو کے پہلے قابل ذکر تاثراتی تنقید نگار ہیں۔ اگرچہ انہوں نے فن تنقید پر کوئی مبسوط کتاب نہیں لکھی لیکن ان کی عملی تنقید کے کامیاب نمونے 'انتقادیات' میں جابجا نظر آتے ہیں۔ عملی تنقید ہی کے ضمن میں انہوں نے اپنے تنقیدی رجحانات کی وضاحت بھی کی ہے اور جمالیات کے رچے ہوئے احساس کو واضح کیا ہے۔ اسی شعوری رجحان نے انہیں مومن کا پرستار بنا کر یہ کہنے پر مجبور کیا کہ "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (باستثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اُٹھالے جاؤ۔" اس مختصر سے بیان سے نیاز کی پوری شخصیت نمایاں ہے۔ صرف ان کی شخصیت ہی نہیں ان کے عہد کی روح بھی اس بیان میں بے نقاب نظر آتی ہے۔ بجنوری نے اپنا غالب والا مضمون اسی نوع کے ایک چونکا دینے والے جملے سے شروع کیا ہے اور کلیم الدین احمد نے 'اردو تنقید پر ایک نظر' کا آغاز بھی ایسے ہی معنی خیز جملے سے کرنا مناسب سمجھا ہے۔ (یہ دوسری بات ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقید کا انداز تاثراتی نہیں ہے) حالی نے غالب کو 'حیوان ظریف' کہہ کر اپنی تنقیدی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ نیاز نے نظیر اکبر آبادی کو 'چھچھلے باز' کہہ کر کم و بیش یہی کیفیت پیدا کی ہے۔ 'حیوان ظریف' ہو یا 'چھچھلے باز' دونوں میں تاثر کی شدت بہت نمایاں ہے۔

نیاز کی تنقید کا مشرقی رُخ بھی اسی 'تاثر پسندی' کا نتیجہ ہے۔ اُن کے بقول "جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اُس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا اور وہ ذہن سامع تک ان کو پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ بیان خواہ حسن و عشق کا ہو یا نہر کی پن چکی کا اس سے غرض نہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں" نیاز کا یہ بیان بہت اہم ہے۔ سہل انگاری کے اس دور میں جبکہ زبان کے اصولوں سے ناواقفیت بڑھتی جاتی ہے اس بیان کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اپنے معاصر شعرا کے کلام میں انہوں نے جن لفظی اور معنوی اسقام کی نشاندہی کی ہے وہ یقیناً ایک گراں قدر کارنامہ ہے جسے نیاز کے علاوہ کوئی دوسرا نقاد انجام نہیں دے سکتا تھا یہ دوسری بات ہے کہ اس سے بہت سے آبگینوں کو ٹھیس پہنچی ہے حالانکہ نیاز کا مقصد آبگینے کو کوہ سے عرض گراں جانی کیلئے قابل بنانا تھا۔ شاید 'منظومات ناطق' اور 'سرود زندگی پر ایک نظر' میں یہ مقصد کسی حد تک پس پشت جا پڑا ہے مگر بہت سے مضامین محض تفنن طبع اور زور قلم کے اظہار کے طور پر بھی تو لکھے جاتے ہیں۔

لفظی گرفت نیاز کی تنقیدی صلاحیتوں اور علم زبان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کارنامے کے لئے جس تبحر علمی کی ضرورت پیش آتی ہے وہ معدوم ہوتا جارہا ہے شاید یہ رجحان جس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں نیاز اور ان کی نسل کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔

نیاز کی تنقید کا مبسوط جائزہ میرا مقصد نہیں۔ ایک مختصر سے مقالے میں اس کی گنجائش بھی نہیں۔ میرا مقصد نیاز کی ادبی

شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنا ہے۔ اس لئے بہت مجبوراً اشاروں سے کام لینا پڑا ہے۔ نیاز کی صحافت کو بھی یہاں معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا اگرچہ اس میں بھی ادبی چاشنی اور جراءت فکر پائی جاتی ہے لیکن یہ ان کا طرۂ امتیاز نہیں وصف اضافی ہے۔ مکتوب نگاری یقیناً ان کا اہم ادبی کارنامہ ہے۔ نیاز کے مکاتیب میں شوخی دلبری اور انداز کج کلاہی دونوں کا اثر ہے۔ ان میں شدت بھی ہے۔ ایک بیباک شخصیت کا نعرۂ مستانہ بھی اور رہ و رسم دل فروشی کا بانکپن بھی۔ مکاتیب نیاز سے اسلوب کی وہ بے تکلفی اور مسکراہٹ ہیں جس میں ان کی شخصیت کا ناز و نیاز دونوں نمایاں ہیں لیکن بت شکنی کیلئے وہ پہلے صنم تراشتے ہیں ان کی پرستش کرتے ہیں اور آخر میں انہیں توڑ دیتے ہیں رہ گیا ان کا مذہبی انداز فکر تو اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں پہونچتا۔ من و یزدان کی بحث میں کسی دوسرے کا دخل دینا یوں بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ استفسارات مذہبی کے سلسلے میں تحقیق۔ تبحر اور جرأت مندی کی داد ضرور دی جا سکتی ہے لیکن ان کی شوخی کے سلسلے میں تبسم زیر لب کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

نیاز کی ادبی شخصیت کا اہم ترین پہلو ان کا اسلوب ہے۔ وہ اردو کے صاحب طرز انشا پردازاور منفرد اسلوب کے مالک ہیں ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک ان کی انشا پردازی نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے (ان کا یہ فیض اب بھی جاری ہے) اس میں تدریجی ارتقاء بھی ملتا ہے اور ان کی بیباک شخصیت کا پر تو بھی۔

شوپن ہاور نے اسلوب کو خیال کا سایہ قرار دیا ہے۔ ماہر جمالیات کروچے کا خیال یہ ہے کہ جب وجدان اور اظہار میں مماثلت پیدا ہو جاتی ہے تو اسلوب وجود میں آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ واضح خیال کا موزوں الفاظ میں اظہار اسلوب ہے یا اسلوب معنی کی موزوں تفصیل ہے لیکن اس دعوے کو مان لینے کے بعد ندرت بیان اور بانکپن کا تصور حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے اور شخصیت کے عنصر کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اسلوب محض خیال کا موزوں الفاظ میں اظہار نہیں ہے بلکہ اس کو وجود بخشنے والا عنصر طریق فکر کی انفرادیت ہے۔ نیاز کے طریق فکر کی انفرادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی ذہنی سطح فکر کے عام انداز سے بہت بلند ہے۔ وہ رہ و رسم عام سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کے اسلوب میں بھی نمایاں ہے۔ وہ حسن بیان کے قائل ہیں۔ ان کے بیان میں نیاپن بھی ہے، الوکھا پن بھی ہے اور بانکپن بھی۔ مڈلٹن مرے اسی کو انفرادیت حسن قرار دیتا ہے۔

نیاز کے اسلوب کی نشو و نما رومانی تحریک کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں شعریت اور شاعرانہ فضا دونوں موجود ہیں 'شاعر کا انجام' ہو یا 'شہاب کی سرگزشت' 'کیوپڈ و سائکی' ہو یا کوئی اور تحریر سب کی یہی انداز ملتا ہے۔ اس انداز میں غنائی شاعری کی بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اردو میں شاعرانہ نثر کو رواج دینے کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر ہے جن کا اسلوب تمام تر مجازات پر مبنی ہے۔ آزاد کے اسلوب میں گلوں کی خوشبو اور چراغوں کی چمک ہے لیکن وہ تعمیری اظہار سے محروم ہیں۔ نثری حسن بیان کے لئے وضاحت پہلی شرط ہے۔ آزاد اس کا لحاظ نہیں رکھتے اور تخیل کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ نیاز شاعرانہ اور رنگین نثر لکھنے کے باوجود تعمیری اظہار سے محروم نہیں۔ نہ وہ مجازات کے اسیر ہیں بلکہ موقع کی مناسبت سے اسلوب پیدا کرتے ہیں۔ وضاحت التشریح اور تجزیئے کی کوشش کرتے ہیں افسانوں اور ادبی مقالات میں انہوں نے رنگین بیانی اور شاعرانہ حسن و مستی کا اہتمام کیا ہے۔ تنقید میں ان کا اسلوب متوازن، پُر وقار اور سلجھا ہوا ہے۔ نیاز عربی فارسی کے عالم متبحر ہیں۔ فارسی کی خوب صورت ترکیبیں اور عربی کے مشکل الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں مشکل پسندی اور دقت نظر کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ شاعرانہ انداز کا تکلف و تصنع اس کا متقاضی بھی ہے لیکن یہ رجحان آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور اب تو نیاز کا اسلوب نکھر کر بہت سلیس اور رچنتہ ہو گیا ہے۔

نیاز روح عصر سے بے نیاز نہیں ہیں۔ فارسی ترکیبوں اور عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ وہ ایسے لفظ، ترکیبیں اور فقرے بھی

استعمال کرنے میں جو جدید علوم و معاشرت کی وجہ سے ہماری زندگی میں داخل ہو گئے ہیں۔ کسی عہد کو اس کے مخصوص الفاظ کے ذریعہ سے پہچاننا ممکن ہے۔ ہر عہد کے مخصوص الفاظ اس کی روایات اور مزاج کا آئینہ ہوتے ہیں۔ نیازؔ کے اسلوب میں بیسویں صدی کی روایات اور مزاج اس کے مخصوص الفاظ کے ذریعے سے جھلکتے نظر آتے ہیں۔ ان الفاظ کی وجہ سے ان کی مختلف تحریروں کا زمانہ بھی متعین کیا جا سکتا ہے۔ شاعرانہ شوخ نگاری اور اشعار کی پیوندکاری کے باوجود روحِ عصر نیازؔ کے اسلوب میں پوری طرح نمایاں ہے۔

نیاز کا اسلوب ان کی شخصیت کی کشش و وقار اور خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ انھوں نے حیات و کائنات کے ہر مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ہر جگہ اپنے اسلوب سے ایک جنت آباد کی ہے۔ عائشہ خان نے نیازؔ کی انشا پردازی کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ "ایک وہ جس کا تعلق ان کے ادبی مقالات اور ESSAYS سے ہے اور دوسرا وہ جو ان کے مکاتیب کے لئے مخصوص ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر ان کی جنبشِ قلم ہے اور دوسری جنبشِ زبان۔ یعنی ایک جگہ وہ ادب لکھتے ہیں اور دوسری جگہ اسے بولتے ہیں۔ وہ CANVAS کی نقاشی ہے اور یہ FREE HAND SKETCHING میرا خیال یہ ہے کہ ادب بولا نہیں جاتا۔ بول چال کی زبان ادبی زبان سے الگ ہوتی ہے۔ ادبی مقالات اور مکاتیب دونوں میں نیاز کا انداز MATTER OF FACT نہیں شاعرانہ ہے دونوں کا اسلوب ادبی ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ ایک کا CANVAS وسیع ہے اور دوسرا Miniature Painting ہے۔ نیازؔ نے محنت دونوں پر کی ہے اور دونوں میں انفرادیتِ حسن برقرار رکھی ہے۔

نیازؔ کے اسلوب کی ایک اور خصوصیت ان کی شگفتگی ہے۔ وہ قہقہہ تو نہیں لگاتے مگر ان کی مسکراہٹ بڑی بھرپور اور ان کی طنز بہت گہری ہوتی ہے ان کی محبت اور نفرت دونوں عمیق ہیں۔ دونوں کے اظہار میں وہ شگفتگی اور زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ اس شگفتگی نے ان کے اسلوب میں جاذبیت اور دلآویزی پیدا کی ہے۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ نیاز طرحدار انشا پرداز ہیں ان کی طرحداری میں آن بھی ہے اور مسکراہٹوں کی بجلیاں بھی۔ اور بھی بہت کچھ ہے مگر بقول بیدلؔ

.. نام او نمی دانم کہ چیست

نیازؔ، سرسید، آزادؔ، حالیؔ اور شبلیؔ سے براہِ راست متاثر ہونے والی نسل کے آخری یادگار نمایندے ہیں۔ ان میں جامعیت اور بزرگانِ سلف کا علم و فضل بھی ہے اور نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا شدید احساس بھی۔ جامعیت کے رجحان نے انہیں فراست الیہ اور ترغیبات جنسی لکھنے پر مجبور کر کے اردو ادب کا GENERAL MERCHANT بنانا چاہا تھا مگر وہ اس دام سے بچ نکلے۔ یہ بھی کوئی کم خوبی نہیں۔ میں نے نیازؔ کو آخر الزماں کہا صرف اسی وجہ سے ہے کہ یہ جامعیت، رنگینی، علم و فضل، خود اعتمادی اور جرأتِ گفتار انہیں کی نسل کا خاصہ تھی۔ ہمہ گیری کا دور ختم ہو گیا تو پھر نیاز کو آخر الزماں نہیں تو اور کیا کہا جائے۔

آج سے پچیس سال پہلے نیاز آخر الزماں کی تحریر انبساطِ ذہنی کا سبب تھی آج بھی ان کی تحریر تازہ بتازہ و نو بنو کا انتظار رہتا ہے۔ انبساطِ ذہنی کے لئے بھی اور بصیرت کے لئے بھی۔ "بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر" نئی نسل کا یہ اعتراف نیاز آخر الزماں کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

نیاز کی ادبی شخصیت اور نثر نگاری

پروفیسر حنیف فوق

علامہ نیاز فتحپوری کا نام لیتے ہی ایک بھاری بھرکم شخصیت کا تصور ابھرتا ہے۔ کیوپڈ و سائکی، اصحاب کہف، مالہ وما علیہ، نقشہائے رنگ رنگ اور فراست الید کے نیاز کی شخصیت میں بڑی رنگارنگی ہے۔ بیدل کی شاعری پر جھومنے والے نیاز ہی کے قلم سے ترغیبات جنسی بھی لکھی گئی ہے۔ کہاں یہ کیفیت کہ

همه عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما
چه قیامتی که نمی رسی ز کنار ما به کنار ما

اور کہاں یہ عالم کہ جنسیات کے رموز سربستہ کھل کر بیان ہو رہے ہیں۔ شہاب کی سرگزشت اور ایک شاعر کا انجام، افلاطونی محبت کی داستان ہیں تو جمالستان اور نگارستان میں جسم کی کشش کی جمالیاتی جھلک ملتی ہے۔ نیاز کی تحریر کی بڑائی یہ ہے کہ اس میں دورنگی کے باوصف شخصی توانائی کے عناصر ملتے ہیں۔ نیاز کی ادبی شخصیت میں یونان کا جلال اور ایران کا جمال یکجا ہو گیا ہے۔

نیاز صاحب نے اردو نثر میں عقلیت پسندی کے چراغ روشن کئے ہیں لیکن ان کے ادبی فیصلوں میں مطلق العنان آمریت کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ دراصل ان کی تحریریں ایک دور کی مختلف اور بعض اوقات متضاد ذہنی سمتوں کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نیاز کی شخصیت میں مختلف تہذیبی عناصر کے امتزاج سے نئی آن بان پیدا ہو گئی ہے۔ نیاز صاحب سے جنہیں نیاز کا شرف حاصل ہوا ہے وہ تو ان کی جمالیاتی شان رکھنے والی جلالی شخصیت کے گرویدہ ہوئے ہی ہیں، وہ لوگ بھی جو صرف تحریر کے ذریعہ انہیں جانتے ہیں ان کے تبحر علمی، ان کے مزاج کی وارستگی اور ان کے شعور کی آراستگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ جمالیات کا دم بھرنے والے نیاز نے مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور ان کے جریدہ نگار نے عقل و استدلال کی راہیں بھی ہموار کیں۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب معاشرہ کی سخت قیود سے آزادی کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ اس میں صنفی آزادی اور ذہنی آزادی دونوں شامل ہیں۔ عورت کو "سحر متشکل" قرار دینے والے رومانیت پرست نیاز ہی نے من و یزداں بھی لکھی ہے۔ رومانیت اور معقولیت کا یہ امتزاج نیاز کی نثر نگاری کی ایک اہم

خصوصیت ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری اردو نثر کی دو ایسی شخصیتیں ہیں جن کی ذات کے شکوہ سے ان کی نثر نگاری کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ مولانا ابوالکلام کی نثر کے عقب میں سیاسی تحریکات اور مذہبی معتقدات کا جلوہ نظر آتا ہے اور نیاز کی نثر کے پس منظر میں ادب کے رچے ہوئے کلاسیکی شعور اور عقلیت پسندی کے رجحان کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن دونوں نثر نگاروں کی بڑائی اس امر میں ہے کہ ان عوامل کو انہوں نے اپنی تیکھی شخصیت کی آنچ دے کر پگھلایا اور پھر اپنے مخصوص طرزِ اظہار میں ڈھالا ہے۔

ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری دونوں صاحب طرز ہیں۔ دونوں کے طرزِ اظہار پر ان کی توانا شخصیتوں کی گہری چھاپ ہے۔ ابوالکلام آزاد مذہب سے رجوع کرتے ہیں اور نیاز فتحپوری عقلیت سے۔ لیکن دونوں پر مذہب کے گہرے اثرات ہیں۔ ان اثرات نے ابوالکلام کو اپنے دور کا سیاسی امام بنایا تو نیاز کو مذہب سے اجتہادی طور پر الجھنا سکھایا۔ دونوں کے یہاں فکری اختلاف کے باوجود ثقافتی پس منظر کی ہم آہنگی ملتی ہے اور اس تہذیبی ورثہ کو سمجھے بغیر نیاز اور ابوالکلام دونوں کی شخصیت کا مطالعہ نامکمل رہتا ہے۔

نیاز نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مذہبیات سے لے کر ہاتھ کی لکیروں اور فحاشیات تک مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس انبارِ تحریر میں کنکریاں بھی ہیں اور موتی کی لڑیاں بھی۔ لیکن ان کی نثر میں جو کاٹ اور بانکپن کی جو خصوصیات ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو نثر نگاری کو نیاز نے اپنی شخصیت کا تیکھا پن بخشا ہے۔ نیاز کی ادبی تنقید کو تنقید کی خام صورت کہا جا سکتا ہے لیکن اس کی دلکشی اس امر میں نہیں کہ نیاز نے کیا کہا ہے بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کیسے کہا ہے اور بعض اوقات اپنے اندازِ تحریر ہی سے نیاز نے تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ قرۃ العین کے افسانوں کے اولین مجموعہ "ستاروں سے آگے" پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز نے لکھا تھا کہ "معلوم ہوتا ہے وہ بہت اتراترا کر لکھتی ہیں"۔ یہ جملہ اس دور کی قرۃ العین کی سچی نمائندگی کرتا اور کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔

نیاز نے ہمیں ادب یا زندگی کا کوئی خاص تصور نہیں دیا اور فکری طور پر اردو ادب کو کچھ بہت زیادہ سرمایہ عطا نہیں کیا لیکن انہوں نے نئی سمتوں کی نشان دہی ضرور کی ہے اور فکر کو نئی راہوں سے آشنا ضرور کیا ہے اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کے تصورات میں ذاتی فکر کی آمیزش کم ہوتے ہوئے بھی ان کے مطالعہ کی وسعت ان کے ادبی ذوق کی شائستگی اور ان کی گوناگوں شخصیت کی رنگا رنگی تحریر کی ہر سطر میں جھلکتی ہے۔ نیاز کی نثر کی دل آویزی اس امر میں ہے کہ اس کے پیچھے ایک عمری ادبی زندگی کا کیف و کم ملتا ہے۔ ان کی نثر کی آراستگی تہذیبی خصوصیات رکھتی ہے اور نثر نگاری کے تصورات بدل جانے کے باوجود اس کی دلکشی قائم رہتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو نثر نگاری کے ایوان زر نگار میں نیاز کی نثر ایک مضبوط اور مستحکم ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔

نگار کے مخصوص کالم اور نیاز فتحپوری

شاہد عشقی ایم اے

برصغیر ہند و پاکستان میں گذشتہ نصف صدی نے کتنے ہی ماہناموں کو جنم دیا، پروان چڑھایا اور دفنا دیا۔ کتنے ہی ماہنامے بلند بانگ دعووں کے ساتھ افق صحافت پر طلوع ہوئے، مگر زیادہ دیر تک ان دعووں کو قائم نہ رکھ سکے۔ کتنے ہی خاص نظریات کے حامل ہونے کی بنا پر مقبول عوام ہوئے اور ان نظریات کے باوجود کے ساتھ ساتھ اپنے وجود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ کتنے ہی معروف ادیبوں کے حلقہ کے سہارے میدان ادب میں بڑے تزک و احتشام سے اترے اور ان کا سہارا چھوٹتے ہی بے یار و مددگار رہ گئے۔ نگار ان ماہناموں سے ہمیشہ منفرد اور مختلف رہا ہے۔ نگار کے قارئین نگار کو صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ اس کے مدیر نیاز صاحب ہیں۔ نگار کے نیاز نمبر کا اعلان تو آج ہوا ہے لیکن میں تو نگار کے ہر شمارہ کو نیاز نمبر ہی سمجھتا رہا ہوں۔

نگار کے مستقل ابواب نیاز صاحب ہی کی تحریر یا تحریر کی بازگشت ہوتے ہیں۔ ملاحظات کے عنوان سے اداریئے میں نیاز صاحب کبھی دوسرے مدیروں کی طرح ادبی کساد بازاری یا خریداروں اور ادیبوں کے عدم تعاون کا رونا نہیں روتے بلکہ ایک جامع اور مکمل سیاسی جائزہ یا بصیرت افروز مقالہ سپرد قلم کرتے ہیں۔ باب الانتقاد کسی بھی کتاب پر طویل تبصرہ کی صورت میں کھلتا ہے۔ باب المراسلہ و المناظرہ غماز ہے کہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد اس میں نیاز صاحب ایسے مضامین بھی شائع کرنے سے گریز نہیں کرتے جو ان کے انداز فکر کے یکسر خلاف ہوں۔ مطبوعات موصولہ کے تحت کتابوں پر مختصر تبصرے ہوتے ہیں۔ ما لہا و ما علیہا کا باب کسی بھی شاعر کے کلام پر بے لاگ عملی تنقید سے متعلق ہوتا ہے اور باب الاستفسار گویا دبستان کھل گیا، ہر قسم کے سوال و جواب کے لئے مخصوص ہوتا ہے، اور نگار کا سب سے دلچسپ اور مقبول باب رہا ہے۔ یہ سارے مستقل ابواب، جن پر نیاز صاحب کی انفرادیت کے گہرے نقوش مرتسم رہے ہیں، نگار کے اجزائے لاینفک ہیں، اور ان مستقل ابواب نے نگار کو ایک ایسا انداز دلبری عطا کیا ہے کہ وہ اسم بامسمیٰ محبوب خلائق بن گیا ہے۔

سرسید نے مسلمانوں کی زبوں حالی اور سیاسی احساس کمتری کے پیش نظر انگریز دوستی کی مصلحت کو مسلمانوں پر مسلط کیا، اور حالی، نذیر احمد، آزاد وغیرہ نے اسی مشن کے تحت، قومی و ملی احیاء کو کسوٹی بنا کر مقصدی ادب کی ساخت شروع کی تو لوگوں نے ابتدا میں اس ادب کا احترام کیا، لیکن پند و نصائح کے اس دفتر سے اکتا کر بہت جلد جماہیاں لینے لگے۔ اخلاقی اور افادی قدریں اگر ادب پر غالب آجائیں تو ادب اشتہار بن جاتا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے بعد ادیبوں میں وہ جذبہ بھی نہ رہا صرف اشتہار سازی کا آسان فن ان کے ہاتھ آگیا اور اس فن کے سہارے بے مزہ ادیبوں اور نام نہاد مصلحین ادب کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے نثر میں مولود شریف اور نظم میں نوحہ نامہ قسم کا ادب پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہی وہ دور تھا جب اس اکتا دینے والی میکانکیت اور نام نہاد قومی و ملی نظم و نثر کے ردعمل کے طور پر ادب میں لکھنے کے قابل رومانوی تحریک شروع ہوئی، اور نثر میں نیاز، یلدرم، ابوالکلام آزاد اور نظم میں اقبال، جوش اور اختر شیرانی نے اس بے کیف جمود کو توڑا۔

یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ جہاں تک دور رس اثرات کا تعلق ہے نثر میں اس تحریک کے سربراہ نیاز صاحب ہی تھے، اور جن ذرائع نے اس جمود کو توڑنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا، وہ ان کے ناول، افسانے یا تنقیدیں نہیں، بلکہ نگار کا باب الاستفسار تھا۔ نیاز صاحب اظہار رائے میں

بھی مصلحت نہیں برتتے ——— اور دلیلوں میں منطقی اور سائنسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں جو سب کو مطمئن اور متاثر کر دیتا ہے۔ انہیں خوبیوں کی بنا پر انہوں نے لوگوں کے ذہنوں میں آزادیٔ فکر کی شمعیں روشن کیں اور انہیں آزادیٔ رائے کی جرأت عطا کی۔ نگار گذشتہ بیالیس سال سے اس محاذ پر مورچوں پر مورچے سر کرتا رہا ہے اور قارئین نگار اسٹنٹ فلم کے تماشبینوں کی طرح مسحور و مبہوت ہر فتح پر تالیاں بجاتے رہے ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں جب کہ کانگرس، گاندھی اور اہنسا ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے نزدیک مقدس اور برگزیدہ نام تھے، گاندھی جی کے اہنسا کے فلسفہ کے متعلق نیاز صاحب کا یہ انکشاف کہ "میں جہاں تک گاندھی جی کی زندگی اور ان کے مقصد پر غور کرتا ہوں، انہیں فلسفۂ تجابرا منہ (Stoie) کا پیرو پاتا ہوں" ایک جرأت مندانہ بیان تھا،

اسی طرح معجزۂ شق القمر پر جو مسلمانوں میں عقیدہ کی سی صورت اختیار کئے ہوئے ہے، ان کا حقیقت افروز بیان کہ "جتنی احادیث اس واقعہ کے متعلق بیان کی جاتی ہیں سب کی سب موضوع ہیں اور ان میں ایک بھی درایتاً قابل قبول نہیں" کچھ کم نزاعی نہیں۔

باب الاستفسار کے نیاز روح کی بقا کو نہیں مانتے، حشر و نشر، عذاب و ثواب، جنت و دوزخ کے معتقد نہیں ہر چیز کو جدید سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی طرح قاری کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔ تعدادِ ازدواج یا برتھ کنٹرول جیسے نزاعی اور نازک مسائل کو وہ بڑی آسانی سے، مذہبی طور پر سلجھانے کے بجائے۔ خالص معاشرتی اور معاشی نقطۂ نظر سے سمجھا دیتے ہیں اور مفکرین و مصلحین قوم کو ان مسائل کا مجاز و مختار بناتے ہیں کہ ع

مصلحت بین و کار آساں کن

اگر نیاز صاحب ختم نبوت کے قائل ہیں تو اس لئے نہیں کہ خاتم میں "ت" زبر نہیں زیر ہے بلکہ اس لئے کہ علوم و فنون کی ترقی نے اس کی گنجائش ہی نہیں رکھی کہ کسی نبی کی نبوت چل سکے۔

دراصل مغربی تعلیم کے احیاء اور ارتقا کے ساتھ ساتھ مذہب کی اہمیت ایزد کے اس لبادے کی سی ہوتی جا ... ہے جسے وہ اپنے دورِ عروج میں صرف اس لئے کبھی کبھی پہن لیا کرتا تھا کہ اپنے بُرے دنوں کو نہ بھولے جو کسی وقت بھی لوٹ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں نے سوچی ہوگی کہ اسے اس حیثیت پر پہنچانے میں نیاز صاحب کا نہیں تنگ نظر علمائے دین کا ہاتھ ہے جو عقل کو طاقِ نسیاں کے سپرد کرکے، سرمو اختلاف پر کفر کے فتوے تصنیف کرتے رہے ہیں۔

یہ باتیں، تو باب الاستفسار کی روح سے متعلق تھیں، اب رہیں ان کے ٹکڑوں کی باتیں تو یہ بڑی رنگا رنگ ہیں۔ ان استفسارات و جوابات کے موضوعات کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں اگر کہیں گھڑی سازی کی تاریخ اور خوردبینی کتابت پر تحقیقات ملتی ہیں تو کہیں وجود، روح، تناسخ حاضرات اور مسیح کے زندہ ہونے کے سے پیچیدہ مسائل موضوعِ بحث بنے ہیں۔ ایک جگہ اگر خاقانی کے کسی شعر یا ترکی زبان کے سے ادبی اور لسانی مسائل پر بحث ملتی ہے تو دوسری جگہ ضبطِ تناسل، عقل و مذہب اور زلزلہ کے اسباب جیسے سائنسی اور فلسفیانہ موضوعات کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔

باب الاستفسار میں موضوعِ بحث بننے والے موضوعات دُنیا کے تمام علوم و فنون کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور اتنے مختلف النوع علوم کا سرسری مطالعہ بھی یک عمرِ خضر چاہتا ہے، اور نیاز تو ان موضوعات سے سرسری بھی نہیں گزرتے۔ مثلاً ترکی زبان پر کسی صاحب کا جواب دیتے ہوئے ان کا لفظیاتی نکتہ کہ "چونکہ خودداری اور عزت ترکوں کے خمیر میں داخل ہے، اس لئے وہ دوسروں سے خطاب کرتے ہوئے ہمیشہ ان کی عزت کا پورا لحاظ رکھتے ہیں اور بے تکلفانہ گفتگو۔ بھی حد درجہ تصنع آمیز نظر آتی ہے جو دراصل تصنع آمیز نہیں ہوتی" ان کے عمیق مطالعہ اور تیز مشاہدہ پر دال ہے۔

سمرن و تسبیح جیسی روزمرہ کی استعمال کی اشیاء پر، انکی تحقیق کہ "اسلام کو تسبیح سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے اور نہ اس نے کبھی عبادات کیساتھ

اس قسم کی چیزیں رائج کر کے اطاعت کے صحیح مفہوم کو تباہ و برباد کیا، جہاں عام قاری کے لئے چونکا دینے والا انکشاف ہے وہیں نیاز صاحب کے علم کی وسعت کا بھی مظہر ہے۔

باب الاستفسار ہمیشہ سے ایک عام قاری کے لئے انسائیکلوپیڈیا کا کام دیتا رہا ہے جس کے پس منظر میں نیاز صاحب کی شخصیت اتنی قد آور نظر آتی ہے کہ میں سوچنے لگتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر جانسن جنہیں انگریزی داں واکنگ ڈکشنری کہتے تھے، اردو ادب میں جنم لیتے تو نیاز فتحپوری ہوتے۔ نیاز صاحب اگر ایک طرف عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت پر عبور رکھتے ہیں تو دوسری طرف تمام علوم و فنون مروجہ فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، اقتصادیات، نفسیات، جنسیات، سماجیات وغیرہ پر بھی نہایت گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ تمام علوم اسقدر اختصاصی (Specialised) ہوگئے ہیں کہ ایک علم کا جاننے والا دوسرے علم کے بارے میں ایک لفظ بھی کہتے ہوئے جھجکتا ہے، اتنے اعتماد سے علوم و فنون مروجہ پر ان کے انکشافات یقیناً ان کی ہمہ دانی کی دلیل ہیں، اور قاری اس طرح سوچنے میں غلط نہیں کہ اتنی پہلودار شخصیت گذشتہ نصف صدی میں اردو ادب میں کوئی دوسری نہیں گزری۔ علوم و فنون مروجہ پر اسقدر کامل دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ نیاز صاحب کو پیرایہ اظہار پر جو قدرت حاصل ہے اور انداز نگارش کا جو منفرد اسلوب انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ ابوالکلام آزاد کے علاوہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔

نیاز صاحب کے متعلق ایک عام شکایت ہے کہ وہ اپنی بحث میں تعمیری انداز نہیں رکھتے اور قاری کو اپنی جگہ سے متزلزل کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی رہبری نہیں کرتے۔ اسی ضمن میں اور اسی سے متعلق یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ وہ اپنی تحریر میں کسی خاص فلسفہ یا انداز فکر کا پرچار نہیں کرتے۔ یہ شکایت خاصی حد تک بجا ہے اور اقبال کے علاوہ رومانی دور کے تمام شاعروں اور ادیبوں پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن اگر ہم کسی بھی ملک کی رومانی تحریکات کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات واضح ہو جائیگی کہ ان تحریکات کا مقصد ہی شکست و ریخت تھا۔ بوسیدہ عمارتوں کا ڈھا دینا مفاد عامہ کے خلاف نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کے بعد ہی نئی تعمیر کا کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ یہ رومانی دور بھی دراصل اصلاح پسندوں اور نئے ادب کے معماروں کی درمیانی کڑی کی سی حیثیت رکھتا ہے اور از بس ضروری ہے۔ یہ گروہ رسمیات اور از کار رفتہ روایات پر ضرب کاری لگا کر آزادیٔ فکر کی شمع جلاتا ہے اور راہرو کو نئے نئے راستوں کے سراغ دیتا ہے۔ کسی نئے راستہ پر گامزن ہونے کے لئے جو ایک علاحدہ فلسفہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بعد کی بات ہے، اور اس گروہ کے حیطۂ اختیار سے باہر کی شے ہے۔

نیاز صاحب نے جس خوش سلیقگی سے قوم کے باشعور افراد میں آزادیٔ فکر کی شمعیں روشن کیں اسکی مثالیں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں اور نگار کے باب الاستفسار نے اس باب میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

باب الاستفسار کے بعد نگار کا دوسرا باب مالہ و ماعلیہ ہے جو قارئین کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ یہ باب صرف شعری معائب و محاسن سے متعلق ہے، اور شعر کی عملی تنقید کی بڑی کامیاب مثالیں ان صفحات میں ملتی ہیں۔ اس باب کے لئے نیاز صاحب ان شعراء کا انتخاب کرتے ہیں جو ایک حد تک استادانہ حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اور جن کی غلطی آنے والی نسلوں کو دلیل و سند بن کر گمراہ کر سکتی ہے۔ مثلاً نیاز صاحب کے اس معیار پر جگرؔ، جوشؔ، سیمابؔ، اثرؔ لکھنوی، وحشتؔ کلکتوی، فراقؔ، علی سردار، جعفریؔ اور ماہر القادری کی سطح کے شعرا آتے ہیں، نظم معرا اور نظم آزاد کے سلسلے میں ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں اس لئے انہیں موضوع تنقید بنانا ان کے نزدیک تضیع اوقات کے مترادف ہے۔

نیاز صاحب کی تنقید زیادہ تر فن شعر اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے اور گو جدید تنقید کے اعتبار سے یہ انداز نظر زیادہ وقیع نہیں لیکن اس بات سے شاید ہی کوئی جدید ترین ناقد بھی انکار کر سکے کہ شعر و ادب کی بنیادیں فن اور الفاظ پر ہی استوار ہوتی ہیں۔ نیاز صاحب اس باب میں بعض بڑے پتے اور نکتے کی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً ماہر القادری کے ایک مصرع ؎ "خاک بر سر ہیں بادہ ہائے ناب" پر ان کا اعتراض کہ بادہ کی جگہ بادہا (جمع) کا استعمال اس مصرع میں انواع و اقسام کی شرابوں کے لئے استعمال ہوتا معلوم ہوا ہے نہ کہ کثرت کے لئے جو معنی کے اعتبار سے بے ربط ہو جاتا ہے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے شاعر صرف ضرورت شعری کے لئے واحد کو جمع کر گیا ہے، خلاصہ وزن دار اعتراض ہے۔

اسی طرح سیماب اکبر آبادی کے ایک مصرع پر ان کی تصحیح نے یقیناً مصرع کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ مصرع تھا

کبھی مدعا سے گریز پا کبھی مدعا کی تلاش ہے

نیاز صاحب کہتے ہیں کہ سیماب صاحب نے گریز پا، گریزاں یا گریز کے معنے میں استعمال کیا ہے حالانکہ گریز پا صرف ناپائدار کے معنے میں مستعمل ہے جیسے جلوۂ گریز پا۔ چنانچہ اس مصرع کو بآسانی اس طرح لکھا جا سکتا ہے

کبھی مدعا سے گریز ہے، کبھی مدعا کی تلاش ہے

ایک دوسری جگہ علامہ شبلی کے مصرع "از تو نا بد گرہ بند قبا وا کردن" پر ان کی نکتہ سنجی کہ گرہ اور بند دونوں مترادف الفاظ ہیں اس لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ ہی استعمال ہونا چاہیئے، ان کی حاضر طبعی اور دقت نظر کا بین ثبوت ہے۔

جگر مرحوم کا ایک مصرع ہے " ہر لحظہ اک سرور میسر لئے ہوئے "۔ نیاز صاحب کہتے ہیں کہ میسر اگر "لئے ہوئے" سے متعلق ہے تو میسر لینا کوئی محاورہ نہیں اور اگر "سرور میسر" کی ترکیب سرور حاصل کے معنی میں آئی ہے تو ردیف لئے ہوئے کے ساتھ وہ بالکل بے کار ہو جاتی ہے۔

مولانا ماہر القادری کا ایک مصرع ہے " میں نے ذروں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں "۔ نیاز صاحب کتنی خوبصورت منطقی دلیل لفظ تراشنا کے استعمال کے سلسلے میں دیتے ہیں کہ طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ ان کا اعتراض ہے کہ تراش کر کوئی چیز بنانا اس کا مقتضی ہے جس کو وہ چیز جسے ہم تراشتے ہیں اپنی پہلی ناتراشیدہ حالت سے چھوٹی ہو جائے نہ کہ بڑی۔ ستاروں سے ذرے تو تراشے جا سکتے ہیں لیکن ذروں سے ستارے نہیں تراشے جا سکتے، بنائے جا سکتے ہیں۔

ماہ و ماعلیہ کا باب اس قسم کے نکات سے قارئین نگار کو فن اور زبان کی نزاکتوں سے آشنا کرتا رہا ہے اور نیاز صاحب سے بہتر اور صحیح راہبر اس راہ میں کون ہو سکتا ہے۔ لیکن نیاز صاحب دوسرے مباحث کی طرح تنقید میں بھی صرف رائے دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جو عام قاری کے ذہن کو بری طرح متاثر کر دیتا ہے اور کبھی کبھی اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتوں کو آگے بڑھانے کے بجائے مسدود کر دیتا ہے۔ مثلاً جگر مرحوم کی شاعری سے متعلق ان کی رائے ملاحظہ ہو۔

" جگر مرادآبادی کی شاعری کے متعلق ایک صاحب کی رائے ہے کہ وہ خارش قسم کی شاعری ہے کہ آپ جتنا زیادہ کھجائیں گے اتنا ہی زیادہ لطف آئے گا، لیکن ہے بہرحال وہ خارش ہی۔ اس رائے سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ یہ خارش وہ نہیں ہے جس کے زیادہ کھجانے سے زیادہ لطف آتا ہے بلکہ اسے آپ نے کھجایا اور سوزش پیدا ہوئی۔ یعنی جب تک ان کی زبان سے آپ ان کا کلام سن رہے ہیں غنیمت ہے، لیکن جہاں آپ نے بزم سخن سے ہٹ کر اس پر غور کرنا شروع کیا اس کی قلعی اترنے لگی "

اس رائے کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ تو قارئین نگار ہی بہتر کر سکتے ہیں میں تو اس غزل کے جس کے سلسلے میں یہ رائے دی گئی ہے دو شعر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

ہائے وہ رازِ غم کہ جو اب تک ۔۔۔ میرے دل میں تری نگاہ میں ہے
میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں ۔۔۔ تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

اپنے معاصر مشاہیر شعراء کے متعلق اس قدر بے لاگ عملی تنقیدیں اور عوام کے جاہلانہ عقیدوں اور رسموں پر علم اور عقل کو یہ درپے ضربیں کسی دوسرے درجہ کی شخصیت اور حوصلہ رکھنے والے کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی کڑی تنقیدوں اور عقائد شکن ضربوں نے نیاز صاحب کے

خلاف ایک ملک گیر ردعمل شروع کر دیا، خصوصاً مذہبی علماء اور مشاہیر شعراء کے ارادت مندوں نے تو نیاز صاحب پر چاروں طرف سے بھرپور حملے شروع کر دیئے، لیکن نیاز صاحب تنہا دونوں طرف کے وار سہتے رہے بلکہ جہاں جہاں موقع ملا آگے بڑھ کر دندان شکن جواب بھی دیتے رہے۔ اس میدان میں بڑے بڑے حق کے پرستار جرأت کی کمی کے باعث مصلحت کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن نیاز صاحب نے جوبات سچی سمجھی وہ کبھی کسی مناسب موقع کے لئے اٹھا کر نہ رکھی اور نگار اور خصوصاً نگار کے دونوں متذکرہ بالا ابواب نیاز صاحب کی اس جرأت کے گواہ ہیں۔

جراحی اور مسلمان

علم الجراحۃ فن طب کی ایک شاخ ہے جسے انگریزی میں سرجری (Surgery) کہتے ہیں یہ لفظ یونانی لفظ (CHIRURGIE) سے ماخوذ ہے جس کے معنی "صناعۃ الید" کے ہیں۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ فن جراحی (جو جسم کے تمام ظاہری صدمات و ضربات کے علاج سے متعلق ہے) علم الادویہ سے بہت پہلے رائج ہوا ہوگا، کیونکہ ابتدائے دور انسانیت میں جب انسان جانوروں کی طرح کوہ و صحرا میں خاک چھانتا پھرتا ہوگا اور درندوں کے درمیان وہ زندگی بسر کر رہا ہوگا تو یقیناً اولین نقصان اس کے جسم ہی کو پہونچا ہوگا اور قدرتاً اس نے سب سے پہلے اسی قسم کے صدمات و ضربات کا مداوا تلاش کیا ہوگا، اس فن کی ابتداء تو اولین دور انسانیت سے شروع ہوتی ہے لیکن اگر عہد تاریخ کی جستجو کی جائے تو اس فن میں اولیت کا فخر مصر کو حاصل ہے، جس کا ثبوت وہاں کے آثار قدیمہ کے نقوش سے بہم پہنچا ہے۔ قدیم عبرانیوں کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ فن مصر کے کاہنوں سے سیکھا تھا۔

یونانیوں کے نزدیک یہ فن بھی علم الاصنام کی طرح بہت قدیم تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کا خیال ہے کہ سب سے پہلے تھسلی کے خیرن القنطوری نے زخموں کے لئے عقاقیر کا استعمال کیا، لیکن بعض کا قول ہے کہ اس کو لاہیوس اس فن کا موجد تھا۔ اس کے بعد چھٹی صدی (ق م) میں فیثاغورس نے مدرسہ طبیہ قائم کیا۔ اور اس کے ایک شاگرد دیمقیوس نے اس فن میں بہت شہرت حاصل کی۔ اس کے دو صدی بعد ۲۰۰ (ق م) میں البقرالا نے اس فن کو بہت ترقی دی اور بعض بعض نہایت نازک عمل جراحی کے اس کی طرف سے ظاہر ہوئے۔

مسلمانوں میں یہ فن آل عباس کے عہد میں رائج ہوا۔ جب کہ تمام علوم و فنون کی کتابیں عربی زبان میں منتقل ہو رہی تھیں اور مختلف فنون کے مدارس دمشق و بغداد وغیرہ میں قائم ہو رہے تھے مسلمانوں میں یہ فن یونانی کتابوں سے منتقل ہو کر آیا اور عرب کے اطباء میں سب سے زیادہ شہرت امام ابوبکر رازی نے حاصل کی اور قثاطیر (CATHATER) کی ایجاد اسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کے بعد سنہ ۱۰۰۶ء میں ابو القاسم الزہراوی نے اندلس میں شہرت حاصل کی اور متعدد آلات جراحی اس نے ایجاد کئے۔

مسلمانوں کی خاص کتابیں اس فن میں یہ ہیں :-

(۱) جامع المفردات الادویہ والاغذیہ للشیخ ابی عبداللہ جو ابن بیطار کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) عمدۃ الجراحین مصنفہ امین الدولۃ ابوالفرج یعقوب القف

(۳) غنیۃ اللبیب مصنفہ محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن ابو کفانی السنجاوی المصری۔

(نیاز)

نیاز فتحپوری اور انکی غزلیں

سید سرور عالم مارہروی

ادب اردو میں جو اضافہ حضرت نیاز فتحپوری نے اپنی حسن تراکیب، رفعت خیالات اور طرز بیان سے کیا ہے۔ وہ ارباب ذوق کے پیش نظر ہوگا۔ اور مجھے ضرورت نہیں کہ میں اس پر کوئی تفصیلی بحث کروں اس وقت میں انکی طرز تغزل کو تنقید کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس کی ضرورت اس لئے محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت انھوں نے اپنی اردو غزلوں کی اشاعت کی طرف مطلق توجہ نہیں کی ہے حسن اتفاق سے انکی غیر مطبوعہ چند غزلوں کا ایک قلمی مسودہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں دکھلانا چاہتا ہوں کہ جس صنف سخن سے وہ اس قدر بے نیاز ہیں وہ کس قدر ان کی رہین منت ہے۔

میں نے جہاں تک انکے مضامین نظم و نثر کا اندازہ کیا ہے۔ یہ معلوم کر سکا ہوں کہ انکی کامیابی کا بڑا راز صرف ان کا طریقہ بیان ہے جو اپنے رنگ میں یکتا اور اپنی خصوصیت میں فرد ہے۔

انکی علمی قابلیت بھی محتاج تفصیل نہیں، انگریزی میں انکو کیا درک ہے؟ اس کا اندازہ گیتان جلی کے ترجمہ (عرض نغمہ) سے ہو سکتا ہے۔ بھاشا وہ کیسی جانتے ہیں؟ اس کے لئے انکی تصنیف جذبات بھاشا موجود ہے۔ عربی کا حال معلوم کرنے کے لئے انکے عالمانہ مذہبی مضامین بس، اور فارسی کے دبادت کا ثبوت ان کا نامی کلام ہے تاہم ہر اس شخص کے لئے جو السنۂ مغربی و مشرقی کا ماہر ہو، یہ ضروری نہیں کہ اس کا اسلوب بیان بھی دلکش ہو جب تک اُسے یہ قدرت حاصل نہ ہو کہ وہ اپنے مخاطب کو ایک خاص طریقہ خطاب سے متاثر کر سکے۔

چنانچہ یہی صفت ہے جس نے حضرت نیاز کے مضامین کو خواہ وہ نثر ہوں یا نظم، قبولیت کی سند بخشی ہے۔ جن حضرات نے ان کی نظم و نثر کا غائر مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ انکی طبیعت وقعت پسند واقع ہوئی ہے، وہ کبھی پامال و فرسودہ مضامین کو ہاتھ نہیں لگاتے اور اس لئے ان کو جدید تشبیہات و استعارات کی تلاش میں خاص خاص ترکیبوں سے مدد لینی پڑتی ہے جس سے فی الجملہ ان کا کلام ادق ہو جاتا ہے لیکن حیرت ہے کہ وہی شخص جو اور طرح اس قدر دقیق النظر ہے تغزل میں اپنے اس رنگ کو بالکل چھوڑ دیتا ہے اور جذبات کے سادہ سادہ اظہار پر قانع ہو جاتا ہے اور نیاز کے مذاق سلیم کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا، غزل کے علاوہ ان کا معیار خیال صرف یہی نہیں ہوتا کہ مطلب ادا ہو جائے۔ بلکہ الفاظ کی شوکت و موزونیت بھی خاص رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی نظم ہمیشہ ایک خاص دلکشی رکھتی ہے۔

ان کے مضامین نثر مذہب اور ادب دونوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور دونوں کے لئے ان کا رنگ جداگانہ ہے۔

اب میں تنقید شروع کرتا ہوں۔ لیکن یہ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں فن شاعری کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ البتہ بلحاظ جذبات بتلاؤں گا کہ کن کن مختلف کیفیات کے زیر اثر کس طرح مختلف انداز کے جذبات نظم ہوئے۔ نیاز کے کلام میں مختلف اثرات سے متاثر ہونے کی

قابلیت پائی جاتی ہے، آپ ان کی غزل میں تشبیہات کہیں نہ پائیں گے لیکن ساتھ ہی کوئی شعر کنایہ سے خالی نہ ہوگا۔ اور طرز بیان کا انوکھا پن اپنے نمایاں انداز میں نظر آئے گا۔ ایک غزل کا شعر ہے ؎

آرام دن کا، رات کا سونا، سکونِ دل
ہاں تم سے چھوٹ کے کون سی راحت نہیں مجھے

طنز کی کیسی نادر مثال ہے، یہ نہیں کہا کہ تم سے چھوٹ کر میں تکلیف میں ہوں لیکن انداز بیان نے یہی مفہوم پیدا کر دیا۔ راحتوں کے حصول سے ان کا عدم حصول بتلانا ایک خاص لطف دے رہا ہے۔

بالیں پہ آئے ہو تو نہ بیٹھو جھکا کے سر
اچھا ہوں اب تو کوئی شکایت نہیں مجھے

انداز بیان دیکھئے کہ اس کہنے کے باوجود، اچھا ہوں، اب مجھے کوئی شکایت نہیں ہے؟ یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ میں اچھا بھی نہیں ہوں اور مجھے شکایتیں بھی بہت ہیں۔ لیکن اب کہ جلد ہی اپنی رشتۂ حیات کے قطع ہو جانے کا یقین ہے جس کا اندازہ محبوب کے بالیں پر آنے اور سر جھکا کر بیٹھ جانے سے بخوبی ہو جاتا ہے یہ ظاہر کرنا کہ اب تمہارے آجانے پر مجھے کوئی شکایت باقی نہیں رہی وہ پاکیزہ جذبۂ محبت ہے جس کا اثر براہ راست دل پر ہوتا ہے۔

پھر ہاتھ میرے سینہ پہ رکھ کر کہو کہ ضبط
پھر میں کہوں کہ اس کی تو طاقت نہیں مجھے

اس شعر میں حقیقتاً اپنی تکلیف کو ناقابلِ ضبط ظاہر کرنے کے لئے ایک خاص انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی تم برابر ضبط کی ہدایت کرتے جاؤ اور میں برابر یہی کہتا جاؤں کہ اس کی طاقت مجھ میں نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ فی المعنی یہ ظاہر کر دینا کہ تمہارا سینہ پر ہاتھ رکھ کر ضبط کی فرمائش کرنا خود ایک ضبط ربا امر ہے، اس شعر کو نہایت بلند کر دیتا ہے۔

مانا کہ مستحق محبت نہیں ہوں میں
یہ بھی نہ کہہ مگر کہ محبت نہیں مجھے

اس شعر میں بالکل وارداتِ قلب لکھے گئے ہیں، اور ایسے استادانہ طرز سے کہ کیفیت کا اظہار الفاظ سے ناممکن ہے، باوجود عدم استحقاق الفت کے، محبوب کی زبان سے بے محبتی کا اظہار نہ چاہنا حقیقتاً محبت کا ایک نازک جذبہ ہے اسی غزل کا ایک مقطع ہے۔

وہ نزع میں نیاز کا لکھ بھیجنا ان سے
آؤ نہ اب کہ صدمۂ فرقت نہیں مجھے

موت کو ایسے نفیس کنایہ کی صورت میں بیان کرنا کہ اب عہد فرقت ختم ہوتا ہے کس قدر خوب ہے۔ دوسری غزل کا ایک شعر اسی مفہوم کا ہے۔

عزیزو ڈال دو اب میرے منہ پہ تم چادر
اور اُن سے کہہ دو کہ اب مجھ کو انتظار نہیں

اس شعر کی داد دینے کے لئے کافی الفاظ میسر نہیں ہیں، اک تیر ہے کہ دل میں پیوست ہوا جاتا ہے۔ شعر میں کسی جگہ موت کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن پھر بھی اس کی ایک مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔

دونوں اشعار میں لفظ "نہیں" ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔

یاں ہے سب یہ کہ دل کو ذرا قرار نہیں
کہوں یہ کیسے مجھے ان کا انتظار نہیں

اس وقت جبکہ بیقراری دل سب کو معلوم ہو چکی ہے ان کے انتظار کا نہ ہونا کبھی باور نہیں ہو سکتا اس لئے شاعر خود اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ یہ بات کیسے کہوں اس استفہام نے یہاں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

اسی غزل کا ایک شعر ہے۔

میں تم کو دیکھ کے اللہ جانے کیوں چپ ہوں
یہ کیسے جانا کہ دل میرا بے قرار نہیں

اس شعر میں "اللہ جانے" اور "کیوں چپ ہوں" ان دونوں ٹکڑوں نے قیامت برپا کر دی ہے۔

یہی میں کیوں نہ کہوں تیرا حسن ہی ہے بلا
یہ کیوں کہوں کہ مجھے دل پہ اختیار نہیں

نیاز کے تغزل کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے حقیقی مقصود کو ہمیشہ استعارات و کنایات میں ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ اس شعر میں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ "تمہارے حسن کو دیکھ کر دل بے اختیار ہو جاتا ہے" لیکن انداز بیان سے یہ معمولی خیال نہایت بلند ہو گیا ہے۔ یعنی اپنے دل پر تو مجھے کامل اختیار حاصل ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ تیرا حسن ہی بلا ہے، ضمنی طریقہ میں حسن معشوق کی تعریف اور اپنے اضطراب دل کی توضیح کس قدر لطف خیز ہے! اسی رنگ کا دوسرا شعر ہے۔

گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھیے کہ دل پہ مجھے
ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں

دوسرے مصرع میں "ہے" "اختیار" عجیب کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

تمہیں بتاؤ کہ پھر کس پہ رحم ہوتا ہے
میں خستہ حال نہیں ہوں کہ دلفگار نہیں

یہ شعر ایک خاص رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے انداز بیان کو کافی داد نہیں دی جا سکتی دوسری غزل کا مطلع ہے۔

نہ دنیا کا ہوں میں نہ کچھ فکر دیں کا
محبت نے رکھا نہ مجھ کو کہیں کا

شعر میں جذبات کی فراوانی احاطۂ تشریح سے باہر ہے خاص میر کا رنگ ہے۔

اسے کہہ لو اب آستانہ وگرنہ — وہ اک نقش ہے میری لوح جبیں کا
ہے ہر لب پہ ذکر آستانے کا لیکن — کوئی نام لیتا ہماری جبیں کا؛

پہلے شعر میں آستانۂ یار کو عاشق کے لوح جبیں کا نقش بتلانا ایک نہایت نازک اور کیفیت انگیز خیال ہے۔ دوسرے شعر میں قریب قریب اسی جذبہ کو کسی قدر حسرت آمیز لہجہ میں ادا کرنا نیاز کے کمال فن کی دلیل ہے۔ اسی غزل کا ایک عجیب وغریب شعر ہے۔

چھٹے مجھ سے احباب ایک ایک کر کے
بُرا ہو میری طبع اندوہگیں کا

شاعر نے اپنے حال کی کتنی مکمل تصویر کھینچی ہے۔ ایک غزل چھوٹی بحر میں ہے۔

یوں تو ہے زخم اک دہان خموش
کیا مگر چارہ بیان خموش

کس شان کا مطلع ہے۔ زخم کو دہان خموش کہہ کر پھر بیان خموش سے اس کی مناسبت دکھلانا کمال شاعری ہے۔ بیان کی صفت خموشی قرار دینا صرف حضرت نیاز کا ہی رنگ ہے کہ وہ متضاد الفاظ کے اجتماع سے عجیب لطف پیدا کر دیتے ہیں۔

جانے کیا کہہ گئی پتنگوں سے
صبح کو شمع کی زبان خموش

اس شعر میں خاص لطف یہ ہے کہ شمع کی گفتگو پتنگوں سے کہیں ظاہر نہیں کی گئی لیکن صرف ایک لفظ صبح سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے کہ وقت سحر شمع کی کیا حالت ہوتی ہے۔

نہ کھلا راز خط پیشانی
ہوں میں ممنون آستان خموش

شاعر کے بیان سے ظاہر ہے کہ اس نے آستانۂ محبوب پر بہت جبہ سائی کی ہے لیکن یہ آستانہ کی شریفانہ رازداری ہے کہ وہ خط پیشانی کے نقوش کو ظاہر نہیں کر دیتا جو شاید دونوں کی رسوائی کا باعث ہوتا۔

حسن محمل کے ساتھ دل بھی چلا
شوق کا یعنی کاروان خموش

دل کو کاروان شوق کہنا اور پھر وہ بھی خموش، خوب ہے آرزوؤں کا ہجوم، اس سے بہتر طریقہ میں نہیں دکھلایا جا سکتا تھا۔ "یعنی" کا لفظ درمیان مصرع کیا لطف دے رہا ہے۔ وہ کہہ سکتے تھے "یعنی حسرت کا کاروان خموش" لیکن ایک مصرع کے دو ٹکڑے کر کے درمیان "یعنی" لانا استادانہ انداز ہے۔

تم نے دیکھا نہ حال زار میرا
نہ سُنی میری داستان خموش

دوسرا مصرع پہلے مصرع کی تفسیر ہے یعنی میرے حال زار کا دیکھ لینا گویا میری داستان خموش سن لینا تھا۔ دیکھئے کونسا اور "حال زار" کو "داستان خموش" کہنا اور اس قبیل سے ایک کیفیت کو دوسری متضاد کیفیت ثابت کر دکھانا کلام نیاز کی ایک بلاغتیاتی خصوصیت ہے۔ دو مصرعوں میں اس طریقہ سے ربط معنوی پیدا کرنا شاعر کے حسن بیان اور قادر الکلامی پر دلالت کرتا ہے۔ مقطع یہ ہے۔

ہم نے دیکھا تھا ہے وہی تو نیاز
لاؤبالی سا اک جوان خموش

دوسری غزل کا ایک شعر

حسن ہے اک سکون استغنا عشق تکرار مدعا کی خلش

نیاز کا یہ مخصوص طرز ہے کہ وہ مختصر الفاظ سے بڑے گہرے مطالب ادا کیا کر دیتے ہیں چنانچہ اس شعر میں "حسن و عشق" کی تعریف صرف ایک مختصر مصرع میں کر دی ہے۔ حسن کو "سکونِ بے نیازی" اور پھر اس کے مقابلہ میں عشق کو "تکرارِ مدعا کی خلش" کہنا پرگوئی کی بہترین مثال ہے ایک غزل کا شعر ہے۔

خدا وہ دن کرے جب تھک کے میں بیزار ہو جاؤں
میں اپنی زندگانی یعنی اس امید تنہا سے

میں دکھا چکا ہوں کہ نیاز "یعنی" کا صرف خوب فرماتے ہیں چنانچہ اس جگہ بھی زندگانی کو امید تنہا کہنا کس قدر معنی خیز ہے۔ کیونکہ تنہا امید پر زندہ رہنا بھی درحقیقت ایک یاس ہے جس سے بالآخر بیزار ہو جانا قدرتی ہے۔ دوسرا شعر ہے۔

زمانِ یاس میں بھی گاہے گاہے رسنے لگتا ہے
وہ زخمِ دل چلا آتا ہے جو عہد تمنا سے

زمانہ یاس میں زخم کا رسنا ایک پامال خیال تھا اس لئے نیاز نے اس پیرایہ میں ظاہر کیا کہ یوں زمانِ امید میں زخم رسا ہی کرتا ہے کیونکہ شوق کامیابی کی مسرت دل کو جس قدر مضطرب کرتی ہے اتنا ہی زخم آرزو بڑا ہو جاتا ہے لیکن کبھی کبھی زمانہ یاس میں بھی امید کی جھلک نظر آتی ہے جو اس زخم کے رسنے کا باعث ہوتی ہے۔ اس جھلک کی وجہ بقول بیدل ؎

ناامیدی دیک جہان امید
ناتوانی و کوشش جاوید

یعنی عاشق کے یاس و امید کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ وہ کبھی بالکل ناامید ہو جاتا ہے اور کبھی سراپا امید شعر میں "عہد تمنا" سے مدت یاس کس خوبی کے ساتھ دکھائی گئی ہے۔ ایک غزل یہ ہے۔

چاہتے ہیں وہ کہ اظہار محبت چھوڑ دوں
یعنی الفت چھوڑ دوں اسکی حکایت چھوڑ دوں

یہاں بھی "یعنی" کا استعمال قابل داد ہے، شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شکوہ محبت ہی گویا الفت اور اسکی حکایت ہے اور یہ بالکل درست ہے کیونکہ تعلقات جس قدر مضبوط ہوتے ہیں اسی قدر نازک ہوتے ہیں اور جس قدر نازک ہوتے ہیں، اسی قدر ان کی حفاظت ضروری ہوتی ہے جن کا محفوظ رکھنا شاید کسی کے امکان میں نہیں اس لئے شکایت کا سبب پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے دوسرے شعر میں اسی مطلب کو ظاہر کیا ہے۔

تم سے مل کر بس یہی جی چاہتا ہے کچھ کہوں
کیا کہوں گر شکوہ سنجی ہائے الفت چھوڑ دوں

یعنی تم سے ملنے پر مجھ سراپا عشق کے پاس گفتگو کے لیے اگر کوئی مضمون ہوتا ہے تو یہی کہ الفت کی شکوہ سنجیاں کروں پر تمہارا منع کرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ تم مجھ سے محبت نہ رکھو کیونکہ بقائے محبت کے لئے شکوہ سنجی لازم ہے۔ پہلے مصرع میں "کچھ کہوں" دوسرے مصرعے میں "کیا کہوں" بہت ہی پرلطف ہیں۔

دیکھ کر ان کو مری آنکھوں میں آنسو بھی نہ آئیں
کس طرح اظہار شوق بے نہایت چھوڑ دوں

نیاز نے جن جذبات سے متاثر ہو کر اس شعر کو کہا ہے وہ یہ ہیں کہ ان کو دیکھ لینے پر مجھ میں قدرت باقی نہیں رہتی کہ اپنے آنسوؤں کو روک لوں یہ تو بے اختیارانہ بات ہے پھر کسے تامع میں اپنے شوق بے پایاں کا اظہار کیوں کر چھوڑ دوں کیسا لطیف انداز بیان ہے۔

کیا یہ انجامِ محبت مجھ کو پھر چھوڑے نہیں
گر خیالِ ابتدائے عہدِ الفت چھوڑ دوں

صاف معلوم ہوتا ہے کہ انجامِ محبت اچھا نہیں کیونکہ اُس حالت میں تو یہ خیال کبھی نہ آتا کہ ابتدائے عہدِ الفت کی یاد قائم رکھی جائے تاکہ معشوق کی دیرینہ التفات کا خیال اس وقت کی بے التفاتیوں کی تلافی کر سکے محبوب کا احترام باقی رکھنے کے لئے اپنی موجودہ حالت سے متاثر ہونا اور اس کی پچھلی باتوں کو اپنے لئے ذریعہ تسکین جاننا کیا لطیف جذبہ ہے۔

جان دے دوں کیوں نہ گر کر اس کے قدموں پر نیازؔ
شکرِ احساں چھوڑ دوں اظہارِ منت چھوڑ دوں

کیا اچھوتا خیال ہے۔ معشوق کے قدموں پر گر کر شکرِ احسان اور اظہارِ منت شاعر کی نگاہ میں وہ وقعت نہیں رکھتا جس کا بلند ترین معیار معشوق کے قدموں پہ گر کر جان دے دینا ہے۔ دوسری غزل ہے۔

اے شبِ اُداس تنہا تو ہی مگر نہیں ہے
میں یہ بھی تو دیکھتا ہوں وہ جلوہ گر نہیں ہے

اپنی غمگینی سے تنہا اپنے کو نہیں بلکہ اپنے ۔ لوں کو بھی اداس دیکھنا شاعر کے جذبہ کی وسعت کس خوبی سے دکھلایا ہے۔ اسی غزل کا شعر ہے

بیٹھے ہیں چشمِ خونیں کھولے ہوئے ہم اپنی
کوئی بھی دل کا لیکن پیغام بر نہیں ہے

کیسا اعجازانہ انداز بیان ہے۔ چشمِ خونیں کھول کر انتظار پیغامبر کرنا اور پھر اکتا کر یہ کہہ دینا دل کا پیغامبر کوئی نہیں شاعرانہ اعجاز ہے لطف یہ کہ الفاظ میں دل کا پیغام کہیں نہیں ظاہر کیا گیا لیکن کنایہ میں چشمِ خونیں سے اس کی صراحت ہو جانا، انتہائے بلاغت ہے مقطع ہے۔

کیا پوچھتا ہے کیا ہے اب نیازؔ تیرا
کل سے بپا ہے ماتم تجھ کو خبر نہیں ہے

ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

میں ہوں گا رات ہوگی وہ مہ جمال ہوگا
ساعت تو آئے وہ جب جینا محال ہوگا

عموماً دوسرا مصرع یہ بات ظاہر کرتے ہوئے لکھا جاتا تاکہ وہ ساعت تو آئے، جب میں اس طرح شاد کام ہوں"۔ لیکن نیازؔ نے صرف "جینا محال ہوگا" لکھ کر ایک پامال مضمون میں بلندی پیدا کر دی ہے۔ یہ شعر نیازؔ کے شاعرانہ ندرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

جو تیرے جی میں آئے کہہ لے مجھے کہ اب تو
دل کو سکوں نہیں ہے، ہاں چارہ گر نہیں ہے

یہ شعر تعریف سے مستغنی ہے، پہلے مصرعہ میں اپنی مجبوری و بے کسی کا بیان اور دوسرے میں اپنی اضطرابی کا اعتراف کرتے ہوئے چارہ گر (معشوق) کی جانب ایک طعنہ ملیح کا اظہار نہایت نفیس ہے۔

برہم نہ ہو چلا میں اٹھ کر یہاں سے بھی اب
سچ ہو کہ رہ گذر ہے کچھ میرا گھر نہیں ہے

غالبؔ نے لکھا ہے —

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

لیکن نیازؔ کا یہ کہنا کہ "رہگذر واقعی میرا گھر نہیں ہے اور تجھے حق حاصل ہے کہ مجھے یہاں سے اٹھا دے"

اور پھر اس انداز سے ادا کرنا "یہ ہم نہ ہو چلا میں اٹھ کر یہاں سے بھی اب" اس شعر کو خدا جانے کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔"

(ماخوذ از زمانہ کانپور بابت جنوری ۱۹۲۱ء)

نیاز کا اسلوبِ نگارش

محمد خورشید عاصم

دنیا کی تقریباً اڑھائی ارب آبادی میں شاید ہی دو انسان ایسے ہوں جو آپس میں کلی مناسبت و مشابہت رکھتے ہوں، یہ طبائع عادات اور بحیثیت مجموعی شخصیتوں کا اختلاف رنگا رنگی عالم کا باعث ہے، ادب جو زندگی کا آئینہ دار اور جذبات کا عکاس ہے۔ طبائع کا تفاوت اس میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہر شاعر و ادیب اپنے ایک مخصوص رنگ کا مالک ہوتا ہے، ہر شاعر کا شعر اور ہر نثر نگار کی نثر اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو دوسروں سے مختلف دکھائی دیتی ہے، میر، سودا، غالب، ذوق اور مومن وغیرہ اپنی اپنی جگہ ایک منفرد شان کے مالک ہیں۔ حالی، شبلی، محمد حسین آزاد وغیرہ اپنے اپنے مقام پر ایک جداگانہ عظمت و وقار رکھتے ہیں، ایک کا اسلوب دوسرے سے الگ ہے اور یہ چیز ہم عصر ہونے اور ایک ہی ماحول سے تعلق رکھنے کے باوجود ظہور پذیر ہوتی ہے

ٹی، ایس ایلیٹ کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ہم ادب سے ادیب کی شخصیت کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ اسی مطلب کو ابوالفضل نے انشائے دفتر سوئم میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ "خویشتن را از نقش تا بہ نقاش باید رسانید" ظاہر ہے کہ ادب کا بغور مطالعہ کرنے سے ادیبوں کی متحرک شخصیتیں ان کے احساسات جذبات مطمح نظر معیار ہمارے سامنے آجاتے ہیں، یہ تمام باتیں ادیب کے اسلوب بیان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ادیب کی عبارت رنگین ہوتی ہے، کسی کی سادہ، کسی کی تحریر رواں ہوتی ہے، کسی کی سست، کسی کے اسلوب میں ایک ولولہ و ہنگامہ ہوتا ہے اور کسی کے ہاں نرمی و سکوت، کہیں تشبیہات و استعارات کا زور دکھائی دیتا ہے اور کہیں محاورات و ضرب الامثال کی بھرمار نظر آتی ہے۔ بعض جگہ کسی وصف کی افراط ہے اور بعض جگہ تفریط، اور بعض مقامات پر حیرت انگیز اعتدال پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بالارادہ نہیں ہوتا۔ یہ طبعی چیز ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہر چاہتا محمد حسین آزاد کی سی نثر اور غالب کے سے شعر لکھنے پر قادر ہوتا وجہ یہ ہے کہ اسلوب یا انداز الفاظ میں نہیں بلکہ بیان کرنے والے کی شخصیت میں پنہاں ہوتا ہے۔ جیسے محمد حسین آزاد نے کہا "انہیں اوصاف سے سودا، سودا اور میر تقی میر صاحب ہیں، ورنہ جس کا جی چاہے یہی تخلص رکھ لے۔ خالی سودا ہے تو جنون ہے اور خالی میر ہے تو گنجفہ کا محض ایک پتہ[1]

اسٹائل کا مادہ یونانی لفظ (Stilus) ہے نہ کہ (Stylus) سے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نوکدار آلہ کسی دھات، لکڑی یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا۔ جس کے ذریعہ سے قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف اور الفاظ کندہ کئے جاتے تھے۔ امتداد زمانہ سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھایا جاتا تھا، خود ان نقوش یعنی جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا، اور ایک عمل جو ابتداً میکانکی تھا، رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا، ان نقوش کو اسٹائلس کے دوسرے کند حصے سے سدھارا جاتا

---

[1] آبِ حیات ص ۳

ادب میں کانٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور بالیدگی خود ادیب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے، وہ اپنا جائزہ لیتا ہے۔ اور غور کرتا ہے کہ جو کچھ اسے کہنا تھا کہہ سکا اور حقیقت کا جو نقش اس کے دل میں مرتسم تھا وہ تحریر میں بلا کم و کاست منتقل ہو گیا کہ نہیں۔ اسی دیدہ ریزی پر کسی پارہ ادب کی خوبیوں اور نوک پلک سے درست ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔[۱]

اسلوب بیان ہر مصنف ادیب یا شاعر کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے، لکھنے والے کی شخصیت جن احساسات جذبات و خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے، اُن کی جھلک ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرے اور بیان کی تمام ادا‌ؤں میں موجود ہوتی ہے۔ ادب میں زندگی اور حرارت، خون جگر کے بغیر ناممکن ہے۔ اور خون جگر صرف اسی صورت میں ادب میں منتقل ہو سکتا ہے، جب ادیب کا حقیقی احساس اور جذبۂ صادق الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو جائے۔ یعنی ہر نیا لفظ اور ہر نیا فقرہ یا مصرع شخصیت کی گہرائیوں سے اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آئے اس حقیقت کے پیش نظر ہم ادب کو ادیب سے علیحدہ نہیں کر سکتے، اور جب ہم یہ جانتے ہیں کہ ادب کے عناصر معلوم کریں، تو لازماً ہمیں ان عناصر کو بھی ساتھ رکھنا پڑتا ہے جن سے ادیب کی انفرادیت کی تشکیل ہوئی تھی، احساس اور جذبۂ ادب کی اساس ہیں۔ ہر ادیب کے احساسات و جذبات مختلف ہوتے ہیں، جو چیزیں ایک کے نزدیک محبوب ہوں ضروری نہیں کہ دوسرا بھی اُن کے ساتھ اسی قسم کا لگاؤ رکھے، یہ اختلاف قدرتی طور پر اسالیب میں بھی اختلاف پیدا کر دیتے ہیں اور پھر ہر ادیب یا شاعر کی اپنی شخصیت کی تشکیل مختلف عناصر سے ہوتی ہے۔ اس میں ابتدائی زندگی تعلیم و تربیت احباب اور متعلقین کی شخصیتیں، سیر و سفر اور مطالعہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں لکھنے والے کی شخصیت میں جس قدر وسعت جس قدر عمق، اور جس قدر پیچیدگی ہوتی ہے۔ اس کا اسلوب اپنی انفرادیت کے لحاظ سے اتنی ہی زیادہ وسعت اور گہرائی کا حامل ہوگا اور اس کے زاویئے اتنے ہی زیادہ متنوع اور مختلف ہوں گے۔

انھیں اصول کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم نیاز کی نثر نگاری اور اُن کے اسلوب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے نثر نگاروں کی وسعت سے اتنی ہی مختلف ہے، جتنی خود نیاز کی شخصیت دوسروں کی شخصیت سے متفاوت ہے۔ نیاز کے خیالات، اُن کے انداز فکر، اور طبعی رجحان پر گذشتہ مضمون میں کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی، یہ دھندلے سے نقوش ایک دھندلی سی تصویر ہمارے روبرو لا رکھتے ہیں، جس کی مدد سے ہم پوری طرح نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ نیاز کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے کے طور پر اُن کے اسلوب کو سمجھنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔

سب سے بڑی چیز جو ہمیں محسوس ہوتی ہے وہ نیاز کی تشکیکیت ہے۔ وہ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور حقیقت کی جستجو میں سرگرداں و پریشاں ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک اضطراب مسلسل ہے اور طلب لا متناہی، یہی پیچ و تاب اور یہی سوز و ساز اُن کی طبیعت کا بڑا اہم جز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ احساسات میں ایک تحرک ہے، اور جذبات میں تموّج، نظر دور دور تک پہنچتی ہے۔ مگر کہیں نہیں ٹھہرتی، دماغ سوچتا ہے، لیکن یہ عمل بھی بہت سریع ہے۔ یہ تیز روی اور اضطراب ہی انھیں سکون و راحت سے صحیح طور پر لذت اندوز ہونے کے قابل بناتا ہے، جنہوں نے خزاں کے ستم نہیں اٹھائے وہ بہار کی قدر و قیمت کیا جانیں، جنہوں نے موجوں کے تھپیڑے نہیں کھائے وہ ساحل کی عافیت بخشی سے کماحقہ کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں، نیاز کی یہ بے سکون طبیعت موقع راحت کو خوب پہچانتی ہے، یہی باعث ہے کہ حسن جوانی خوشبو، بہار، برسات، سبزہ ساحل، سمندر، محافل، رقص و سرود وغیرہ کا ذکر دہ ڈوب کر کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صحرا گزیدہ کسی شیریں اور شفاف چشمے پر پہنچ گیا۔ اس بے سکونی اور تلاش سکون کا تصادم و اختلاف ان کے طرز و اسلوب کا خلاق ہے

---

[۱] اقبال اور انداز بیان۔ اثر لکھنوی۔ روزنامہ امروز ۲۱ اپریل ۱۹۵۳ء

ان کی اس طبعی جولانی و بے قراری سے ان کی عبارت میں روانی اور بہاؤ بہت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں عبارت ناہموار ہو گئی ہے تاہم بحیثیت مجموعی یہ صفت و خاصیت شروع سے آخر تک جاری و ساری دکھائی دیتی ہے خواہ وہ کوئی افسانہ لکھ رہے ہوں یا ناول تحریر کر رہے ہوں۔ کوئی خدا فلسفہ کر رہے ہوں یا مذہب پر بحث کر رہے ہوں، عبارت اسی طرح رواں ہوتی ہے اور لطف یہ کہ یہ روانی اپنے اندر ایک ہنگامہ رکھتی ہے، پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک تند و تیز مواج دریا ہے جو پہاڑوں سے ٹکراتا کہیں آبشاریں بناتا، کہیں طلاطم لئے اُلاپتا، کہیں سرسبز وادیوں اور خوش رنگ پھولوں کو آئینہ دکھاتا اور کہیں اپنے کناروں کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نیاز قلم ہاتھ میں لیتے ہیں اور خیالات و جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے، جس کا مقابلہ ہر صاحبِ قلم نہیں کر سکتا۔ لیکن نیاز اس پر قادر ہیں۔ وہ جس تیزی کے ساتھ سوچتے ہیں اور جس طرّاری سے خیالات ان کے سامنے آتے ہیں، اسی سرعت اور اسی افراط سے وہ حوالۂ قلم کرنے پر قادر ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ لو وہ جس طرح محسوس کرتے ہیں، اسی طرح لکھ بھی دیتے ہیں، پڑھنے والے کو شاید ہی کبھی یہ گمان ہوا ہو کہ عبارت اُن کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ یا ان کے الفاظ تشنۂ مطالب ہیں، بلکہ بعض اوقات تو اُن کے قلم کی جولانی و روانی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود مطالب عبارت کے پیچھے پیچھے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ کولرج کے نزدیک مشکل باتوں کو آسان طریق پر نثر میں بیان کر دینا بہت بڑا کمال ہے۔"

اس روانی کے ساتھ ساتھ نیاز کے اسلوب میں ایک دلکشی بھی ہے۔ اس دلکشی کے کئی اسباب ہیں، سب سے بڑی وجہ ان کی رومانیت پسندی ہے۔ جو شاید اُن کے طبعی اضطراب اور بے سکونی کے ردِ عمل سے پیدا ہوئی تھی، جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا ہے وہ بعض اوقات لکھتے لکھتے کھو جاتے ہیں۔ اور دُور اپنے رنگین خیالات کی وادیوں میں محوِ سیر و تماشا نظر آنے لگتے ہیں۔ نیاز کا لکھا ہوا کوئی منظر خواہ وہ بمبئی کا ساحل ہو یا حیدر آباد کی کوئی دلنواز شام یا رومیلکھنڈ کی کوئی پہاڑی ہو، یا کسی مصری زبیدہ کا تذکرہ ہو یا بارش، کوہسار، سمندر سبزہ زار، طلوعِ آفتاب و مہتاب کا بیان ہو، ان چیزوں کا ذکر اُن کی تحریر میں ایک ولولہ پیدا کر دیتا ہے، وہ اس بیان میں ایک کیف آور مستی محسوس کرتے ہیں۔ بالخصوص عورت، اس کا حسن، اس کی محبت، اس کی جوانی، اس کا لباس اور پیکر اُن کی رومانی تحریروں کا بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں، عورت کا معاملہ من حیث المجموع اُن کے ہاں بہت حسین پیچیدگیوں، اور پیچیدہ حسن آفرینیوں کا حامل ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کی عظمت، اُس کی اہمیت اور اس کے زندگی بخش وجود کو کما حقہ نہیں سمجھ سکے ہیں، حالانکہ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور اُس کی دل نوازیوں اور جاں آفرینیوں کے قصیدہ خواں ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ عورت گلشنِ رنگ و بو ہے، اور مستی کے دھڑکتے ہوئے دل کی راحت، لیکن اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کے متعلق اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں، اسے اور بھی زیادہ اچھی طرح سمجھنے کی خواہش اُن کے دل میں موجزن ہے۔ اور پھر زیادہ الفاظ میں بسیط تر ذکر اور بیان کے ذریعہ وہ اس کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو داد وہ عورت کو دیتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی فراخدلانہ اور مخلصانہ کیوں نہ ہو تاہم اُن کے دل کو تسکین نہیں ہوتی، انھیں اس سے زیادہ الفاظ کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ اس کے پاس الفاظ ہیں لیکن اس احساس کی بے پایانی کا کیا علاج کہ ہر لحظہ ایک نیا رنگ ہے، اور ہر رنگ میں ایک نئی ترنگ۔ یہی عناصر مل جل کر اُن کے اسلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی عبارت میں ایک دلکشی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"ادھر چاندنی دیوی اپنی نیلے سینے سے ہلکے رنگ کی شراب زریں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی اور سطحِ آب پر سایہ کی تاریکی جو مشرق کی جانب سمٹی جا رہی تھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر بیدار ہو کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا ہے[1]"

---

[1] نگارستان صفحہ ۱۱

"وادیٔ قاف میں سفید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا۔ فرطِ تعطر سے پنکھڑیاں جو بکاشن ہوگئی تھیں، چاند جا رہی تھیں چھپا کر اس پر اُترآنے کی کوشش کر رہا تھا، چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ بس کر رہ گئی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریں ہیں۔ اور حباب گھونگھرو کے دانے، جو صبا کے سبک و نازک پاؤں سے فرشِ آب پر بہنگام رقص نکل کر رہ گئے ہیں، کرۂ آب یا دشتِ نیلوفر میں جو کہیں کہیں کمل کر رہ گئی تھی۔ اور اس کے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ناہید فلک کا بت کسی شوالے میں رکھا ہے"[1]

"کل سے بارش ہو رہی ہے۔ اور یہاں کی وادیاں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمزد حل کر کے بھر دیا گیا ہے۔ ہوا کا ہر ہر جھونکا خم کے خم لئے پھرتا ہے۔ اور کوئی پینے والا نہیں، مینہ کا ہر ہر قطرہ نغمۂ جاں سے لبریز ہے۔ اور کوئی اس کا سننے والا نہیں"[2]

"تمام کائنات پر ایک سکوتِ مطلق طاری تھا، جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا مکھڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، اور ناکام ہو ہو کر ساحل پر سر پٹک رہی تھی، متحرک امواجِ آب میں نشرِ ضیا کا وہ عالم تھا کہ گویا حوریں اپنی زلفوں کی افشاں دھونے کے لئے پانی میں اُتر آئی ہیں"[3]

"چاند بلند ہو کر تمام سطحِ آب پر ایک روشن تھرتھری ایک متواتر جھلمل پیدا کر چکا تھا۔ لیکن لہروں کا خرامِ ناز ایک ایسا خرام خاموش تھا، جس کو ہماری نگاہیں تو دیکھ سکتی تھیں لیکن سامعہ کے لئے کوئی آواز ایسی نہ تھی جو جس کو کسی موسیقی سے بھی تعبیر کر سکیں۔ چاندنی کرنیں نہایت آزادی کے ساتھ پانی سے کھیل رہی تھیں، تمام سطحِ آب پر بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں اور کوئی دامن اس چاندنی کو چھو کر نیلا نہ تھا۔ چاند آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا، اور اپنی متین اور سنجیدہ رفتار کے ساتھ نصف آسمان تک پہنچ کر معلق نظر آنے لگا، ہوا چل رہی تھی لیکن اس قدر نرمی و نزاکت کے ساتھ کہ درختوں کی پتیاں بھی ایک دوسرے سے مل سکتی تھیں۔ اور چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی اپنی جگہ آسودہ نظر آ رہا تھا"[4]

جہاں تک عورت اور اس کی خوبیوں کے بیان کا تعلق ہے، نیاز کی مذہبی قسم کی تحریروں کو چھوڑ کر باقی تمام تحریریں ان مضامین سے رنگین ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، نیاز حسن کے فریفتہ و دلدادہ ہیں اور اُن کے ہاں تمام کائنات کے حسن کا نچوڑ، اور تمام عالم کی رعنائیوں کا عطر اور تمام اوصاف کا ہیولیٰ، اگر کوئی چیز ہے تو وہ عورت ہے۔ شروع کی تحریریں بالخصوص لبریزِ کیف و مستی ہیں، نیاز کے رومانی افسانوں کی جان انھیں پر تاثیر بنانے والی قوت، ان میں شعریت و رنگینی کی کیف آگینی شامل کرنے والی لطیف شے صرف عورت ہے۔ عورت کے نغمے نے اُن کے ہر لفظ کو، ہر جملے کو، ہر قصے کو رومانی اور رومانی سے زیادہ کیف آور بنانے میں مدد دی ہے۔ نہ تمام افسانوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں اور نہ بہت سی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت تاہم بطور نمونہ چند ایک سطور نقل کی جاتی ہیں۔

"اپنی دکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ کیا دیکھتا ہوں، ایک تلاطمِ نور، ایک سیلابِ رنگین، ایک طوفانِ حسن و شباب یعنی ایک عورت، مکمل عورت، تمام نازک ترین خصوصیاتِ نسائی لئے ہوئے دکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے"[5]

---

[1] مکتوبات حصہ اول ص۱۱۱　[2] مکتوبات حصہ اول ص۱۱۱　[3] مکتوبات حصہ اول ص۱۱۱
[4] جمالستان ص۱۲۱　[5] جذباتِ بھاشا / نگارستان افسانے ص۱۰۸

"خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے لوگ خدا جانے کیا کیا بے سر و پا دلائل پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک حسین عورت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ چنبیلی اور گلاب کے افشردہ کو منجمد کر کے اس سے ایک مجسمۂ جمیل تیار کرنا، اس کی رگ رگ میں آتش سیال دوڑا دینا اور کمر کی دونوں طرف کا بوجھ نکال کر سینہ میں بھر دینا تاکہ ایک ہی وقت میں شباب کی نزاکت و قوت دونوں بجلی کی سی شوخی و مستی روح کی طرح دیکھنے والے کو مسحور کر لیں۔ سوائے خدا کے کوئی اور کر سکتا ہے! باور کیجئے، جی چاہتا تھا کہ کاش میں ایک اولو ملک ہو کر اس کی راہ میں پڑ جاتا اور وہ پامال کرتی گزر جاتی۔[1]

"وہ یونان کے اس عہد زریں کا مجسمہ تھا، جب مقصد فطرت صرف حسن کا پیدا کرنا تھا۔ اور اس کے ساتھ پرستاری حسن کو عام کر دینا ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی چنبیلی رنگ کی مورت، سر سے لے کر پاؤں تک لوچ ہی لوچ، اعضاء کے لحاظ سے سراپا تناسب و موزونیت، ہر ہر ادا سے نغمہ کشش و سحر انگیز، ہیئات کے اعتبار سے یکسر برق جوالہ، تاثرات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی، اور محبت کی پذیرائی میں ہمہ تن درد آہ، کراہ۔[2]

"صحرائے عرب آج تک کوئی ایسا غزال رعنا پیدا نہیں کر سکا، اور نہ سرزمین شام نے ایسی سیاہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی، اس کی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جا سکتا، اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت سحر بھی ہے شراب بھی، جو مسحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی، اس کی لانبی پلکیں جس کی ہر جنبش بحالت التفات رگ جاں ہے، اور بصورت عتاب نوک سناں۔ اس حریر سے بنائی گئی ہیں، جیسے نازنینان روما کی نرم اور لچکیلی انگلیاں تیار کرتی ہیں۔[3]

"اس کا رنگ جسم یہ معلوم ہوتا تھا کہ لسترن زار فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگ شفق ملا کر بلوریں جلد کے نیچے دوڑا دیا ہے۔ آنکھوں کے سکر و خمار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی کوئی پوری نگاہ کسی پر ڈال دی تو یہ معلوم ہوا کہ کوئی سیلاب ہے جو ابدیت کی طرف بہائے لئے جا رہا ہے۔[4]

"اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک ایسا عمیق چشمہ تھیں، جن میں دلربائی سے زیادہ معصومیت۔ اور رحمانیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی۔[5]

حسن عام اس سے کہ وہ ایک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور ایک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو یا جنس لطیف میں پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے۔ فطرتاً اس امر کا مقتضی ہے کہ حسن ہی اس کا تجسس ہو، جمال ہی اس کی جستجو میں سرگرداں ہو، جس طرح نزاکت کا بار اٹھانے کے لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، نازک بیاض پر ایک نشتر کی ہی چبھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک حسین بھینچی پیشانی پر کچھ صندل ہی کا قشقہ لطف دیتا ہے۔ صنفی اشیاء میں سونے اور پارے کی خصوصیات مجھے بہت پسند ہیں۔ وہ جاذب ہے اور پیچیدہ

---

[1] جمالستان ص۱۱۲ [2] جمالستان ص۵ [3] جمالستان ص۲۳۳ [4] مذاکرات نیاز ص۹۶ [5] نگارستان ص۴

وہ پسندیدہ حسن ہے اور یہ حسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے اور سنار کہ پارہ بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کوئی حسین لڑکی گردن جھکا کر جھانک نہیں لیتی [1]

عورت ایک لذت ہے مجسم، ایک تسکین ہے متشکل، ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادی۔۔۔[2]"

"زیادہ مثالیں طوالت کا باعث ہوں گی کیونکہ عورت اور اس کے حسن کا بیان جہاں بھی ہوا ہے ایک نئے پیرائے سے ہوا ہے یہ امر نیاز کے ذوقِ جمال، یہ حسن پرستی اور اس کا والہانہ بیان اُن کی تحریروں کو ایک حسن اور دلکشی بخشتا ہے۔

نظم و نثر دونوں میں رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے اکثر تشبیہات سے کام لیا جاتا ہے۔ نیاز اس فن میں بھی بہت مہارت رکھتے ہیں

"اس کے بوٹے کی ڈولک ایسی سریلی جنبش کے ساتھ تختۂ رقص کو چھوتی تھی جیسے ہرن کے پاؤں چوکڑی بھرتے وقت اور جب برلیقہ کی رنگین روشنیاں اس کے قامتِ خوش اندام پر ڈالی جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ پرستان کی کوئی مخلوق ہے۔ جو راستہ بھول کر دنیا میں آگئی ہے ــــ یا سمندر کی دیوی ہے جو دنیا کو ڈبو دینے سطح آب پر آگئی ہے[3]"

"یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت قبول صورت، حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی، اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خد و خال کی کشمیریت۔ اس کی آنکھوں کی نشیلی کیفیت ۔۔۔[4]"

"اس کے بال ایسے تھے جیسے بھیگا ہوا سنہرا ریشم، اور جو بال ذرا الگ ہوگیا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیشے کے پیالے میں باریک سونے کا تار، اس کا جسم سفید تھا جیسے چنبیلی، اور اس کا نیچے کا حصہ جیسے چاندی اور موتی، ہاں۔ اس کا یہ حصۂ جسم ایسا ہی تھا اور سمندر کی سبز گھاس اس کے چاروں طرف لپٹی ہوئی تھی، اس کے کان گویا صدف تھے اور اس کے ہونٹ جیسے بالکل مونگا[5]"

اس کا نام کملا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح ۔۔۔۔ اس کنول کی طرح جو سطح آب سے اونچا ہو کر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے نازک اور لچکیلی تھی، اس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی نازک اور ہنس کی سی گردن ڈال دی، موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا دائیں طرف سنبھالا اور راج کماری گنگنانے لگی، اس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگادی جائے سچے موتیوں کے باریک ذرے اور حقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں [6]

"عریاں شانہ روشن پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے آئینے میں دور کے کسی آبشارِ زریں کا نظارہ [7]"

---

[1]　[2]　[3] نگارستان ص ۱۴۱　[4] نگارستان ص ۱۴۱

[5] جمالستان ص ۲۱۱　[6] جمالستان ص ۲۵　[7] جمالستان ص ۲۰۔

اس کے ساتھ ساتھ نیاز رقص و سرود اور نغمہ و آہنگ کے بھی شیدا ہیں۔ ان کی یہ فریفتگی اور ذوق نغمہ بھی انکی تحریروں پر اثر انداز ہوا ہے۔ ان کی طبیعت میں مغنی کی لے اور رقاص کی لچک جاں گزیں ہے جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر ان کی عبارت میں بھی یہ نغمگی اور حرکت منتقل ہو جاتی ہے۔ اسے عبارت کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے کہا ہے کہ :-

"ہر بہترین نثر کی علامت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت آواز میں مد و جزر اور دل آویزی پیدا ہو"[۱] ذرا غور سے دیکھیں تو ان کی عبارتوں میں یہ اثرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی نشانی الفاظ کی تکرار ہے۔ مثلاً :-

"گھر گھر مجالس لطف و نشاط کا قیام گوشہ گوشہ میں رندان بادہ کوش کا اژدحام، ہر ہر بام سے حسن دلنواز کی جلوہ فروشی اور ہر ہر گلی میں عشق کی تپش اندوزی، ہر شام کو شب عیش کے اسباب کی وہ افراط گویا صبح تک زندہ رہنا نہیں"[۲]

پیالے جام بھر بھر کر دئے جانے لگے۔ لوگوں نے خالی کرنا شروع کئے۔ اور نشہ کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں سر کٹ کٹ کر فرش پر گر رہے تھے[۳]،

مذبح کی تمیز تھی نہ عورت کی، نہ بیمار پر رحم تھا نہ ضعیف پر۔ مذہب کا خون آشام دیوتا بپھرا ہوا تھا۔ اور انسانی جان کی قربانیوں پر قربانیاں طلب کر رہا تھا وہ خون کا پیاسا تھا اور کسی طرح اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر آگ میں ڈالے جا رہے تھے، اور ان کے نرم نرم گوشت کے جلنے سے جو بو پھیل رہی تھی اس کو سونگھ سونگھ کر دیوتا خوش ہو رہا تھا جیتی عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جسم تیروں سے چھلنی کیا جا رہا تھا اور ان کی چیخیں سن سن کر یہ خونخوار دیوتا ناچ رہا تھا[۴]

"تیری تکریم۔ تیری قدر، تیری محبت صرف پیرس میں ہوتی ہے۔ وہ پیرس جو کعبۂ عشاق ہے۔ جو قبلۂ اہل دل ہے جو زیارت گاہ حسن ہے :"[۵]

"اس کے جسم سے برقی شعاعیں نکل نکل کر میرے دل کے اندر تپ کی حرارت پیدا کر رہی تھیں ...

"یاد رکھو کہ یہ جنت کا لالچ دلا دلا کر رات بھر مریدوں سے پاؤں دبوانے والے دن دن بھر ملازموں کی طرح کام لینے والے مذہب کے دشمن ہیں"[۷]،

"میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ، ان کے جسم کا رشتہ رشتہ مریم پناہ"[۸]

"اللہ میاں کو تو بہ توبہ تم نے خانہ زاد سمجھ لیا ہے۔ جو بات بات میں تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے"[۹] ......"

۱؎ اردو اسالیب بیان ص۱۶۱ محی الدین قادری زور۔ ۲؎ انتقادیات اول ص۲۶۔ ۳؎ حسن کی عیاریاں ص۱۵۰۔ ۴؎ حسن کی عیاریاں ص۱۵۶۔
۵؎ ایضاً ص۱۱۹۔ ۶؎ جمالستان ص۲۱۶۔ ۷؎ مکتوبات حصہ اول ص۱۴۹۔ ۸؎ مکتوبات حصہ دوم ص۱۲۵۔ ۹؎ مکتوبات حصہ اول ص۹۱

"وہاں کالے کالے بادلوں میں سرخ سرخ ڈیلیا پھوٹتا ہے تو یہ "کاک ٹیل" دماغِ انسانی پر کیا اثر کرتی ہے۔ مجھ پر اوّل اوّل جو اثر ہوا اگر میں بیان کروں بھی تو آپ کو اعتبار نہ آئے گا۔"[1]

"بچہ بے قرار ہے، رو رہا ہے۔ ماں آغوش میں بھینچ بھینچ کے سینے سے لپٹا لپٹا کے، منہ چوم چوم کے اپنی ساری قوتِ محبت سے اُسے چپ کرا رہی ہے......"[2]

اس کے بعد خاص طور پر عبارت کو دلکشی اور دل آویزی سے مزین کرنے والی چیز جابجا حسین و لطیف اور بے تکلف شعروں کا استعمال ہے۔ یہ چیز بھی نیازؔ کی شاعرانہ طبیعت کا پرتو ہے، کوئی موضوع ہو حسبِ موقع اپنے مقصد کی وضاحت کے طور پر یا اپنے کسی قائم کردہ نظریہ کے ثبوت یا سند کے لئے یا کسی منظر و کیفیت پر روشنی ڈالنے کے لئے شعر کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اس بے تکلفی سے کہ لطف آجاتا ہے۔ اشعار کا یاد رکھنا واقعی قابلِ ستائش امر ہے اور اچھے اشعار کا انتخاب اور بھی زیادہ قابلِ تعریف بات ہے لیکن برموقع اور برمحل کسی شعر کا استعمال تو صلاحیت کا اظہار ہے اور یہ بات ہر آدمی کے بس کی نہیں۔ ویسے تو شاید ہی کوئی نثر نگار ایسا ہوگا۔ جو نثر لکھتے وقت شعر کے استعمال سے کلّی طور پر اجتناب کرتا ہو، لیکن جس کثرت اور خوبی کے ساتھ ابوالکلام آزادؔ اور نیازؔ اشعار سے کام لیتے ہیں وہ چیز عام نہیں۔ جہاں کہیں زیادہ کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے، وہاں اشعار کا استعمال اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کے خطوط میں اشعار کی بہتات ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ شعر ٹھونسا گیا ہے۔ جو شعر جہاں آیا ہے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا آنا اشد ضروری تھا ورنہ شاید یہ بات نہ بنتی۔ یہ چیز بھی اُن کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہے ان کے ذوق کی بلندی اس امر سے ظاہر ہے کہ گھٹیا درجہ کا یا پست مضامین کا حامل شعر شاید ہی کہیں مل سکے۔

"خط ملا۔ اس برہمی پر نثار ہو جائیے اس "توسے ناہیں بولوں رے" والی ادا کے قربان جائیے۔ نظام رام پوری کا شعر یاد آگیا۔

اے جان کہو پھر اس ادا سے　　　میں آج نظام سے خفا ہوں

کاش ایسا ہوتا کہ بجائے "جانِ عالم" کے "جانِ نیاز" لکھ سکتا۔ ہائے غالبؔ

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　　کاش کے تم میرے لئے ہوتے"[3]

"زندگی کے دوسرے سوانح کا ضبط و شمار کیسا ــــ تاہم سنِ ولادت و وفات کی جگہ آپ "ازل تا ابد" لکھ سکتے ہیں اور سوانح زندگی کی جگہ صرف یہ شعر

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست　　　خام بدم پختہ شدم سوختم"[4]

"کبھی کبھی اپنی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیا کیجئے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ کیا وہ واقعی صحیح و درست ہیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ"[5]

"ــ ــ ــ ــ سو یہ چند لمحوں کی بات ہے۔ اس کے لئے ساری زندگی خراب کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ تم تو ایک حد تک مذہبی انسان بھی ہو۔

---

[1] مکتوبات حصہ دوم صفحہ ۴۹۔ [2] نگارستان صفحہ ۸۔ [3] مکتوبات اول صفحہ ۱۲۱۔ [4] مکتوبات اول صفحہ ۲۲۳۔ [5] من و یزداں صفحہ ۸

اس لئے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ :-

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ		آں جا کہ نظر ہائے ید اللہ می زنند[۱]

سوادِ بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کرکے تمام اُن کیفیات کی یاد ستانے لگی جن کو ہر چند میں بھلا چکا تھا۔ لیکن ان کے بھلانے کی ایذا کبھی نہیں بھول سکتا۔

جاتی ہے کشمکش کہیں اندوہ عشق کی		گو دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا[۲]

ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ نیاز اس پر بھی قادر ہیں کہ پورے شعر کی بجائے مصرع ہی پر اکتفا کریں اور مصرع کو اس خوبی اور مہارت سے عبارت میں پیوست کریں۔ کہ وہ نشتروں کا کام دے۔ مصرعوں کے استعمال کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اردو نثر نگاروں میں نیاز کا مقام سب سے ممتاز ہے۔ تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ پڑھتے پڑھتے عبارت میں مصرعے آتے چلے جاتے ہیں اور اس بے تکلفی سے کہ کہیں روانی میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً :-

ارے بھئی! ان کا کیا ہے۔ ؎		وہ جیسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں،
مشکل تو ہماری ہے کہ ؎		ڈوبنے جائیں تو دریا ملے پایاب ہمیں[۳]

"لیکن جب اپنی فراست سے اسے سمجھا تو آپ جانتے ہیں کیا ہوا ؎ ۔ خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند۔
آپ سمجھے یہ "درجات" کیا تھے درجات بے نیازی وہی ؎		نتواں ترا و جاں را بہم امتیاز کردن[۴]"

"اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں روح کا انتہائی حزن و ملال پنہا تھا۔ گویا کسی نے یہ کہا :-
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد[۵]"

"اگر جنت ایک زاہدِ شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ
فردوس را بدام نگہ می کنم شکار[۶]"

"میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لئے کہ
مستم چنانکہ گل نشناسم ز نوکِ خار۔ وغیرہ[۷]"

"وہ محسوس کرنے لگا کہ دنیا نام ہے صرف "تمہیں جلائے من و جائے تو باشد" کا[۸]"

یہ ذوق شعر ان کی طبیعت میں اتنا رچ گیا ہے کہ حافظہ کی بے پایانی نے یہ اقتدار حاصل کر لیا ہے کہ نیاز بے تکلفانہ دیکھتے جاتے ہیں اور انہیں شعر تو رہا ایک طرف مصرع بھی نہیں بلکہ ایک یک دو دو الفاظ اس طرح کے پیوست کرتے جاتے ہیں کہ قاری کا ذہن خود بخود اشعار کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے یہ چیز کمال وضاحت پر دلالت کرتی ہے کہ ایک دو لفظ

---

۱ تاثرات نیاز صفحہ ۱۰۔ ۲ مذاکرات نیاز صفحہ ۳۰۔ ۳ مکتوبات سوم صفحہ ۱۴۔ ۴ مکتوبات سوم صفحہ ۱۴۸۔ ۵ مذاکرات صفحہ ۳۳۔ ۶ من و یزداں صفحہ ۲۱۔ ۷ من و یزداں صفحہ ۳۳۸۔ ۸ شہاب کی سرگزشت صفحہ ۱۴۷

جو نکڑے یوں بھی ہوں بلکہ اگر کوئی نہ پہچانے تو یہ بھی نہ معلوم ہو سکے کہ ان کا پس منظر کیا ہے اور پس منظر کے نامعلوم ہونے کے باوجود بھی ان کی ذاتی قدر وقیمت میں فرق نہ آئے، اس طرح عبارت میں لائے جائیں کہ محض ان کے اشارے ہی سے وسیع مضامین خیال میں آجائیں اور عبارت بھی گراں بار نہ ہو

"جی ہاں کل میر صاحب تشریف لائے تھے اور جتنی "گالیاں" انھیں یاد تھیں۔ سب "صرف دعا" کر گئے۔ میں آپ کا "دعا ہی ہوں" ناچیز[1]

اس عبارت میں انھوں نے غالب کے شعر کو خوب کھپایا ہے۔

وان گیا بھی تو ان کی گالیوں کا کیا جواب　　　یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اس طرح غالب کے اس شعر کی طرف

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے　　　جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

اس عبارت میں کیسا اشارہ کیا ہے۔ دیکھئے :- "اور یقیناً یہ اجتماع بڑی "خدا ساز" بات سمجھی جاتی ہے ......"[2]

اس طرح جب ہم ان کی یہ عبارت پڑھتے ہیں :-

"آپ کو یاد ہوگا جب ہم آپ کسی وقت ایک " رند شاہد باز" کی فرضی تصویر کھینچ کر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے"[3]

تو ذہن فوراً اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا　　　اے دریغا وہ رند شاہد باز

"حکم بر ستارہ کنم" تو نہایت ضعیف سی بات ہے۔ یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے"

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

.... سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک ہاتھوں سے نازک سینوں پر "خانہ برانداز" قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر...... حقیقت یہ ہے کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں شہادت کو زندہ ورثی قرار دے یا اس "خون بہا" کو"[4]

اس عبارت سے ذہن فوراً ان دو اشعار کی طرف جاتا ہے :-

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　　اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی　　　(سوداؔ)

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ　　　شہیدان نگاہ کا کیا خوں بہا کیا　　　(غالب)

پہاڑوں کی برف پگھل پگھل کر دریائے جہلم اور ڈل جھیل کی رعنائیوں میں گرمی خرام پیدا کر رہی ہے اور ہوا کا جھونکا گویا "موج خرام" یار ہے۔ جو ہر جنبش پر گویا گل کتر کر گزر جاتا ہے"[5]

ظاہر ہے کہ خرام یار اور گل کترنے سے غالب کے اس شعر کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا　　　موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ایک اور خصوصیت جو نیاز کی نثر میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض اوقات جذبات کی شدت کے وقت ان میں ایک خطیبانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی چھوٹی سی بات کو جو مختصر عبارت میں بھی بیان کی جا سکتی ہو خوب پھیلا دیتے ہیں۔ یہ چیز بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرز نگارش" سے مماثلت رکھتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ مولانا طبعاً خطیب ہیں، اس لئے ان کی عبارت میں اس چیز کی افراط ہے۔ اور

---

[1] مذاکرات اول ص۶ - [2] مذاکرات نیاز ص ۱۳ - [3] مذاکرات نیاز ص ۱۰۸ - [4] مذاکرات نیاز ص ۱۰۸ - [5] جمالستان ص ۴۲

خطیبانہ رنگ نیاز کے مذہبی مضامین میں دوسرے مضامین کی بہ نسبت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ چند ایک مثالیں جو نیاز کی مختلف کتب سے لی گئی ہیں ملاحظہ فرمایئے :-

"میں دیکھ سکتا ہوں کہ ایک شخص مجبور ہو کر اپنے وطن کی یاد اپنے دل سے بھلا دے۔ اس منظر کو برداشت نہیں کر سکتا کہ آزادی کی حالت میں ترکِ الفت کے بہانے تلاش کئے جائیں۔ میں اس بات کو سن سکتا ہوں کہ ایک شخص عالم اضطراب میں ممنوعات اپنے اوپر جائز کر لے لیکن اس کے سننے کی تاب مجھ میں نہیں کہ صرف ہوا و ہوس کی مجبوری سے کسی لغو تاویل کو درست سمجھ لے۔ میں ایک ظالم و سخت گیر قوت کے سامنے سر جھکا دینے والوں پر ملامت نہیں کرتا خواہ وہ قوت کتنی ہی مدد دیں کیوں نہ ہو۔ لیکن میرے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ قوت سر جھکا دینے پر کسی کو مجبور نہیں کرتی اور یہ عجز زنامۂ اخلاق کا نتیجہ ہے۔ میں کسی جدید تعلیم یافتہ کو مذاقِ سلیم سے معرّا دیکھ کر اس خیال سے خاموش رہ سکتا تھا کہ یہ اس کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن اظہار نفرت و ملامت اس وقت میرے اختیار سے باہر ہے، جب میں جان لوں کہ تعلیم جدید سلب وجدان نہیں کرتی۔ میں کسی کو مجنونِ فیشن و لباس دیکھ کر اس یقین کی بنا پر دم بخود رہ سکتا ہوں کہ شاید فنونِ یورپ صرف یہی سکھاتے ہوں گے، لیکن .... الخ"[1]

"جب ارتقاء انسانیت کی یہ حالت ہے اور کارگاہ قابلیت کا یہ عالم، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جو ادبی روحانیت اور روحانی ادب سے اظہار نفرت و حقارت کو معیار قابلیت دے چکے ہیں، وہ لوگ جو فقدان شعری سے اس لئے متنفر ہیں کہ یورپ ان کا مرشد مقدس اس طرف متوجہ نہیں۔ وہ لوگ جو پاکیزہ ترین ادبی مذاق کو بھلا بیٹھے ہیں، اس بنا پر کہ ان کے پیر مغاں کا وہ مسلک نہیں، وہ لوگ جنھوں نے اپنے محاسنِ قومی و خصوصیات مذہبی سے یکسر روگردانی اختیار کر لی، اس خیال سے کہ وہ ایک مدعی تہذیب قوم کے نزدیک افسانہ ہائے پارینہ ہیں وہ لوگ .... الخ"[2]

"یہ آپ نے خوب سوال کیا کہ دنیا میں کسی چیز کا قائل بھی ہوں یا نہیں ...... اے حضرت آپ کا قائل ہوں۔ آپ کی پارسائی کا قائل ہوں۔ آپ کی شب زندہ داریوں کا قائل ہوں ......"[3]

"خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رستم و اسفندیار کی روحیں کانپ اٹھی ہوں گی۔ سکندر و نپولین کی قبروں پر لرزہ طاری ہو گیا ہو گا۔ آج کل کے سینڈو اور گاما کا کیا ذکر وہ لوگ بزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو ٹوکتے ہیں ...... الخ"

"آج سے میری تمام تحریریں ایک ایسے شخص کی تحریریں سمجھی جائیں۔ جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ...... لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا۔ اگر وہ فکر و رائے کی حریت کا دشمن نہیں ہے۔ اگر وہ بغیر اطمینان نفس پیدا کئے ہوئے بہ جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا۔ اگر وہ مجموعۂ مزخرفات و خرافات نہیں ہے اور اگر

---

[1] مقدمہ گیتان جلی ص ۶۰۰ ۔ [2] ایضاً ص ۶۰۹ ۔ [3] مکتوبات سوم ص ۴۰

وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانے میں دست گیر و راہنما بن سکتا ہے۔ تو اے مسلمانو! میں پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں۔ ان کو کیا منصب حاصل ہے کہ وہ ایک توحیدِ خداوندی کا اقرار کرنے والے کو کافر قرار دیں........"[1]

جہاں تک فقروں کی ساخت کا تعلق ہے۔ یہ بالعموم لمبے ہیں اور اس وصف میں وہ سرسید کے انداز سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔ سرسید کی بھاری بھرکم شخصیت اور ان کے وسیع و عریض مقاصد، ان کی بے پایاں ذمہ داریاں ان کی طرزِ تحریر پر اسی صورت میں اثر انداز ہوئیں۔ یعنی عبارت میں بھی ایک بھاری بھرکم پن پیدا ہوگیا۔ سرسید کی عبارت میں اور جس، لیکن اگر مگر، پھر، کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ یہی چیز بڑی حد تک نیاز کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نیاز کی ذمہ داریاں سرسید کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے، ان کی دنیا سرسید کی دنیا سے بہت وسیع ہے۔ نیاز نے بہت زیادہ لکھا ہے اور مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس چیز میں ان کی طبیعت کی جولانی کے علاوہ ان کا اڈیٹر ہونا بھی کسی حد تک ممد ہے۔ یعنی ایک تو طبیعت کی اس افتاد کے سبب کہ وہ جلد جلد اور تیز تیز اپنے مطالب کا بیان کرنا چاہتے تھے۔ ان کے فقرے لمبے ہو گئے اور جو۔ جس وغیرہ کی قبیل کے الفاظ زیادہ استعمال میں آئے۔ دوسرے ایک رسالہ کے اڈیٹر ہونے کی وجہ سے بعض اوقات انھیں نصف یا اس سے بھی زاید پرچہ خود ہی لکھ کر پورا کرنا پڑتا تھا[2]۔ اس وجہ سے بھی انھیں بہت زیادہ اور بہت مختلف موضوعات پر قلم اٹھانا پڑا۔ جس کی وجہ سے جہاں مضامین وسیع ہوئے وہاں عبارت کے جوڑ بند بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ نہیں کہ نیاز کے ہاں چھوٹے فقرے نہیں پائے جاتے۔ چھوٹے فقرے بھی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ان کی عبارت رواں ہونے کے باوجود کسی حد تک پھیکی ہو جاتی۔ خطوط میں زیادہ حد تک چھوٹے چھوٹے فقرے استعمال کرتے ہیں اور مذہبی بحثوں میں زیادہ تر طویل فقرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں موضوع زیادہ سنجیدہ ہو اور امور بحث طلب ہوں وہاں فقرے لمبے ہو جاتے ہیں۔ جو باتیں محض شگفتگیِ خاطر کے لئے لکھی جائیں ان میں فقرات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ ان کے طرزِ تحریر کی چند مجموعی خصوصیات ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ ہر موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے اور مضمون کے لحاظ سے ایک جدا اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ افسانہ اس میں بھی رومانی اور عام اخلاقی افسانہ۔ استدلالی مذہبی مضامین، انشائے لطیف۔ عام علمی مضامین۔ تنقید اور خطوط وغیرہ موضوعات ایک دوسرے سے بُعدِ بعیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی مصنف کے مختلف موضوعات کی عبارتیں بالکل یکساں نہیں ہوتیں۔ مصنف کی طبیعت کا جزو اہم ان میں قدرِ مشترک کے طور پر ضرور موجود ہوتا ہے اور اس سے اس کا مصنف پہچانا جا سکتا ہے۔ خواہ موضوع کوئی کیوں نہ ہو لیکن مضامین کے اپنے اپنے لب و لہجہ کے تفاوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مولانا محمد حسین آزاد کی عبارات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ اکبری۔ آبِ حیات۔ نیرنگِ خیال؛ بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ لیکن سیرِ ایران اور ان کے خطوط کا اسلوب ان سے مختلف ہے۔ سخندانِ فارس نہ ان کے خطوط کی طرح سادہ ہے نہ آبِ حیات کی طرح پرکار۔ قصصِ ہند اور درسی کتابیں جو مولانا نے نادانستہ آسان عبارت میں لکھیں۔ ان کا انداز اور اسلوب جداگانہ ہے لیکن ان تمام ظاہری فرق کے باوجود مولانا کی طبیعت کا خلوص اور دردمندی ہر جگہ کارفرما

---

[1] من ویزداں صفحہ ۱۲۳۔ [2] ۱۹۳۰ء کے قریب کے رسائل ملاحظہ ہوں۔ س

ر آزاد کا شخصی رنگ ہر عبارت میں جو پیدا ہے۔ اس لئے یہ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ عبارت کا مصنف کون ہے۔ یہی حال لانا شبلی کا ہے۔ انھوں نے سیاسی تاریخیں بھی لکھیں اور علمی ادبی مضامین بھی لکھے اور خطوط بھی۔ لیکن شعر العجم میں جو دلکشی ہے، رہے کہ وہ الغزالی میں نہیں ہو سکتی۔ اور جو دل آویزی ان کے خطوط میں ہے وہ مقالات میں نہیں اور لطف تو یہ ہے کہ خود ان کے وط لطف اور چاشنی کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو عطیہ فیضی کو لکھے گئے اور باقی وہ جو مکاتیب شبلی شامل ہیں۔ تاہم شبلی اپنی ہر تحریر میں موجود ہیں۔ ان کی حساس طبیعت اور مزاج کی نزاکت ہر جگہ نمایاں ہے۔ بعینہٖ یہی حال نیاز کی یدوں کا ہے۔ ان کی کوئی تحریر اٹھا کر دیکھ لی جائے۔ نیاز کی مضطرب طبیعت اس میں جلوہ گر ہوگی۔ ہر جگہ عبارت کی طراری اور لہ انگیزی اپنے مصنف کی شخصیت کی آئینہ دار نظر آئے گی۔

بہر حال یہ درست ہے کہ نیاز کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت بہت زیادہ تھی۔ اس زمانہ میں ٹیگور کا اثر ان پر زیادہ تھا۔ مضامین لی بھی بے افراط تھے اور مجرد تشبیہات کی بھی کمی نہیں تھی۔ ان کی وہ نثر بیدل کی شاعری سے مماثل کہی جا سکتی ہے۔ جو خوبی اور عنائی باوجود لفظاً بھی اور معناً بھی مشکل تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں وہ دلکشی تھی کہ نوجوانوں نے ان کے اسلوب کی تقلید کرنا چاہی اور ان ھی وہی حشر ہوا جو بیدل کی شاعری کے مقلدین کا ہوا۔ یہ چیز عجیب و غریب ہے کہ ایک شاعر اپنے مقلدین سے گھبرا کر اپنی روش میں مناسب م کرنے پر مجبور ہو جیسا کہ تاجور نجیب آبادی نے لکھا ہے[۲] اس امر کے متعلق عزیز احمد نے اپنی مشہور تصنیف "ترقی پسند ادب" میں مواخذہ کیا ہے انھی اس رومانیت پسندی کو ادب برائے ادب کے مسلک سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ "اگر جدید اردو ادب میں واقعتاً ادب برائے ب کسی کا مسلک رہا ہے تو وہ نیاز فتحپوری ہیں۔ اور اس کا نتیجہ دیکھنے کے لئے ملاحظہ ہو "شاعر کا انجام" کا تمہید[۳]۔ اس تمہید کا ایک حصہ ں نقل کیا جاتا ہے۔ "اے دلِ دیوانہ! اپنے نغمہ ہائے شکستہ تیرے ہی سازِ بے خودی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے، یہ عرضِ نغمہ یری ہی ہستی متالم کے حضور میں خجلتِ کاوش نہ ثابت ہو" ظاہر ہے کہ یہ رنگ آخر تک قائم نہیں رہا۔ نیاز خود اس طرف متوجہ ہوئے اور ادت کو سہل بنانے کی کوشش کی۔ بعض مقامات پر انداز بیان کو بدل دیا اور بعض مقامات پر بہ خیال خود غیر ضروری عبارت کو کاٹ دیا۔ ہاب کی سرگزشت کے پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشن میں اس قسم کا ردّ و بدل ملتا ہے[۴]۔

ں طرح انہوں نے متعدد جگہ عبارت کو مختصر کر کے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ عبارت :-

"غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو۔ اور یقین کرتے ہو کہ زمانہ اس صدمہ کو بھلا دے گا۔ مجھ سے معافی چاہ کر اس خلا کو پُر کر دوگے۔ جو مراسم محبت میں پیدا ہو گیا ہو۔ ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ میں کمی پیدا کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم مجھ سے طلبِ عفو کرو۔ لیکن محمود یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو"[۵]

ب اس طرح ہے :-

"غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو۔ ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ کو کم کر دے۔ لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو"[۶]

---

[۱] روحِ انتخاب ص ۲۳۲ - [۲] ترقی پسند ادب ص ۱۶ - [۳] شہاب کی سرگزشت (پرانا ایڈیشن)
[۴] شہاب کی سرگزشت (نیا ایڈیشن) ص ۱۲ [۵] شہاب کی سرگزشت (پرانا ایڈیشن) ص ۸۴، ۸۵
[۶] " " (جدید ایڈیشن) ص ۶۹

"دُنیا میں ایک خود غرض شخص سب سے پہلے جن لوگوں کو اپنے حملہ کا مستحق سمجھتا ہے۔ وہ اُس کے احباب ہوتے ہیں۔"[1]

اب یہ فقرہ اس طرح ہے :-

"دُنیا میں ایک شخص سب سے پہلے اپنے حملہ کا مستحق احباب ہی کو سمجھتا ہے۔"[2]

"البتہ القمر اپنی تمام بے حجابیوں اور بے باکیوں کے ساتھ نہ رُکنے والی جوانی کی طرح اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شراب زرّیں چھلکاتی ہوئی آ رہی تھی۔"[3]

اس کو اس طرح بدل دیتے ہیں :-

"اُدھر چاند کی دیوی اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شراب زرّیں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی۔"[4]

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شروع کی تحریروں سے اب کی تحریریں کچھ مختلف ضرور ہیں۔ فقروں کی ساخت اور ان میں مشکل الفاظ کی کمی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ عنفوانِ شباب کے جوش اور ادھیڑ عمر کے سکون سے عبارت میں کتنا فرق آ جاتا ہے۔ شہاب کی سرگزشت کے نئے اڈیشن میں بعض جگہ فقرے کے فقرے جو اب شاید انکو غیر شائستہ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کاٹ دئے ہیں۔

نیاز کی عبارت میں خامیاں بھی ہیں وہ بعض اوقات عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے ایک تو عبارت میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے عبارت عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ کا استعمال غیر شعوری طور پر کر جاتے ہوں کیونکہ عربی فارسی کا مطالعہ انہوں نے کافی کیا ہے مگر اردو کی سلاست میں اس سے ضرور فرق آ جاتا ہے۔

"دُنیائے شاعری مشکل سے ایسے "ایجازِ سحر بیز" "بیانِ جزیل" اور "عبارتِ انیق" کی پاکیزہ مثال پیش کر سکتی ہے۔ مومن اسلوبِ ادا اور قدرتِ بیان کا بادشاہ ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدت پیدا ہو جاتی ہے ......"[5]

اس قسم کی عبارتیں ان کی ہر کتاب میں مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر "ایک شاعر کا انجام" کے چند فقرے نقل کرتے ہیں :-

"میرے کوائف سے استجاد حقیقتی ہے۔" "آج کم و بیش ۳۰ دن ہوئے جب مجھ سے اس نامساعد مناکحت کی تقریب میں قبول کیا۔" "اس کی آنکھیں یوں تو اب بھی مترحم اور عاشقانہ کیف کا محل نظر آئیں۔" "میرے لئے وجہ نکوہش ہے۔" "اس کی نگاہوں کی عادت مستمرہ ہو گی۔" وغیرہ

اسی طرح نگارستان میں بھی ہمیں اس قسم کے فقرے مل جاتے ہیں۔ "اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے استرحام پیدا کر کے ......" "رسم مناکحت فاطمہ مسعود عقد فاضل پر اسم البنی درود شروع کر دیا۔" نگارستان کے پرانے اڈیشن سے بھی چند فقرے ملاحظہ ہوں :-

- "اس کے پاس ایک ساختہ سحر گھوڑا تھا۔" "جسارت مستمرہ اور سلاست مقالی عود کر آئی"

اور "بھر طیران" بجائے اُڑان کے استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات نیاز خود بھی اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کے بعض الفاظ قاری کے لئے آسان نہیں۔ اس لئے وہ کئی دفعہ قوسین میں معنی بھی لکھ دیتے ہیں۔ جیسے "طیور جمیل کی حصیلات (پپوٹوں) کو زرد گیاہ کے دانوں پر بھرنے سے مامور تھے۔"

---

[1] شہاب کی سرگزشت (پرانا اڈیشن) ص ۴۴۔ [2] شہاب کی سرگزشت (نیا اڈیشن) ص ۸۷، [3] شہاب کی سرگزشت (نیا اڈیشن) ص ۱۱۷ [4] مثلاً جدید اڈیشن ص ۱۶۱ لیکن پرانے اڈیشن کا ص ۱۸۹۔ [5] انتقادیات حصہ اول ص ۳۶ [6] جمالستان ص ۶۹

مجموعی اعتبار سے نیازؔ کا طرزِ نگارش اور اسلوب بیان ایک جداگانہ شان کا مالک ہے جس طرح ان کی شخصیت دیگر مصنفین کی شخصیتوں سے مختلف ہے اسی طرح ان کا اسلوب دوسروں کے اسالیب سے جُدا ہے۔ ہم ان کی تحریروں کو کسی اور مصنف کی تحریروں کے مماثل نہیں قرار دے سکتے وہ مذہبی معاملات میں سرسید کی طرح سوچتے ہیں۔ لیکن مذہبی مضامین پر قلم اٹھاتے وقت سرسید کی سی سادگی اور استدلال کا کڑاپن برقرار نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی ابوالکلام آزاد کی طرح خطیبانہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی سی متانت اور سنجیدگی قائم نہیں رکھ سکتے۔ حالیؔ کی سادگی سے اُن کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نہ محمد حسین آزادؔ کی طرح ان کی عبارت میں تصویریت اور شدتِ احساس کا غلبہ ہے۔ مرزا غالبؔ کی نثر سے بھی ان کی نثر کو کوئی مناسبت قریبہ نہیں۔ کیونکہ غالبؔ کی شوخی اور بے تکلفی میں بھی ایک وضع داری موجود ہے۔ اگرچہ نیازؔ اپنے خطوط میں شوخی اور بے تکلفی سے پوری طرح کام لیتے ہیں۔ لیکن اس وضعداری اور برگزیدگی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ تاہم اپنی جگہ نیازؔ کی نثر کسی بھی دوسرے مصنف کی نثر سے کم رتبہ نہیں کہی جاسکتی اور نہ ان کو کسی کا مقلد قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ "اسلوب نگارش ایک ذاتی جوہر ہے ..... انسان کی ذہنی ساخت کا اثر اس کی عبارت پر پڑتا ہے۔ الفاظ کی دروبست اور ان کا محل استعمال، شخصی تخیل، زبان پر قدرت اور لطیف جمالیاتی احساس یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کے اتباع سے حاصل نہیں ہوتیں۔ انشا پردازی کے اصول جان لینے سے کبھی بھی بڑا انشا پرداز پیدا نہیں ہوتا۔"[1]

نیازؔ کا طرز نگارش بڑا دلکش و دلفریب ہے۔ عبارت میں ایک حرکت ہے اور زندگی پیوست، خشکی اور بے رونقی کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔ نئی نئی ترکیبیں، نیا نیا اسلوب بیان اور بدیع مطالب کے سبب جگہ جگہ گل ہائے رنگا رنگ کی نمود نظر آتی ہے۔

ان کی تحریروں میں نشیب و فراز ہیں۔ مذہبی مضامین میں ایک کڑا پن بھی اور طعن و تشنیع کی دلآویزی بھی۔ مالہ وماعلیہ میں بے باکی بھی ہے اور سخت گیری بھی، خطوط میں شیرینی بھی ہے اور شوخی بھی۔ غرض مکمل یکسانی و یک رنگی نہیں ہے۔ لیکن اس اختلافِ لب و لہجہ کی حیثیت وہی ہے جو مختلف رنگ پھولوں کی غالب نے بتا دیئے ہیں۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

یہ ساری چیزیں مل کر نیازؔ کے اسلوب کی تعمیر کرتی ہیں اور یہی رنگا رنگی اُن کے انداز کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے۔

—— * —— * —— * —— * —— * ——

نیاز و نگار فکر و فن کی کسوٹی پر

ملک محمد اسماعیل خاں ایم۔اے

سرسید کو جدید اردو نثر کا "مورث اعلیٰ" اور "بانی مبانی" کہا جاتا ہے (اگرچہ میں غالب کے رقعات کے ہوتے ہوئے اس سے متفق نہیں ہوں کیونکہ غالب کے خطوط ہی سے جدید نثر کی تشکیل ہوئی ہے ——————— اور اسالیب کے مختلف النوع دھارے غالب کے خطوط ہی سے نکلے ہیں۔ متعدد اہل قلم ——————— نے غالب کے خطوط ہی سے کسب فیض کیا ہے، اس کے علاوہ جدید اردو نثر کی بعض دیگر خوبیاں بھی خطوط غالب ہی کی رہین منت اور ان کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ تفصیل میں پڑنے کی موقع نہیں)۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو "مسجع، مقفیٰ، مرصع عبارت" سے آزاد کر کے سلیس و آسان نگاری کی نئی اور "نامودہ" راہ دکھائی اور ان کی یہ کوشش قطعاً شعوری وارادی تھی۔ سرسید کی اس کوشش کے شعوری ہونے سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ غالب کی نثر کی ہی ترقی یافتہ شکل تھی جو منظم و مربوط طریقے سے مضمون کی شکل میں اصلاح و تبلیغ ..... (Preaching) کے لئے استعمال کی گئی، خود سرسید کو اس کا احساس تھا چنانچہ انہوں نے اس کا اظہار اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔

"غالب، ذوق، مومن اور ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو، میر اثر نے آسان اردو میں کوئی کہانی لکھ دی ہو۔ جو اس سے زیادہ نہیں جو ایک بوڑھی بڑھیا بچوں کو سلانے کے لئے ان کو سناتی ہے، مضمون نگاری بالکل دوسری چیز ہے جو اس سے قبل اردو ادب میں موجود نہ تھی، یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی ہے۔ اور ابھی بالکل بچپن کی حالت میں ہے۔" اس سے اردو ادب کو بہت فائدہ پہنچا اور مضمون (Article) نویسی کا اردو میں جلد کافی رواج ہو گیا، لیکن اس کا اصل سرچشمہ وہی غالب کے خطوط ہیں جن میں باوجود سادگی و سلاست کے بڑی شادابی، بڑا کیف اور لطافت تھی۔ گو سرسید نے اس سرچشمہ سے استفادہ کیا جس سے ان کی نثر مستفیض اور اثر پذیر ہوئی تھی کہیں اقرار نہیں کیا لیکن ارباب نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ سرسید نے نثر سے اصلاح و تبلیغ کا کام لیا، ان کا یہ شعوری اقدام رائگاں نہیں گیا۔ لیکن سرسید کی نثر نے اردو ادب میں جو خشکی اور خشونت پیدا کر دی تھی۔ اس سے بھی کسی کو انکار ممکن نہ ہوگا چونکہ ان کے پیش نظر محض قوم اور ادب کی اصلاح تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی نثر کی خشکی و بے کیفی کی طرف بھول کر بھی غور نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ ہوا کہ خود ان کے علاوہ دیگر اہل قلم بھی "منطقی استدلال" کے چکر میں پڑ کر اس "ادبیت" سے محروم ہو گئے جو ردعمل کے طور پر شبلی سے شروع ہوئی اور جس کا اثر شبلی کے بعد کی نسل پر کافی نمایاں ہے، انہی وجوہ سے ڈاکٹر عبداللہ نے سرسید کی نثر کو "بدویانہ نثر" کہا ہے۔ اس طرز کی نثر نے اپنا اثر کافی حد تک پھیلایا اور دیگر ممتاز اور اچھے لکھنے والے اس کی لپیٹ میں آ گئے، حالی جیسا شخص سرسید کے اثر سے صرف ایک "معلم اخلاق" اور "ناصح قوم" بن کر رہ گیا، شعر ہو یا نثر ہر جگہ وہ ناصح اور واعظ کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ یہ حالی کی خوش قسمتی تھی

کہ انھوں نے تنقید و سوانح کی طرف توجہ کی اور حسن اتفاق کہ تنقید کے لئے یہ اسلوب جو سرسید کے اثر کے سلسلے میں پروان چڑھا تھا اور جیسے حالی کی طبیعت و مزاج کی معصومیت و نرمی نے جلا دی، بڑی حد تک موزوں و مناسب قرار پایا...... اس خامہ فرسائی سے مقصود صرف یہ ہے کہ سرسید کی کوششوں سے اردو میں سادگی و سلاست کے ساتھ ہی کیفی بدمزگی اور خشکی بھی راہ پانے لگی تھی، جو ادب میں منطقی استدلال اور خشک انداز کو جگہ دیکر "ادبیت" کو آہستہ آہستہ ختم کر رہی تھی۔ لیکن اس کا سد باب بھی لازم و ناگزیر تھا جو شبلی کی رنگین و پرکیف نثر کی صورت میں رونما ہوا اور پھر آگے چل کر یہ لے اتنی بڑھی کہ "ادب لطیف" کی تحریک معرض وجود میں آگئی۔ جو تمام تر شراب و شعر اور نغمہ و سرود میں ڈوبی ہوئی تھی اس تحریک کی تشکیل میں ٹیگور کے اثرات اور مخزن کا بڑا ہاتھ تھا ساتھ ہی مغربی ادب سے بھی لوگ خاصے آشنا اور متاثر ہو چکے تھے۔

انشائے لطیف اور نیاز

اس تحریک کے علمبرداروں میں نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، مہدی افادی، لطیف الدین احمد اور قاضی عبد الغفار امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں بھی نیاز، سجاد انصاری اور مہدی افادی خاص طور پر ممتاز ہیں۔ نیاز صاحب کی تحریریں ابتدا میں تمام تر نغمہ و شعر اور عشق و حسن کی سرمستیوں اور رعنائیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور ہر لطیف و لطیف شے خصوصاً عورت، نغمہ، موسیقی ان کے اعصاب پر بُری طرح سوار تھی۔ نیاز صاحب کی اس عہد کی تحریروں پر نظر ڈالیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ

ان کے افسانوں اور مضامین میں ادبیت و رنگینی، فارسی کے مترنم الفاظ اور موسیقی آمیز خوشنما تراکیب کے عزفہ سے بھی آئی ہے اور عالم شباب کی سرمستی و کیف زائی کا کرشمہ بھی اس میں نظر آتا ہے، کوئی موضوع ہو اس وقت ان کا قلم ہر موضوع پر رنگینیاں بکھیرتا ہوا چلتا ہے، ادب کا کوئی شعبہ الیسا نہ تھا جو ان کے کلک کیف بار کی مست خرامی سے سیراب و سرشار نہ ہوا ہو۔ نیاز صاحب کے اس عہد کے لکھے ہوئے افسانے اور مضامین ادب لطیف کی نادر مثالیں ہیں ان میں "شباب و موسیقی" کا وہ آبشار ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی موجوں میں بہا لیجاتا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچکر محو و مگن ہو جاتے ہیں جو یکسر "نور و نغمہ" اور "عورت و شراب" سے معمور ہے، اس قسم کے مضامین میں نیاز صاحب کہیں کہیں مہدی افادی اور سجاد انصاری سے آگے نکل گئے ہیں۔ مہدی اور سجاد انصاری کے پاس خیال کی لطافت و نزاکت نیاز سے زیادہ ہے لیکن نیاز صاحب کا حیرت انگیز رنگین اسلوب بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ یہ تمام افسانے اور مضامین (جمالستان، نگارستان اور مطالعات نیاز وغیرہ) موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے "نغمہ و حسن" میں ڈوبے ہوئے ہیں (انتہا یہ ہے کہ "برسات" پر اگر نیاز صاحب کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہاں بھی اظہار خیال کا وہی عالم نظر آتا ہے۔ تخیل کے چھلاوے یہاں دوسری طرح سے لالہ کاری کرتے ہیں، یہاں فطرت ایک حسین دوشیزہ کی شکل میں ہمیں مسحور و متاثر کرتی ہے۔

یہ برسات شعرا کی بیان کردہ برسات نہیں بلکہ کیف و جمال کا وہ مرقع ہے جسکو پڑھ کر ہمارے دل سرشار اور روح طرب ناک ہو جاتی ہے، یہاں ... (Observation) کے بجائے شاعرانہ تخیل (Imagination) کے کرشمے نظر آتے ہیں اور اس شخص کے نقطۂ نظر کو سامنے رہ جاتی ہے جو دنیا کی محفلوں سے اکتا کر "صحرا نشین" ہو چکا ہے اور صحرا کی ہر شے سے اُسی طرح لذت اندوز ہو رہا ہے جس کی تشریح اقبال نے اپنی نظم "ایک آرزو" میں کی ہے اور پھر برسات کی رعنائیاں اور کیف زائیاں بھی اس کے لئے اُسی طرح نظر نواز اور مست کن ہیں۔ "برسات" نیاز کی "انشائے لطیف" کی بڑی کیف آفریں اور اثر انگیز مثال ہے۔ غرض کہ نیاز صاحب کے اس قسم کے مضامین بڑے رنگین اور بڑے کیف آگیں ہیں، ان میں لطافت و رعنائی کا وہ آبشار موجزن ہے جس کو پڑھ کر قاری اس کی موجوں میں بہے بغیر نہیں رہ سکتا اور ایک ایسی تخیلی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں ؎

"جہاں نغمے ہی نغمے ہیں جہاں مستی ہی مستی ہے"

اس زمانے میں مولانا ابو الکلام آزاد کا قلم جس طرح سیاست کے میدان میں آتش باریاں کر رہا تھا۔ نیاز کا قلم ادب کے ایوان میں سرمستیوں، رعنائیوں اور لطافتوں کی خنکیاں بکھیر رہا تھا۔ دونوں میں باوجود ہمعصر ہونے کے بعد المشرقین تھا...... یہ تھی وہ "ادبیت" جو ایک تحریک کے ردِ عمل کے طور پر ایک دوسری تحریک کی شکل میں وجود میں آئی تھی۔ اور یہی نیاز کی سحر طراز انشاپردازی کا وہ "جمالیاتی اسلوب" تھا جس نے اردو ادب کو ایک نئی "ادبیت" اور نئے آہنگ سے آشنا کیا، اور نیاز فتحپوری کا اپنا ایک منفرد اسلوب بن گیا جو بتدریج زمانہ کیساتھ ساتھ ادب کے میدان میں آگے کو بڑھتا رہا۔

نیاز اور مذہب

نیاز صاحب کو مذہبی موضوعات سے بھی ابتدا سے بڑی دلچسپی اور شغف رہا ہے اور مذہبی موضوعات پر لکھنے کی ابتدا بھی اسی عہد سے ہوئی تھی۔ جو ان کے "شباب" کی نیرنگیوں اور کیف آفرینیوں کا دور تھا، لیکن اس عہد میں بھی نیاز نے مذہب پر یا مذہب سے متعلق بعض امور پر خامہ فرسائی محض چھیڑ چھاڑ یا ذہنی چٹخارے کے لئے نہیں کی بلکہ بعض ان صداقتوں اور حقیقتوں کو نمایاں کرنے کے لیے جو روایت پرستی اور اوہام پرستی کے بادل میں چھپ کر کچھ سے کچھ ہو کر رہ گئی تھیں اور نفسیاتی ژرف بینی اور غیر جانبداری سے ان پر کسی عالم دین نے غور نہیں کیا تھا۔ نیاز صاحب نے بعض ایسے امور و موضوعات پر قلم اٹھایا، نتیجہ میں مخالفت کا سیلاب عظیم امڈ آیا اور ہر طرف سے نیاز صاحب کو دہریہ، لامذہب کافر و زندیق، ان کی تحریروں کو کفر اور ان کے نگار کو صحیفہ کفر کہا جانے لگا۔ اس آزاد خیالی نے روایت پرستی، اوہام پرستی کے ساتھ خانقاہ پرستی بلکہ مولوی پرستی کے بت کو بھی چکنا چور کر دیا اور صحت عقل اور آزاد ذہن کے ساتھ ہر بات پر غور کرنے اور ہر پہلو کے نشیب و فراز کو سمجھنے کا شعور عطا کیا، اس طوفان مخالفت کو اگر اسی زمانے کے پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو ہم کو کم و بیش نیاز کے مخالفوں میں بھی اسی طرح کے چہرے نظر آتے ہیں جو سر سید کے زمانے میں انھیں "نیچری، کرسٹان اور لامذہب" کہنے والوں میں نظر آتے تھے، ان چہروں میں ریش و بروت والے چہرے بھی ملیں گے اور کرزنی بھی جنھیں اوہام پرستی سے ابھی نجات نہیں ملی تھی۔ مولوی چونکہ ہر چیز کو خود ساختہ عقاید و توہمات کی عینک سے دیکھنے کے عادی تھے اس لیے انہوں نے فوراً کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ جنت و دوزخ کا یہ تصور کہ "انسان کے برے اعمال کا صلہ دنیا میں پریشان کن اور آلام انگیز زندگی کی صورت میں ملتا ہے اور اچھے اور صالح اعمال کا صلہ سکون بخش اور اطمینان اور آسودگی آمیز شکل میں" کوئی خود ساختہ نظریہ نہ تھا۔ البتہ توجیہہ نئی اور سوچی سمجھی ہوئی تھی، لیکن اس نظریے سے قطعی مختلف تھا جو مولویوں اور علمائے دین نے تصور کر رکھا تھا۔ نیاز نے اس نظریے کے غلط ہونے پر بحث نہیں کی ان کا یہ قول تھا کہ آئندہ سزا و جزا اور بخشش و عذاب کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان کا نظریہ صرف یہ تھا کہ انسان دنیا میں جو بداعمالیاں کرتا ہے یا جو گناہ و لغزشیں یا نیکیاں اور اعمال صالح اس سے سرزد ہوتے ہیں ان کا نتیجہ یہاں دنیا میں "ذہنی جنت و دوزخ" کی شکل میں ملتا ہے، اسی طرح عبادت، خیر و شر اور دوسرے معتقدات کا جو تصور پرانے علماء نے قائم کر رکھا تھا اس سے بھی نیاز صاحب نے اختلاف کیا اور اس کی جگہ عقل سلیم سے کام لیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان کے اعمال ہی اصل کی حیثیت رکھتے ہیں اگر ان میں خرابی اور کمزوری ہے تو عقاید و عبادات اور شرعی احکام کی پاسداری کی کوئی طاقت اسے اونچا نہیں اٹھا سکتی، نہ اس میں وہ بلندی و علو پیدا کر سکتی ہے جو اعلیٰ کرداری سے انسان میں پیدا ہو سکتا ہے۔ نیاز کی اس قسم کی تمام تحریروں میں ایک ـ (Himanistic Point of View) ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جو انسانی نفسیات کو سمجھنے کے بعد پیدا ہوا ہے۔

غرض کہ جس طرح سر سید کے عقلی استدلال کا مذاق اڑایا گیا، ان کو انگریزیت سے مرعوب اور "انگریز زادہ" کہا گیا، ان کی تفسیر کلام پاک کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ اسی طرح نیاز کے ان عقلی دلائل اور عقل و درایت سے تعلق رکھنے والے نظریات و خیالات اور روایت و اوہام دشمن عقاید کو بھی، درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لوگ اب ان کے "مذہبیات" کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور ان کو "صحیفہ کفر" سمجھ کر چھونا برا نہیں سمجھتے، بلکہ میں نے تو بعضوں کو یہ تک کہتے سنا ہے کہ "نیاز کے مذہب کا تصور مولویوں کے تصور سے کہیں زیادہ وقیع اور خیال انگیز ہے۔ اور موجودہ فضا و ماحول کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔" یہ قول کسی آزاد خیال، لاابالی، یا مذہب نا آشنا شخص کا نہیں ہے۔ نیاز کا تصور مذہب نہ کسی اثر کا نتیجہ تھا نہ عالم شباب کی سرمستیوں کا پیدا کردہ۔ بلکہ وہ صرف ان کے عمیق مشاہدے، گہرے مطالعہ اور خدا اور اسکی کائنات یعنی نوع انسانی کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ مجھے نیاز صاحب کے مذہبی تصورات و نظریات میں آفاقیت آشنا بلندی اور عظمت (۔۔۔۔ (Greatness) نظر آتی ہے، ان کا یہ نظریہ نہ روایت دشمن تھا اور نہ روایت پرست، بلکہ قدیم غیر فطری عقاید و نظریات اور بعض مسلمات کو عقل کی میزان میں تولنے اور پرکھنے کے بعد قائم کیا گیا تھا۔

نیاز بحیثیت نقاد

نیاز صاحب تنقید کے ممتاز اور اہم نقاد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تنقیدوں میں ذاتی پسند یا ناپسند کو زیادہ دخل ہے لیکن پھر بھی وہ اردو کے اہم نقادوں میں اور اس سلسلے میں انکی تنقیدی خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، نیاز صاحب

کے یہاں مجموعی طور پر نظریاتی تنقید (Ideological Criticism) سے زیادہ عملی تنقید (Applied Criticism) کی مثالیں ملتی ہیں ان کی بہت سی تنقیدوں کو تاثراتی تنقید (Sentimental Criticism) کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں پر انہوں نے محض فنی حیثیت سے شاعروں کے کلام کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے وہاں ان کی تنقید بھی زیادہ تر یک رخی ہو کر رہ گئی ہیں، ان کا خیال ہے کہ "شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ معائب سے پاک ہو" اگر اس نظریہ کی روشنی میں کسی شاعر کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں بجز مایوسی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ شیکسپیئر (Shakespeare) اور پوپ (Pope) دونوں اپنی اپنی جگہ بڑی حیثیت کے مالک ہیں۔ جہاں تک فنی حیثیت کا تعلق ہے۔ پوپ کا کلام شیکسپیئر کے مقابلہ میں بڑی حد تک اسقام و معائب سے پاک اور بڑی وقعت کا حامل ہے لیکن جو عظمت اور قبول عام شیکسپیئر کو نصیب ہوئی کسی شاعر کو حاصل نہ ہو سکتی، دوسرے پوپ کا کلام بھی فنی اعتبار سے اسقام سے بالکل مبرّا نہیں ہے بلکہ لازمۂ بشریت کے تحت بہت سی لغزشیں اور کوتاہیاں اس کے ہاں ملتی ہیں۔ جن کی طرف بعض مغربی نقادوں (Western Critics) نے اشارے کئے ہیں۔ مثلاً اردو میں فیض کو لے لیجئے۔ سرور صاحب کے بقول :۔ "فیض کے یہاں زبان کی خامیاں ہیں مگر اس کے یہاں جو جادو ہے اس کے مقابلے میں اُن خامیوں کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ فیض کی زبان پر اعتراض کرتے وقت ایک بات نہیں بھولنا چاہیئے، فیض جس نسل کے شاعر ہیں وہ اپنے کلاسکل سرمایے سے واقف ہے مگر اس کے گرد و پیش کی زبان خاصی بدل گئی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ فیض کی غلطیاں غلطیاں نہیں مگر یہ معنے ضرور ہیں کہ یہ غلطیاں ایسی اہم نہیں کہ نیاز صاحب کی طرح نظر صدیقی ان کی اصلاح کی زحمت کریں۔ کیونکہ جگر یا فیض کی اصلاح کرنے سے ممکن ہے ان کی غلطیاں دور ہو جائیں مگر غلطیوں کے ساتھ اُن اشعار کی وہ کیفیت بھی جاتی رہتی ہے۔"

نیاز صاحب کا یہ خیال صرف اس اعتبار سے قابلِ اعتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی تنقیدوں کا مقصد یہ تھا۔ کہ ادب میں زیادہ بے راہ روی نہ پھیلنے پائے یا ادبی انارکی (Anarchism) کا فتنہ سر نہ اٹھائے اور سن رسیدہ اور کہنہ مشق شاعروں کی کج زبانیاں اور لغزشیں آنیوالی نسل کے لئے دلیل راہ کا سبب نہ بنیں، اس سلسلے میں جہاں تک عروض و قواعد پر دسترس اور زباں دانی کا تعلق ہے نیاز صاحب اس وقت بلاشبہ ہندوستان و پاکستان کے دو ایک "فضلائے اجل" میں سے ایک ہیں۔ یہ خوبی یا تو مجھے نیاز صاحب میں نظر آئی یا پھر ان کے بعد یہ مہارت و قدرت پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کی ذات والاصفات میں ملتی ہے!

نیاز صاحب کے یہاں مولوی عبدالحق مرحوم کی طرح "قوتِ فیصلہ" کی کمی نہیں، انہوں نے بہت سے تنقیدی فیصلے دیئے ہیں، اور بہت سے شاعروں کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین بھی کیا ہے لیکن یہاں بھی انکی ذاتی پسند و ناپسند اور تاثرات فیصلوں پر غالب آ گئے ہیں اور بعض بعض فیصلے بالکل یک رخے اور "تاثرات و تعصبات" کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ نقاد ہونے کے باوجود اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ تنقید کا فن کچھ اصول رکھتا ہے۔ اور نقاد کے کچھ فرائض بھی ہیں جنکو نظر انداز کر کے تنقید و نقاد دونوں کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ نقاد نہ تو وکیل ہوتا ہے اور نہ مولوی، وہ مبصر یا پارکھ ہوتا ہے وہ حسن و قبح کو دیکھتا ہے وہ کثرت کے متعلق حکم لگاتا ہے مگر قلت کو سرے سے نظر انداز نہیں کرتا۔ رچرڈس نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ "ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں پہلی ضروری ہیں۔ اس کیفیتِ ذہنی تک پہنچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے، تجربات اور تجربات میں امتیاز کرنا تاکہ انکی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، قدریں کا نباض ہونا" نقاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر طرح سے اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہو اور اسے کافی صبر و ضبط کی طاقت حاصل ہو، وہ ایک کھلا ہوا ذہن رکھے اور اس کو غیر جانب دار (Disinterested ....) ہونے کی اشد ضرورت ہے!

جن عملی تنقیدوں میں نیاز صاحب نے ذاتی پسند و ناپسند کو دخل دیا ہے وہاں وہ ضرور ذاتی تاثرات اور وفورِ جذبات کا شکار ہو گئے ہیں۔ مثلاً مومن پر ہی ان کے مضمون کو لے لیجئے، اور ان کے اس جملے کو یاد کیجئے جو انہوں نے مومن پر مضمون شروع کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اگر میرے سامنے تمام شعرائے اردو کے دواوین میں سے کسی ایک کے انتخاب کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کلیاتِ مومن اٹھاؤں گا" حرف میر کا استثنا کیا تھا حالانکہ

اہل بصیرت اور نقادانِ ادب اردو ادب میں مومن کے مرتبے سے خوب واقف ہیں کہ مومن کا اردو ادب میں کیا درجہ ہے۔ نیاز صاحب کی اس قسم کی تنقیدوں کو تاثراتی تنقید ہی کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے .... لیکن نیاز صاحب کی تنقیدوں میں ایک بڑی اہم خوبی بھی ملتی ہے جو فراق کے علاوہ کسی اردو نقاد کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ کسی ادیب پر نقد کرتے وقت اس شاعر یا ادیب کی روح تک پہنچ جانا اور یہ پتہ لگا لینا کہ ادیب کیا کہنا چاہتا ہے اور اس کا اظہار کیونکر اور کس طرح کر رہا ہے؟ بڑا مشکل اور دشوار مسئلہ ہے یہ بات نیاز صاحب کی تنقیدوں میں جس خوبی کے ساتھ ملتی ہے اس کی مثال فراق کے علاوہ شاید ہی کسی اور نقاد کے یہاں مل سکے۔

نیاز صاحب کی تنقیدوں میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بات کو خواہ مخواہ پھیلا کر بیان کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ تفصیل کو اجمال کا جامہ پہنانا انھیں زیادہ پسند ہے لیکن اس کے یہ مراد نہیں کہ وہ اشاروں میں باتیں کرتے ہیں یا انہوں نے اپنی تنقیدوں میں غزل کے آرٹ سے کام لیا ہے وہ اتنا ہی کہتے ہیں جتنا کہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے، غیر ضروری باتوں سے بات کو پھیلانا یا بعض امور کو ریب داستاں کے لئے بیان کرنا انھیں پسند نہیں اسی وجہ سے ان کے اس قسم کے تنقیدی مقالات بہت طویل نہیں ہوتے۔

غرض کہ نیاز صاحب نے تنقید کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ فراموش کر دینے کے قابل ہرگز نہیں ہیں اُن کے سلسلۂ مالہٗ و ما علیہ نے بہت سے شعراء میں فنی بصیرت پیدا کر دی، بہتوں کو گمراہ ہونے سے بچایا بہتوں میں زبان و عروض اور قواعد دانی کا شوق پیدا کر دیا اور بہتوں میں شعر فہمی اور شعر گوئی کا پاکیزہ مذاق پیدا کیا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت سے ایسے شاعروں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا جو قعرِ گمنامی کی ہوا کھا رہے تھے۔ مومن اور نظیر پر ان کی کوشش اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی جس نے گویا مومن و نظیر کو پھر سے دریافت کیا اور ان کی شاعرانہ قدر و منزلت کو بے نقاب کر کے ان کا شاعرانہ مرتبہ متعین کیا، یہ نیاز صاحب کی سعیٔ بلیغ کا نتیجہ ہے کہ آج مومن کی ضرورت سے زیادہ قدر کی جا رہی ہے اور نظیر کو ہندوستان کا شیکسپیئر (Shakespeare) اور پرولتاری انقلاب کا پیغمبر اور اُردو شاعری کے افق پر ایک روشن ستارہ کہا جا رہا ہے ورنہ شیفتہ نے تو یہ کہہ کر کہ اشعارِ بسیار دارد کہ بزبان سوقین جارلیست و نظر بہ آں ابیات در اعداد شعرا شاید شمرد، نظیر کو نظر انداز ہی کر دیا تھا اور نظر انداز کرنے کا یہ سلسلہ شیفتہ کے بعد برابر جاری رہا چنانچہ آزاد نے بھی یہی کچھ کیا۔

نیاز صاحب کا اسلوبِ تنقید کے میدان میں ویسا رنگین اور پُر تکلف نہیں ہے جیسا افسانوں اور انشائیوں میں نظر آتا ہے یہاں کام کی باتیں کام کے اسلوب میں نہایت واضح اور صاف زبان میں کہی گئی ہیں۔ شاید ہی کہیں عربی کے بڑے بڑے الفاظ، فارسی کی بڑی بڑی رنگین تراکیب، تشبیہات و استعارات اور رموز و کنایات کا سہارا لیا گیا ہو۔ تنقید کے لئے ضروری ہے کہ خیال آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہو۔ نیاز صاحب کی تنقیدوں کی زبان میں یہ خوبی ہے کہ ان کو پڑھ کر نہ کسی قسم کی الجھن ہوتی ہے اور نہ زبان کی رنگینی کے لطف میں پڑ کر قاری دوسری طرف بہک جاتا ہے بلکہ اصل موضوع سے اُن کے ساتھ ہم آہنگ رہتا ہے۔ اوپر کی سطور میں اُن کے نیظر والے مضمون سے زیادہ اقتباس اس لئے دیئے گئے ہیں کہ نیاز صاحب کی تنقید کی زبان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ انتقادیات حصہ اوّل و دوم۔ مالہٗ و ما علیہ کے علاوہ سینکڑوں تنقیدی مضامین جو نگار کے صفحات میں منتشر پڑے ہیں انکی منفرد تنقید نگاری کی روشن مثالیں ہیں۔ کاش وہ سب یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کئے جا سکیں!

نیاز کے مکاتیب

نیاز صاحب کے خطوط بھی اردو مکاتیب نگاری کی تاریخ میں خاص حیثیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر خطوط نگاری کا ایک نیا اور دل کش نمونہ سامنے آتا ہے۔ نیاز صاحب کے خطوط اُن کے دیگر انشائیوں اور افسانوں کی طرح انشائے لطیف اور رنگین بیانیوں کے دل کش مرقع ہیں، اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ یہ خطوط مصنوعی و فرضی معلوم ہوتے ہیں یعنی محض اس لئے لکھ لکھ کر رکھے گئے کہ ان کی اشاعت مقصود تھی، گو اُن سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط جو غبارِ خاطر پر مشتمل ہیں خطوط نگاری کا ایک نیا پیرایہ قائم کر چکے تھے، لیکن ابوالکلام کے خطوط عالم کیف و سرور میں محض اپنے دل کا غبار نکالنے کی خاطر لکھے گئے جس میں ادب اور انشا کی سخن طرازیاں،

عقلیات و فلسفہ کی بحثیں ہیں، لطیفہ سنجیاں ہیں، جیل کے حالات اور مشاغل ہیں، غبار خاطر میں مولانا جیل کی تنہائی میں سنہری یادوں کی ایک بزم سجاتے ہیں ان کا میڈیم (...Medium) تو خطوط کا ہے لیکن دراصل یہ خطوط اس لئے لکھے تھے کہ مولانا دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے یہ محض داخلی جذبے کی تسکین کا سامان تھا اس لئے ان خطوط کی بنیادی اسپرٹ (Spirit) وہی Essay کی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) نے لکھا ہے کہ "جب مجھ پر بھوت سوار ہوتا ہے تو میں اپنے خیالات سے کہتا ہوں کہ جاؤ اور بیاض میں آرام کرو تب میری طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے"۔ اسی طرح غبار خاطر کے خطوط کی شکل میں ہمارے سامنے انشائے لطیف اور Essay کا ایک نمونہ آتا ہے جو دل کے غبار مت و گریباں سے دور ہوں"۔ کے لئے لکھے گئے ہیں۔ خطوط کا فارم (Form) انہوں نے اس لئے اختیار کیا کہ اسے (Essay) میں عنوان متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں وہ آزادی نہیں ہوتی بلکہ ایک منطقی ربط قائم رکھنا ہوتا ہے کہ اسی کے اندر رہ کر اظہار کرنا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ خطوط یا ڈائری کا پیرایہ (Form) اختیار کرتے ہیں جس میں لکھنے والوں کو آزادی ہوتی ہے کیونکہ ان کا کوئی پیرایہ متعین نہیں ہوتا۔ انگریزی شاعر پوپ (Pope) کے طریقہ خط و کتابت کی نسبت ابوالکلام آزاد کا عمل ایک ہی منزل آگے ہے۔ خطوط کا فارم یہاں ایک اعتذار کی حیثیت رکھتا ہے، پوپ سا ادبی طریقہ کار کی طرح خطوط نگاری کا مقصد اولیں ابلاغ ہے۔ لیکن نیاز کے خطوط کی نوعیت ان سے بالکل جدا ہے۔ وہاں خطوط کے پردے میں اپنی علمیت اور انشاپردازی کا مظاہرہ مقصود تھا۔ لیکن یہاں وہ سب مسائل مقصود ہیں جو مکاتیب میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی سلام، دعا، مزاج پرسی واقعات گوئی، پیام رسانی، اپنا دکھ درد کہنا اور دوسرے کا سننا، صلاح و مشورہ اور زندگی کے دیگر امور کے ساتھ ساتھ بعض ادبی بحثیں، اور اشعار کے مطالب بھی ان رقعات میں ملتے ہیں جو ادبی خطوط غالبؔ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ رقعات میں نیازؔ کا اسلوب وہی ہے جس سے انہوں نے اپنے افسانوں اور دیگر مضامین و مقالات میں کام لیا ہے، غالب نے اپنے خطوط کے متعلق کہا ہے کہ "میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا"۔ مکتوبات نیاز میں بھی یہ مکالماتی انداز ملتا ہے۔ لیکن فرق انداز گفتگو کا ہے۔ غالبؔ جس طرح خطوط میں بے نقاب اور بے تکلف نظر آتے ہیں اسی طرح کھل کر، شگفتہ اور ظریفانہ انداز میں دو بدو گفتگو بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن نیاز صاحب جس طرح آپس میں ادب آداب کا لحاظ رکھ کر گفتگو کرتے اور سنجیدگی و تکلف کو کسی وقت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں اسی طرح وہ خطوط میں بھی کم ہی کھلتے ہیں اور اگر کہیں ظرافت یا شگفتہ نگاری سے کام بھی لیتے ہیں تو وہاں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی گمبھیر و سنجیدہ شخصیت کے پردے پڑے ہوتے ہیں، خطوط میں "انا" کا احساس جتنا مکتوبات نیاز کو پڑھ کر ہوتا ہے اتنا ابوالکلام آزادؔ کے مکاتیب سے بھی نہیں ہوتا ——— غلام غوث بیخبرؔ، غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ، مہدی افادی، ابوالکلام آزادؔ اور نیازؔ فتحپوری تک فن خطوط نگاری کی تاریخ میں نیاز کے خطوط ایک منفرد اور اہم خصوصیت کے حامل ہیں اور مکتوب نگاری کی تاریخ اُن کے واقعات کا باقاعدہ ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی !

نیاز و نگار نیاز صاحب کے ذکر کے ساتھ "نگار" کا ذکر نہ کرنا بالکل بے جوڑ اور غیر مناسب سی بات ہے کیونکہ نیاز اور نگار لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ پرچہ جولائی ۱۹۲۲ء سے جاری ہوا تھا، اور جب سے اب تک مسلسل اردو کی شاندار اور لائق قدر خدمت بروقت انجام دیتا رہا ہے نہ تو درمیان میں کبھی بند ہوا، نہ وقت سے بے وقت ہوا۔ اپنی اُسی ایک شان اور ایک طرز و انداز سے برابر اب تک چلتا چلا جا رہا ہے۔ طرح طرح کے حادثات رونما ہوئے، مختلف النوع واقعات کی آندھیاں چلیں، لیکن اس کی پابندی اوقات اور تسلسل میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی، اس اثنا میں بہت سے رسالے پیدا ہوئے اور کچھ سال جی کر راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ بعض زیادہ عرصہ تک زندہ رہے لیکن آخر انھیں بھی موت کا ذائقہ چکھنا پڑا۔ کچھ زمانے کے حالات و رجحانات اور فضا و ماحول کا تقاضا دیکھ کر اپنا رنگ بدل بیٹھے، اور دوسری ڈگر پر چل کر کچھ سے کچھ ہوگئے، لیکن نگار اسی شان اور آن بان سے اپنے جادہ پر گامزن رہا اور گامزن ہے، انتہا یہ ہے کہ نیاز صاحب کو بھی بعض ایسے مصائب و آلام سے بھی گذرنا پڑا جن سے گذرتے وقت انسان (اگر وہ حساس ہے) خود فراموشی کی منزلوں میں پہنچ جاتا ہے لیکن ایسے سخت وقت میں

بھی نیاز صاحب نگار کو فراموش نہ کر سکے۔ اس کی باقاعدگی انھیں اسقدر عزیز تھی کہ غم والم کے ایام بھی نگار کی باقاعدگی پر اثر انداز نہیں ہوئے نیاز صاحب نے اپنے غم میں دوسروں کو شریک نہ کرنے کی خاطر کبھی کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اولاد کی جدائی کا داغ اور شریک زندگی کی ہمیشہ کی مفارقت سے انسان پر کیا کچھ نہیں بیت سکتی، نیاز صاحب پر سب کچھ بیت گئی لیکن "نگار" پر اس کا کوئی اثر نہ پڑ سکا۔ —————— کیا اردو ادب کی دنیا میں خدمت کی ایسی لگن اور ایسی باقاعدگی کی کوئی اور مثال موجود ہے؟

نگار نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اگر اسی کو سامنے رکھا جائے تو نیاز صاحب کی عظمت کا قائل ہونا پڑے گا۔ جس پایہ کے مضامین اس رسالہ میں ہمیشہ شائع ہوئے ان پر نظر کی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا معیار ہمیشہ بلند سے بلند تر ہی رہا۔ باوزن مقالات کے علاوہ اس کے باب الاستفسار اور باب المناظرہ و مراسلہ اور مالہ و ماعلیہ نے تشنگانِ ادب کے سامنے افادات کے جو بیش بہا دفتر کھولے وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔ نگار، نیاز صاحب کے نام کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے گا۔ اور نیاز صاحب کے نام کے ساتھ "نگار" کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ شاید ہی کوئی رسالہ ہو جو کسی ایک شخص کی ادارت میں اتنے عرصہ تک نکلا ہو اور جس نے اتنی اہم ادبی خدمات انجام دی ہوں۔ نگار نے جس طرح عوام کے مذاق کو بلند کیا، بعض معمولی نقادوں میں شعر فہمی اور فن تنقید کا صحیح ذوق پیدا کیا، بعض گمنام شاعروں کی حقیقی قدر و منزلت کو بے نقاب کیا، ادب کے بعض تاریک گوشوں کو روشنی میں لا کر ان کو تنقید کی میزان میں پرکھ کر ان کا درجہ متعین کیا، نئی نئی تحریکات کا خیر مقدم کرنا اور ان کے اچھے برے پہلوؤں پر نظر ڈالنا سکھایا ہے اور اسی قبیل کی دیگر خدمات اس کے زندہ رہنے کی دلیل ہیں، نیاز صاحب کی جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت کے اثر سے نگار کا دامن بھی متنوع رہا۔ مذہب، تنقید، شاعری، افسانہ، ناول، تاریخ، سیاست، فقہ، تفسیر، حدیث، نجوم، رمل، جفر، علم الید، نفسیات، جنسیات، فلسفہ، سائنس، علم الارض، موسیقی، غرض کہ شاید ہی کوئی شعبہ یا پہلو ایسا ہو جس پر نگار میں باوزن، معیاری اور نمائندہ مضامین و مقالات شائع نہ ہوئے ہوں۔ ملاحظات، باب الاستفسار، باب المناظرہ، مالہ و ماعلیہ، مطبوعات موصولہ، گاہے گاہے باز خواں، باب الانتقاد وغیرہ اس کا روشن ثبوت ہیں۔ نگار کی اس ہمہ گیری و جامعیت .... کی مثال دنیائے ادب اردو میں ملنا محال ہے۔ جس جگہ نگار کے تمام پرچے فائل کی شکل میں محفوظ ہوں وہاں تشنہ لبانِ علم و فن بخوبی اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔

★

لاابالی سا اک جوانِ خموش

سیفی پریمی

دنیا میں انسان نے پہلے شعر کہا اور پھر نثر کو ذریعہ اظہار بنایا اس اعتبار سے کسی کا شاعری کرنا اور پھر نثر نگاری کی جانب مائل ہو کر اس میں اپنا مخصوص مقام پیدا کر لینا بالکل فطری چیز ہے۔ لیکن اب نظم اور نثر کی جداگانہ حیثیت ذہنوں میں اتنی مسلّم اور واضح ہو چکی ہے کہ جب ہم جدید نثر کے معمار اول سرسید کا یہ شعر سنتے ہیں تو چونک پڑتے ہیں۔

[1] بتوں پہ دل و جاں فدا کر رہے ہیں
بنارس میں یادِ خدا کر رہے ہیں

اور ذہن میں سوال ابھرتا ہے۔ کیا سرسید بھی شعر کہہ لیتے تھے؟

اسی طرح تاریخ اردو ادب کے اور قریب آکر مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ غزل پڑھ کر بعض افراد کو ضرور تعجب ہوگا۔

[2] کیوں اسیر گیسوئے خمدار قاتل ہوگیا　　ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہوگیا
کوئی نالاں کوئی گریاں کوئی بسمل ہوگیا　　اس کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہوگیا
انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں　　نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہوگیا
اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے　　دل کا ہر ارماں فدائے دست قاتل ہوگیا
قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں　　ہر بگولا دشت کا لیلیٰ کا محمل ہوگیا
یہ بھی قیدی ہوگیا آخر کمند زلف کا　　لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہوگیا

اردو شعر و ادب کی یہ خوش نصیبی رہی ہے کہ ہمارے نہایت اچھے نقاد نہایت اچھے شاعر بھی ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس دور کے تقریباً تمام ممتاز ناقدین اچھے شاعر بھی ہیں۔ بعض کی شاعرانہ شہرت اور حیثیت مسلّم ہے۔ بعض نے نہایت ہی مخصوص ادبی نشست تک اپنے کلام کو تبرک کی حیثیت میں رکھا مثلاً ڈاکٹر سید عابد حسین یا سید سجاد ظہیر جنہوں نے حال ہی میں اپنی نظموں میں نئے تجربے شروع کئے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری جنہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی اور جن کی ادبی شہرت تخلص کی نسبت سے شروع ہوئی تھی آج شاعرانہ فضا ان کے نغمات سے محروم ہے اس لئے "نگار" کے بازخواں ایں قصہ پارینہ را" کے تحت ہم آج کی صحبت میں نیاز صاحب کے تقریباً چالیس بیالیس برس پہلے کے اشعار غزل قارئین نگار کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

---

[1] گلہائے پریشاں، ص ۱۴۹ - مرتبہ الیاس احمد
[2] ماہنامہ شاہراہ دہلی - آزادی نمبر ۱۹۵۹ء

ایک غزل کا مقطع ہے

ہم نے دیکھا تھا ہے وہی تو نیاز
لاابالی سا اک جوانِ خموش

یہاں نہ کوئی فلسفہ طرازی ہے نہ تصوف کا مسئلہ نہ کسی روایتی خیال کا اظہار بلکہ ذاتی احساس کو ذاتی مشاہدے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ' لاابالی سا ' اور ' جوانِ خموش ' سے غم کی ایک دل آویز تصویر بنتی ہے ، اور عشق کی اس نفسیاتی کیفیت کو ذہن محسوس کرنے لگتا ہے جہاں جوانی شمع کی مانند گھل گھل کر ایک داستان مرتب کر دیتی ہے ۔ اب چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

بالیں پہ آئے ہو تو نہ بیٹھو جھکا کے سر　　اچھا ہوں اب تو کوئی شکایت نہیں مجھے
پھر ہاتھ میرے سینے پہ رکھ کر کہو کہ ضبط　　پھر میں کہوں کہ اس کی تو طاقت نہیں مجھے
مانا کہ مستحقِ محبت نہیں ہوں میں　　یہ بھی نہ کہہ کہ تجھ سے محبت نہیں مجھے

وہ نزع میں نیاز کا لکھ بھیجنا اُسے
آؤ نہ اب کہ صدمۂ فرقت نہیں مجھے

' بالیں ' اور ' نزع ' ہر چند روایتی الفاظ ہیں ۔ سر جھکا کر بیٹھنا اور سینے پر ہاتھ رکھنا بھی اس رعایت سے مستعمل سہی ۔ پھر بھی ان اشعار پر روایت پرستی کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اس لئے کہ اشعار کی فضا وہ نہیں ہے یہاں روایتی شاعری کے لوازم نہیں ہیں ۔ نہ شیون ہے نہ محبوب کی اشکباری نہ چارہ سازوں کی آہ و بکا نہ نبض کا ڈوبنا ہے نہ موت کا پسینہ ۔ مضمون داخلی ہے اور سیدھے سادے الفاظ میں صفائی ، بیساختگی ، اور کامیابی کے ساتھ تنہائی کے احساس کو بیان کیا گیا ہے ۔ مقطع میں نزع سے صرف جذبۂ فراق کی شدت کو ظاہر کیا گیا ہے ۔ محبوب سے مخاطبت کے لئے مختلف چیزوں کا استعمال ہوا ہے ۔ مصرعہ ثانی میں جان انتظار اور عشق کی بے پایاں تمنائے دیدار کا اظہار کیا گیا ہے " انتظار اور بیقراری " نیاز کا مخصوص موضوع ہے لیکن پراگندگی اور پریشانی کے عناصر نے غزل میں راہ نہیں پائی ہے ۔ سنجیدگی ، اعتماد اور لہجہ کی نرمی ہر شعر میں ملے گی ۔ مثلاً :

عیاں ہے سب پہ کہ دل کو ذرا قرار نہیں　　کہوں یہ کیسے مجھے ان کا انتظار نہیں
عزیزو ڈال دو اب میرے منہ پہ تم چادر　　اور ان سے کہہ دو کہ اب مجھ کو انتظار نہیں
میں تم کو دیکھ کے اللہ جانے کیوں چپ ہوں　　یہ کیسے جانا کہ دل تیرا بیقرار نہیں
یہی میں کیوں نہ کہوں تیرا حسن ہی ہے بلا　　یہ کیوں کہوں کہ مجھے دل پہ اختیار نہیں
تمہیں بتاؤ کہ پھر کس پہ رحم ہوتا ہے　　میں خستہ حال نہیں ہوں کہ دلفگار نہیں

اس غزل میں لکھنوی فضا ملتی ہے مگر وہ الفاظ کی حد تک ۔ یہاں کفن کی جگہ چادر ہے ۔ محبوب اپنے عاشق کے جنازے پر بال بکھرائے نوحہ کناں نہیں ہے ہجر کی مصنوعی اذیت نہیں ہے ۔ ان کا محبوب قاتل نہیں بلکہ ایک نگار شوخ و سنگدل ہے ۔ اس لئے عشق میں سوز و گداز ہے ۔ دل درد سے آشنا ہے ۔ ہجر ، محرومی ، اور تنہائی کا شدید احساس ملتا ہے مگر اس سے ہمارے اندر تلخی پیدا نہیں ہوتی ۔ محبت اور زندگی سے بیزاری کا جذبہ اور مکروہ گھٹن پیدا نہیں ہوتی بلکہ شعروں کی تہہ میں ایک ایسا احساس پایا جاتا ہے جو زندگی کو خوبصورت ، اور محبت کو زیادہ قابلِ قدر چیز بنا دیتا ہے ۔ آخری شعر میں مومن کا رنگ نمایاں ہے ۔ ایک اور غزل ملاحظہ ہو ۔

اے شبِ اداس تو بھی تنہا مگر نہیں ہے　　میں بھی تو دیکھتا ہوں وہ جلوہ گر نہیں ہے
بیٹھے ہیں چشم خونیں کھولے ہوئے ہم اپنی　　کوئی بھی دل کا لیکن پیغام بر نہیں ہے
جو تیرے جی میں آئے کہہ لے مجھے کہ اب تو　　دل کو سکوں نہیں ہے یاں چارہ گر نہیں ہے

برہم نہ ہو چلا میں اٹھ کر یہاں سے بھی اب   سچ ہو کہ رہ گزر ہے کچھ میرا گھر نہیں ہے

کیا پوچھتا ہے کیسا ہے اب نیاز تیرا
کل سے بنا ہے ماتم تجھ کو خبر نہیں ہے

اس غزل سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی ابتدائی غزلوں میں شامل ہوگی اس لئے کہ دوسری غزلوں کے مقابلہ میں یہاں زبان شعری میں کچا پن ہے۔ موضوع وہی فراق و غم فراق ہے اور داخلی کیفیت کا بیان۔ لیکن فرسودگی، ابتذال اور تقلید سے یہ غزل بھی پاک ہے۔ ماتم، چشم خونیں اور چارہ گر روایتی شاعری کے الفاظ ہیں لیکن انداز بیان کے باعث پرانی داستان بھی حکایت لطیف بن جاتی ہے۔ روانی اور بعض مصرعوں میں بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ مطلع کی مخصوص فضا ہے اور مخصوص لہجہ۔ شاعر کو اعتماد و اطمینان کی بڑی قدرت حاصل ہے۔ شاعر نے شب ہجر میں فطرت کو سوگوار سمجھا ہے اور اپنی محرومی دیدار کا اظہار کر کے فطرت کے ذہن کو نفسیاتی طور پر تسکین دینا چاہتا ہے۔ فطرت سے یہ مخاطبت اور انداز بیان بالکل اچھوتا ہے۔ یہاں شاعر کا احساس اور جذبہ فکر و تامل کی حدوں کو چھوتا ہوا ابہام تک پہنچتا ہے۔

چوتھے شعر میں غالب کے محبوب اور نیاز کے محبوب کا فرق ظاہر ہے۔ اپنی رہ گزر کو عشق کے سایہ سے بچانے میں دونوں کے محبوب کی ادا ایک ہی ہے مگر مرزا صاحب کو اپنی شوخ مزاجی کے باعث رہ گزر سے اٹھنے میں تکلف ہوتا ہے۔ نیاز کے مصرع میں "یہاں سے بھی اب" بڑا بلیغ ٹکڑا ہے ایک مصرع میں حریم ناز سے رہ گزر تک تمام منزلوں کا تصور پیش کر دیا ہے۔ دوسرے مصرع میں 'سچ ہو' بے نیاز داد ہے۔ اور "کچھ میرا گھر نہیں ہے" کی قدرت بیان کا لطف صرف محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اس میں صرف محاکاتی پہلو کی تصویر نہیں ہے بلکہ مستقبل میں عشق کے امکانات کی طرف محبوب کو متوجہ کیا گیا ہے۔

غزل میں منفرد خیالات کی ترجمانی اور ذاتی تجربوں کی داستان ملتی ہے لیکن ایک غزل میں مسلسل و مربوط خیالات کو ملاحظہ فرمائیے۔

چاہتے ہیں وہ کہ اظہار محبت چھوڑ دوں   یعنی الفت چھوڑ دوں اس کی حکایت چھوڑ دوں
تم سے مل کر بس یہی دل چاہتا ہے کچھ کہوں   کیا کہوں گر شکوہ سنجی ہائے الفت چھوڑ دوں
دیکھ کر ان کو مری آنکھوں میں آنسو بھی نہ آئیں   کس طرح اظہار شوق بے نہایت چھوڑ دوں
کیا یہ انجام محبت مجھ کو پھر چھوڑے نہیں   گر خیال ابتدائے عہد الفت چھوڑ دوں
جان دیدوں کیوں نہ گر اس کے قدموں پہ نیاز   شکر احساں چھوڑ دوں اظہار منت چھوڑ دوں

'چھوڑ دوں' ردیف مشکل ہے پھر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں شاعر کے ذہن نے خلا میں پرواز نہیں کی ہے۔ شاعر نے اپنے محسوسات کو ہوس ناکی نہیں سمجھا ہے اس کا عشق خلوص و نیاز کا آئینہ دار ہے اس کی مخاطب اسی زمین کو بہشت بریں بنانے والی جنس لطیف ہے۔ اس میں دل کی ترجمانی ہے اس لئے تاثیر ہے۔

ایک دوسری غزل کی ردیف بھی مشکل ہے۔ "خموش"

یوں تو ہے زخم اک دہان خموش   کیا مگر چارۂ بیان خموش
جانے کیا کہہ گئی پتنگوں سے   صبح کو شمع کی زبان خموش
نہ کھلا راز خط پیشانی   ہوں میں ممنون آستان خموش
حسن محمل کے ساتھ دل بھی چلا   شوق کا یعنی کاروان خموش
تم نے دیکھا نہ حال زار مرا   دشمنی میری داستان خموش

اس غزل میں داخلی اور خارجی دونوں قسم کے مضامین ملتے ہیں یہ خالص عاشقانہ رنگ کی شاعری ہے - اس میں جذبہ کی ترجمانی بھی ہے لیکن اس کا تعلق احساس سے کم اور کیفیت سے زیادہ ہے آواز ترنم، لہجہ میں نرمی اور بے ساختگی ہے - ردیف کے ساتھ قافیوں کو خوش سلیقگی سے مربوط کیا گیا ہے -

"زبانِ خموش" کی تمثیل اردو شعر میں اچھا اضافہ ہے چوتھے شعر میں مصرعہ اول ہی میں مضمون پورا ہو گیا ہے مگر یہ شاعر کی فطری اپج اور وسعت نظر ہے کہ دل کی تشریح سے مصرعہ ثانی پیدا کر لیا ہے - اور اس میں لفظ "یعنی" لا ناضروری تھا - مگر خوبصورتی سے مصرع ڈھل جانے کی وجہ سے مندری میں یا اس لئے کہ یہ غزل ابتدائی نقوش میں شامل ہے ایک سقم کی طرف ذہن شاعر متوجہ نہ ہو سکا - یہاں یعنی "کی" "ی" گر رہی ہے اور دوسرے شعر میں "ا" اور "ی" بڑے جھول دینے والے حذف ہیں -

یہاں تک انتظار، جدائی اور اقرارِ محبت عموماً یہی غزلوں کے موضوع تھے - اب اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے - اور جذبات کی انفرادیت نمایاں ہے -

نہ دنیا کا ہوں میں نہ کچھ فکر دیں کا — محبت نے رکھا نہ مجھ کو کہیں کا
اُسے کہہ لو اب آستانہ وگرنہ — وہ اک نقش ہے میری لوحِ جبیں کا
ہے ہر لب پہ ذکر آستانے کا ان کے — کوئی نام لیتا ہماری جبیں کا
پھٹے مجھ سے احباب ایک ایک کر کے — برا ہو مری طبعِ اندوہگیں کا

محبت کی سرابیگی اور محویت میں دین و دنیا کی نفی دوسرے شعراء کے یہاں بھی مل جائیگی مگر مطلع میں مصرعہ ثانی کے بے تکلف تیور کی کچھ اور ہی بات ہے - دوسرے شعر کے مصرعہ اولی میں "اب" سے بے پناہ کام لیا گیا ہے - نیاز کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ شعر میں ایک ایسا لفظ رکھ دیتے ہیں جس سے ایک اور دوسرے مضمون کی طرف کبھی قاری کا ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے یا اس کا پس منظر ذہن پر واضح ہو جاتا ہے - یہاں اصل مضمون یہ ہے کہ بارگاہ حسن پر عشق نے خلوص کے سجدے کئے ہیں مگر "اب" سے یہ نکتہ پیدا کر لیا ہے کہ جبین نیاز اور آستانہ حسن دونوں کا عشق میں اپنا اپنا مقام ہے یعنی حسن کی پہچان عشق کے بغیر ممکن نہیں -

چوتھے شعر میں شاعرانہ طبیعت اپنے عروج پر ہو گئی ہے - دل سوز و گداز عشق سے معمور ہے - اس میں میر کا جذباتی سوز و ساز، شدت خلوص اور پاکیزہ احساس شامل ہو گیا ہے - یہاں غم، تغزل اور زبان کے امتزاج نے شعر میں ایک مخصوص فضا پیدا کر دی ہے - نیاز کی شاعری کی جان کی اصلاً یہی انفرادی فضا ہے -

ایک اور مطلع سنئے -

یہ ہجر کی رات ہو گی وہ مہ جمال ہو گا — ساعت تو آئے وہ جب جیسا محال ہو گا

پہلے مصرعہ سے جنسی کشش اور جنسی رجحان کا پتہ چلتا ہے - انداز بیان میں بھی کوئی قدرت نہیں ہے لیکن دوسرا مصرعہ بڑے غضب کا پہنچا یا ہے جو انسانی تجربہ کی بھرپور کیفیت کا حامل ہے اور احساس کی بے پناہ صداقت کا نقش ہے - اس میں کتنی مانوسیت ہے - سادہ، نرم اور خلوص آمیز الفاظ سے اندرونی احساس کی کتنی اثر انگیز تصویر بنائی ہے -

ایک اور شعر -

زباں یاس میں بھی گلہ ہے گا ہے رسلے لگتا ہے — وہ زخمِ دل چلا آتا ہے جو عہدِ تمنا سے

عموماً نیاز کا کلام رجائی ہے لیکن اس شعر میں ایک ایسے ناکام دل کا عالم دکھایا ہے جس کی صبر آزما گھڑیوں کی کوئی انتہا نہیں " رسنے لگتا ہے"

نہایت بلیغ شگوفہ ہے اور "گاہے گاہے" نے شعر کو بلندی عطا کی ہے۔

"اجتماع ضدین اور اتحاد ضدین" فراق گورکھپوری کی خصوصیات کلام بتائی جاتی ہیں۔ یہ خصوصیت نیاز کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً

ناامیدی دیک جہان امید
ناتوانی دکوشش صبا دید

نیاز کی غزلوں میں VACABULARY پر نظر کی جائے تو بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جن کو لکھنوی شاعری میں منسوب کیا جا سکتا ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ وہ الفاظ مرزا غالب اور دوسرے دہلوی شعراء کے یہاں بے تکلف طور پر مستعمل ہو گئے ہیں۔ اور بعض ناقدین نے لکھنؤ کی بابت محض زیب داستاں لئے رقم کر دی ہے۔ ادھر کلیات فانی یا باقیات فانی کی ورق گردانی کیجئے تو جنازہ، خنجر، لاش، نشتر، میت کفن، تیر، قفس، زنداں وغیرہ کی فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ اور ہمارے نقاد شاعر فراق گورکھپوری کے ابتدائی کلام میں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔

فراق کی طرح نیاز کی ابتدائی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز اگر غزل گوئی کی جانب متوجہ رہتے تو ان کے یہاں غزل کی ارتقائی صورت کم و بیش وہی ہوتی جو فراق کے یہاں ملتی ہے ذرا ان اشعار کو غور سے پڑھئے کہ نیاز کی بلند عشقیہ شاعری کی امانت ہیں۔

آرام دل کا، رات کا سونا، سکون دل — ہاں تم سے چھٹ کے کون سی راحت نہیں مجھے
گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھئے کہ دل پہ مجھے — بے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں
حسن ہے اک سکوت استغنا — عشق تکرار مدعا کی خلش

اگرچہ ہمارے سامنے نیاز کا پورا کلام نہیں ہے لیکن ان اشعار کی روشنی میں ان کی غزل کے محاسن اور امکانات کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ نیاز حقیقی معنی میں شاعر ہیں ان کی شاعری میر، مومن اور غالب کی فضا میں سانس لے سکتی ہے۔ ان کی غزل میں ایک مخصوص فضا اور مخصوص آواز ہے ان کا دل چوٹ کھایا ہوا ہے اس لئے آواز درد بھری ہے مگر بلند آہنگی نہیں ہے۔ ان اشعار سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ فانی بدایونی کی طرح نیاز کے موضوعات محدود ہیں مگر پختہ کاری اور شگفتگی بھی جلوہ گر ہے۔ غم کی تصویر میں بھی حسن کا راز ہیں یہ کہنا مشکل ہے کہ نیاز کا آہنگ تغزل فراق گورکھپوری کے آہنگ سے بالکل مماثل ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ محسوسات و جذبات کو وہ ہیجانی اور ہیجان کے عالم میں شعر کے سانچے میں نہیں ڈھالتے بلکہ اس میں پروقار ٹھہراؤ ملے گا۔ فکر و تامل کے بعد سنجیدہ اور پاکیزہ زبان میں وہ غزل کا روپ دیتے ہیں یہ عمل تخلیق کا موڈ فانی و فراق کے علاوہ کم یاب ہے۔

دیدار کی تڑپ، انتظار کی کسک، اور غم کی ٹیس میں بھی ایک ضبط توازن کی شان پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں تصوف اور ترک محبت کا کوئی مقام نہیں۔ احساس غم کو نشاط میں بدلنے کی ہمت، عشق کا جذبہ خلوص، دردمندی، احساس کی طہارت۔ یہ سب عناصر مل کر ان کی غزلوں کو بلند سطح پر پہنچاتے ہیں۔

نیاز و نگار بعض اہل قلم کی نظر میں

سید محمد مرتضیٰ

"جناب نیاز کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ اردو علم و ادب میں بہ حیثیت نثار و ناظم کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اور اس لئے توقع یہ ہے کہ ان کی زیر ادارت یہ رسالہ (نگار) فروغ پائے گا۔"

(بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم)

"جناب نیاز ایک کہنہ مشق انشا پرداز ہیں۔ اس لئے ان کی ادارت میں ایسے رسالے کا شائع ہونا اس کی خوبی کی ضمانت ہے مضامین نظم و نثر لطیف اور دلچسپ ہیں۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ سائنس، ادب اور لطائف و حکایت سب یکجا کر دئے جائیں۔"

-- (علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم)

نیاز صاحب ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے شعر و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ وہ نہ صرف ادب نواز ہیں۔ بلکہ ادب ساز بھی ہے۔"

(مولانا حامد حسن قادری)

آپ کا قدیم طرز انشا پردازی کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نئی شاہراہ قائم کی ہے۔ آپ کا رسالہ نگار ایک نہایت ممتاز ادبی رسالہ ہے۔ جس کے اکثر مضامین جو آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجے کے اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔"

(ڈاکٹر رام بابو سکسینہ)

"نیاز صاحب اردو کے بہترین نقاد اور ادیب ہیں اس کے ساتھ ان کا مبلغ علم نہایت وسیع و عمیق اور مطالعہ گہرا بلکہ ہمہ گیر ہے اختلاف رائے کی اور بات ہے۔ مگر یہ امر واقع ہے کہ آج کوئی ادیب ان کا مد مقابل تو کیا ہم پلہ بھی نہیں۔

(اثر لکھنوی)

نیاز صاحب کی علمی و ادبی خدمات ہند و پاک میں مسلم ہیں۔

(مولانا ضیاء احمد بدایونی)

نیاز صاحب سخن سنج، اچھے ہیں شعر کی پرکھ خوب رکھتے ہیں۔ اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

نیاز ہمارے ادب و تہذیب کے قطب مینار ہیں۔ میں قریب قریب ستر برس کی عمر میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ان کی تحریک سے اردو سیکھی ہے۔ اور ان کا رسالہ نگار چالیس برسوں سے میرے لئے ایک فیض گاہ و درسگاہ رہا ہے۔ میرا اپنا ادب حضرت نیاز کے ادب سے بہت مختلف چیز ہے۔ لیکن اس کے تخلیق و تعمیر میں حضرت نیاز کی تحریریں بہت ممد و معاون و موثر قوت کا کام کرتی رہی ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جو ادیب معتقد نیاز نہیں وہ آپ بے بہرہ ہے۔"

(فراق گورکھپوری)

حضرت نیاز ان چند لئے گئے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دون پرور آسمان ازل سے لیکر اب تک بخل کرتا چلا آرہا ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنی خلاقی کے شہر آباد ہیں۔ اتنے [illegible] کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور دانش و فرہنگ کی اتنی بے شمار دلہنیں اتری ہوئی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگالوں کاش نیاز فتحپوری کا سا خلاق طرز انشاء پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے۔

ہائے وہ عقل جو زنجیر میں ہو دیوانوں کے"

(جوش ملیح آبادی)

نیاز فتحپوری کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ادب میں اپنے رنگ سے ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ نیاز کے یہاں جو چیز سب سے امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ان کا مخصوص طرز بیان اور زور قلم ہے۔ ان کی کتابوں کی فہرست ہی بتا دیگی کہ نیاز اکثر مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر جگہ وہ اسی ادبی شان کو برقرار رکھتے ہیں جو ان کے لئے مخصوص ہے۔ نیاز کی تحریریں بیباکی اور آزادی لئے قدم قدم پر موجود ہے۔"

(ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

نیاز کے اسلوب میں بیک وقت ایک ٹھہری ہوئی سنجیدگی اور اچھلتی ہوئی شوخی باہم ملی جلی ہوئی پائی جاتی ہے۔ یہ اسلوب ایسا ہے کہ نازک سے نازک اور سنگین مسائل پر شگفتگی اور دل آویزی کے ساتھ بحث کی جا سکتی ہے۔ موضوع کی خشکی یا تلخی کو اسلوب کی کیفیتوں میں اس طرح لپیٹ لینا کہ محسوس نہ ہونے پائے معمولی ہنر نہیں ہے۔ اردو نثر کی نئی نسل نے یہی ہنر نیاز سے پایا ہے اور جب تک اردو زبان کا کوئی مستقبل ہے۔ اس کے ادیبوں کی نئی نسل نیاز کے اسلوب کے اثر سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اور اردو نثر کی تاریخ میں نیاز کا اسلوب ایک زندہ قوت ہے جس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔ (مجنوں گورکھپوری)

"بحیثیت ادیب کے نیاز صاحب کی خدمات اور ان کے رجحانات بظاہر متنوع اور مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر اردو کے جدید رومانی اسکول کے لکھنے والوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔"

(عبدالقادر سروری)

"نیاز اردو انتقاد کی تاریخ میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے تمام اردو شاعری میں سخت گرفت کی ہے انہوں نے سہل نگاری کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے جو شاعر کو اس کے فن کے بارے میں کام چور بنا دیتی ہے۔ شاعری کے چمن میں سبزۂ بیگانہ کی نمود نیاز کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور سبزۂ بیگانہ سے مراد وہ فکری دوری بے ساختگی ہے جو شاعر کو اپنے کلام پر نظرِ ثانی کرنے سے روکتی ہے۔"

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

"نیاز صاحب کی شخصیت کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں، اور بہت اچھے مسلمان بھی!"

(رئیس احمد جعفری)

"نیاز علما کی تقلید نہیں کرتے قرآن اور حدیث پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا اسلام خالص اسلام ہے۔ وہ نہ شیعہ ہیں نہ سنی نہ مقلد ہیں نہ غیر مقلد، نہ دیوبندی ہیں نہ بریلوی۔ نہ قرآنی ہیں، نہ اہلِ حدیث وہ محض مسلمان ہیں۔"

(ڈاکٹر شوکت سبزواری)

"بعض لوگوں کو نیاز کے مسلک اور بعض معاملات میں ان کے خیالات و معتقدات سے اتفاق نہ ہوگا۔ سرسید سے بھی بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ لیکن اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نگار نے اور خاص طور پر نیاز صاحب کے آزادیِ فکر و نظر اور آزادیِ گفتار و قلم کی ایک صحت مند اور جرأت مندانہ روایت کو پروان چڑھایا ہے۔"

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

"میں نے نیاز صاحب سے بہت استفادہ کیا اور بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور میری معنوی نشو و نما میں نیاز اور نگار کا بہت ہاتھ رہا۔"

(مالک رام)

"ادبی ذخیرے کی فراہمی اور علمی و ادبی اصطلاح یعنی الفاظ و اسالیب کی جدّت کے پہلو سے نیاز صاحب کی خدمات نہایت وزنی ہیں۔"

(ل۔ احمد)

"تنقید، انشائیہ، افسانہ اور ناول میں ان کی خدمات انہیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔ نگار محض ایک رسالہ نہیں ایک

ادارہ ہے۔ جس نے ہزارہا ذہنوں کی تشکیل کی ہے اور نیاز صاحب کی حیثیت ایک معلم کی ہے"۔

(احتشام حسین)

"حالی، سلیم اور عبدالحق کے بعد نیاز ہمارے بڑے نقادوں میں سے ہیں۔ بلکہ ادبی شعور کی گہرائی کے لحاظ سے وہ سلیم اور عبدالحق سے بھی بلند ہیں۔ انتقادیات ہماری تنقید میں ایک مفید اضافہ ہے۔ عبدالحق نے ہمارے کلاسکی ادب کو جسے ہم مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ ہمارے لئے زندہ کیا مگر نیاز نے اسے آب و رنگ اور شگفتگی عطا کی"۔

(آل احمد سرور)

"نیاز کی رومانی دنیا کا ہر ذرہ رومان کے جذبے میں ڈوبا ہوا ہے۔ نیاز نے اپنے رومانی افسانوں کا موضوع ایسے واقعات کو بنایا ہے جو کلاسی حیثیت سے ایک مستقل رومانی درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ان میں فطری شعریت اور افسانوی تخیل کا رنگ بھر کر انہیں اور بھی زیادہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ نیاز فتحپوری کا افسانہ 'جنت کی حقیقت'، میں نے افسانے کے بعض وہ عناصر موجود ہیں جو ترقی پسندی کی تحریک سے متاثر ہو کر کہنے والوں کے انداز کی خصوصیت ہے"۔

(وقار عظیم)

"میں اور میری عمر کے جتنے اشخاص آج کل موجود ہیں۔ اس وقت صرف ابتدائی درجوں کے طالب علم تھے جب نیاز صاحب اردو صحافت کی فضا پر چھا چکے تھے۔ ہم سب ان کے ادب لطیف اور جوش و تازگی سے بھری نثر سے بے حد متاثر و مرعوب تھے"۔

(ڈاکٹر منور الحسن ہاشمی)

"مولانا کا نام اردو ادب میں نمایاں ہونے کیساتھ ساتھ چونکا دینے والا بھی ہے۔ ان کے قلم نے رنگ آلود ذہنیتوں کی مجلی و مصفیٰ کرنے کا کام جس بیباکی سے کیا ہے۔ وہ بجائے خود لائق ستائش ہے"۔

(مولانا امتیاز علی عرشی)

"زبان دانی کا سب سے اونچا درجہ طرز ادا ہے اور اس میں مجھے اردو کا کوئی نثر نگار نیاز صاحب سے آگے نہ دکھائی دیا۔ ان کے طرز میں ایک عجیب رنگینی کیساتھ ایک عجب شگفتگی اور عجیب روانی ہے۔ جو کسی نثر نگار کے یہاں نہیں ملتی۔ متعلق موضوعات کو ان کا قلم جس طرح دلچسپ بناتا ہے وہ سرسید تک کو نصیب نہ ہوا۔ اس وقت میں ان کی معجز بیانی کی تنقیدی تحلیل نہیں پیش کرنا چاہتا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ہماری نثر سرسید سے شروع ہو کر جس اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچ سکتی تھی اس پر نیاز صاحب نے اسے پہونچا دیا۔ ان کے یہاں ہمارے تمام نثار کی خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔ اور ان کی نثر پر یہ مصرع پورا اترتا ہے۔

ع "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"

(ڈاکٹر محمد حسن فاروقی)

"نیاز صاحب نے اردو میں علمی تنقید کو تنقید کا جزو مستقل بنایا جس سے غلط نگاری، خوش فہمی اور ناتواں بینی کے بہت سے پردے چاک ہو گئے۔"

(رشید حسن خان)

"نیاز فتحپوری کا اسلوب بڑا متنوع ہے وہ اگر ایک طرف انشائے لطیف لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں تو دوسری طرف ایک منطقی کی حیثیت سے مدلل گفتگو کرنے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ آج اردو زبان میں فلسفیانہ خیال کے اظہار کی جو صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے ابھارنے میں نیاز صاحب کے اسلوب کو بڑا دخل ہے۔"

(ممتاز حسین)

"نیاز صاحب عقائد کے معاملہ میں نہایت پختہ، صاف باطن اور صاف گو ہیں خواہ یہ تعلق خدا کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ان کا کیش ترک رسوم ہے۔ اوہام کی بت شکنی ہمیشہ سے ان کا شعار رہا۔ ہر باطل کے رد کے لئے وہ سدا شدت سے دلیر اور بیباک نظر آئے کہ کٹر سے کٹر نکتہ چینی اور بڑے سے بڑے خطرے کی بھی پروا نہ کی۔"

(عشرت رحمانی)

"نیاز صاحب کی شخصیت اردو ادب میں پہلے ایک تحریک بن کر ابھری اور آج وہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ ہمیں عبدالحق کی یاد دلاتے ہیں۔ عبدالحق نے ہمیں انجمن ترقی اردو دیا۔ نیاز صاحب نے نگار دیا۔ اور اسی کے ساتھ نگار میں لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ۔ اس حلقے کے بعض افراد آج اردو ادب میں بڑی اہم جگہ رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے نگار نے ہمیں زندہ ادیب دیئے دوسری حیثیت سے نیاز صاحب ہمیں عبدالحق سے بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ ان کا ادبی سرمایہ بہت بڑا ہے۔ اور نسبتاً زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔"

(مجتبیٰ حسین)

"نیاز پر مشرقی رنگ تنقید کا اچھا خاصا اثر ہے۔ وہ اپنی تنقید میں معانی و بیان کی اصطلاحات کے علاوہ جدت ادا، شوخی بیان، ندرت خیال، اسلوب بیان، طرز ادا، ترکیبوں کی جدت، بندش اور روانی و ردیف وغیرہ کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے تاثراتی تنقید کی طرف پوری طرح توجہ کی تاثراتی رجحان اور نقطہ نظر نیاز کے وسیلہ سے اردو میں آیا۔"

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

"نیاز صاحب کی زندگی ایک خاص تحریک سے وابستہ رہی ہے انہوں نے مرتے ہوئے نظریوں، سڑی بسی روایتوں اور اعتقادی تنگ نظریوں کے خلاف مسلسل جو کچھ لکھا ہے وہ ایک مورچہ ہے، ادب، تہذیب اور مسلم ہند کی سماجی زندگی میں۔"

(سید محمد تقی)

"اسٹائل کی ظرافت کے سلسلے میں فرحت اللہ بیگ اور فلک پیما کے علاوہ جدید اردو نثر میں نیاز فتحپوری کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ نیاز کی تحریر میں زندگی سے انس اور بغاوت کا ایک حسین امتزاج موجود ہے۔ اور شاید اسی لئے ان کے یہاں فرحت اللہ بیگ اور فلک پیما کی ممتاز خصوصیات یکجا نظر آتی ہیں۔ نیاز زندگی کے قواعد و ضوابط اور تحریکات کو ایک ایسے زاویے سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں کہ ناظر چونک چونک اٹھتا ہے۔ مگر یہ نیاز کے ظریفانہ اسٹائل کی خوبی ہے کہ وہ ناظر کو کسی شدید رد عمل پر آمادہ نہیں ہونے دیتے اور یوں باغی کے لیبل سے محفوظ رہتے ہیں۔"

(ڈاکٹر وزیر آغا)

نگار اور نگار کے خاص نمبر

(فرمان فتحپوری)

نگار جنوری ۱۹۲۲ء میں طلوع ہوا۔ علم و فکر کی یہی مدرسی ساکھ لایا جو پہلے پہل سرسید کے ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں نظر آئی تھی لیکن شعلۂ مستعجل ثابت ہوئی۔ سرسید کا انہماک علی گڑھ کی طرف ہو گیا اور ان کے رفقا، سرسید کی دلی خواہش و کوشش کے باوجود زیادہ دن قائم نہ رکھ سکے۔ نگار نے تہذیب الاخلاق کی طرح اپنے اجراء کے متعین مقاصد کا اعلان تو نہیں کیا لیکن گذشتہ بیس سال سے وہ جس نہج سے نکل رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمی و ادبی اور ملی و قومی اصلاح و تعمیر کے سوا کوئی اور مقصد اس کے پیش نظر نہیں رہا۔

تہذیب الاخلاق کے بعد اور بھی کئی علمی و ادبی رسائل و جرائد سامنے آتے ہیں ان میں مخزن، معارف، ہمایوں، نیرنگ خیال، الہلال، ...، تمدن، صلائے عام، معارف، الناظر، نقاد اور ادیب، وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے گراں قدر علمی و ادبی اور ملی و قومی خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن نگار کی چند خصوصیات و روایات ایسی ہیں جو اسے اردو کے دوسرے پرچوں سے ممتاز کرتی ہیں

اوّل یہ کہ اردو میں کوئی ایسا معیاری علمی و ادبی ماہنامہ نہیں ہے جو اتنی مدت سے اپنی ساری روایتوں کے ساتھ ایک صاحب طرز انشا پرداز، افسانہ نگار، نقاد، مفکر اور خلاق مدیر کی ادارت میں نکل رہا ہو۔ دوسرے یہ کہ اردو میں آزادی فکر کے رجحان کو عام کرنے اور دنیائے علم و ادب میں تنقیدی و تخلیقی قوتوں کو ابھارنے، سنوارنے اور بڑھانے کے سلسلے میں جو کام نگار نے کیا ہے کسی اور ماہنامے نے نہیں کیا۔ نگار نے ایک طرف اردو ادب میں آزادی خیال، کشادہ نظری، بے لاگ تنقید اور بے باک اظہار خیال کو فروغ دینے میں مدد کی ہے دوسری طرف اشخاص کے ذہنوں میں دبی ہوئی تخلیقی چنگاریوں کو شعلہ کی لپک عطا کرنے میں معاونت کی ہے۔ نگار کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے بعض دوسرے پرچوں کی طرح محض بڑے ادیبوں یا شاعروں کے نام سے اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مضامین کی اشاعت و انتخاب میں "کس نے لکھا ہے" کو نظر انداز کر کے "کیا لکھا ہے" کو پیش نظر رکھا ہے۔ مضمون یا کلام خواہ کسی کا رہا ہو اگر نگار کے معیار پر پورا اترا ہے تو شائع کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نگار کی فائلوں میں بڑے لکھنے والوں کے ناموں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں گمنام، غیر معروف اور کم معروف لکھنے والوں کے نام بھی نظر آئیں گے۔ ان گمنام اور کم معروف ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں یا تخلیقیں کسی طرح بھی غیر معیاری یا کم رتبہ نہیں ہیں۔ بلکہ اگر مختلف موضوعات پر اس قسم کے لوگوں کے مقالات و مضامین مرتب کر دیئے جائیں تو یہ اردو زبان و ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھیں گے۔ اسی طرح

اگر نگار کی فائیلوں کی مدد سے قدیم طرز پر شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے ترتیب دیئے جائیں تو بیسویں صدی کے ادب اور ادیب دونوں کے متعلق بعض نہایت کارآمد اور دلچسپ باتیں سامنے آئیں گی۔

نگار کی ایک اور اہم خصوصیت اس کی ہمہ جہتی و ہمہ گیری ہے۔ مذہبیات سیاسیات، اخلاقیات، جمالیات، جنسیات فلسفہ، منطق، تصوف، تخلیقی ادب، تنقید، لسانیات، معانی و بیان، عروض شاعری، تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے مختلف علوم کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو نگار میں زیر بحث نہ آچکا ہو یا جس پر صدہا بیش بہا تحقیقی و تنقیدی مقالات نگار میں محفوظ نہ ہوں۔ نگار کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے دائرۃ المعارف کی حیثیت دیدی ہے اور آج اردو میں علم و ادب کی تحقیق کا کوئی کام اس سے بے نیاز رہ کر نہیں کیا جاسکتا۔ خود مدیر نگار نے مختلف علوم و فنون پر ملاحظات، باب الاستفسار، باب الانتقاد اور علمی و ادبی مقالات کے تحت اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کی مدد سے مختلف موضوعات پر سینکڑوں تحقیقی اور تنقیدی کتابیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ فنیر ابن حسن کا ترتیب دیا ہوا "نگار و نیاز کا جو اشاریہ اسی نمبر میں شامل ہے اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مدیر کی حیثیت سے جتنا بیش بہا ذخیرہ نیاز نے اردو کو دیا ہے کسی اور مدیر نے نہیں دیا۔ اگر کسی وقت نگار کے مضامین و مصنفین کا مکمل اشاریہ مرتب کیا گیا تو اس وقت صحیح اندازہ ہوگا کہ نگار نے اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں کتنا گنجینہ ذخیرہ اور گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

یہ بات بھی نگار کی خصوصیات میں شامل ہے کہ اس کے مدیر نے زندگی و ادب کا خاص نقطہ نظر رکھنے کے باوجود "نگار" کو کسی خاص مکتبہ فکر کا پابند نہیں بنایا۔ نگار میں ہر فرد اور ہر مکتبہ فکر کے ادیب کو آزادانہ اظہار خیال کی اجازت دی ہے۔ ہندو، مسلمان، عورت، مرد بوڑھے، جوان، پختہ کار اور نو آموز سبھی اس کی بزم میں شامل رہے ہیں اور اس نے ادیب کے نسل و رنگ، عمر و علاقہ اور مکتبہ فکر کو نظر انداز کرکے صرف علم ادب کی جمالیاتی اور ابدی قدروں کے پیش نظر ہر اس تحریر کو چھاپنا پسند کیا ہے جو اس کے معیار پر پوری اتری ہے۔

نگار نے کبھی ادب برائے ادب کا علمبردار رہنا، نہ ادب برائے زندگی کا شدید مبلغ بن کر سامنے آیا نہ اس نے محض فن اور ہیئت کی قدیم روایات سے چپٹے رہنے والوں کا ساتھ دیا اور نہ جدید کی دھن میں قدیم کے ہر کارنامے کو غرق مئے ناب ادبی کہنے والوں کا ترجمان بننا پسند کیا۔ بلکہ اس نے صحافتی اور ہنگامی رجحانات و افکار کو نظر انداز کرکے ہمیشہ ایک متوازن علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی انداز فکر کی نمائندگی کی ہے۔

نگار کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں کبھی لچر، پوچ، فحش، عریاں اور سرسری تحریروں کو جگہ نہیں دی گئی بلکہ مختلف علوم و فنون پر جو مقالات اس میں شائع ہوتے ہیں خواہ وہ بڑوں کے ہوں یا چھوٹوں کے سب کے سب نہایت متوازن و سنجیدہ لب و لہجہ اور اسلوب کے حامل رہے ہیں۔ سنجیدہ اور وقیع ادب کے ترجمان کی حیثیت سے اس کی یہ روایت اتنی مستحکم ہوچکی ہے کہ آج نگار کو زبان و ادب کا معیار خیال کیا جاتا ہے اور اس کا نام زبان پر آتے ہی ایک نہایت ہی پر وقار سنجیدہ ادبی و علمی فضا کا سماں ہمارے ذہن میں ابھر آتی ہے۔

نگار کی ایک اور اہم خصوصیت جو اس کی روایت بن گئی ہے۔ یہ ہے کہ وہ ۱۹۲۵ء سے برابر ہر سال کسی خاص موضوع پر اپنا خاص نمبر شائع کرتا ہے یہ خاص نمبر مختلف وجوہ سے نہ صرف اردو صحافت بلکہ زبان و ادب اور علوم و فنون کی تاریخ میں بھی اہم خیال کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان نمبروں سے اردو زبان و ادب کے بہت سے تشنہ پہلو سیراب ہوگئے ہیں۔ مختلف

مبصرین و ناقدین کی رایوں کی مدد سے کسی خاص شخصیت یا موضوع کو پوری طرح سمجھنے سمجھانے میں مدد ملی ہے۔ بہت سے گمنام وکم معروف لیکن اہم شاعر و ادیب ان کے ذریعے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارے نظریات و آرا پر انھوں نے گہرا اثر ڈالا ہے ان نمبروں نے تحقیق و تنقید کی کئی راہیں کھولی ہیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے مشعل راہ بنے ہیں۔ ان میں بعض نمبر پورے پورے مدیر نگار کے لکھے ہوئے ہیں لیکن اکثر نمبروں میں متعلقہ موضوع پر، ساتذہ اور ماہرین نے حصہ لیا ہے۔ ان نمبروں کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالنے کا یہ موقع نہیں لیکن ان کی افادیت کے پیش نظر ان کا اجمالی ذکر قطعاً نامناسب ہو گا۔

جنوری ۱۹۲۸ء ..... مومن نمبر غالب و اقبال کی مقبولیت اور بڑھتی ہوئی شہرت نے کچھ ایسا اثر ڈالا تھا کہ مومن جیسا مایہ ناز غزل گو شاعر پردۂ خفا چلا گیا تھا۔ اور اس کی شخصیت و فن کا مطالعہ اب تک اس حیثیت سے نہ کیا گیا تھا جس کا وہ مستحق تھا۔ نیاز نے اس طرف توجہ کی اور نگار نے اولیں خاص نمبر کو اپنے محبوب ترین غزل گو شاعر مومن کے لئے وقف کر دیا۔ اس میں مومن کی حیات، شاعری اور اس کی قدر و قیمت پر پہلی بار تحقیقی و تنقیدی انداز سے روشنی ڈالی گئی نتیجۃً لوگ مومن کی طرف متوجہ ہوئے اور غالب کے نام کے ساتھ مومن کا نام بھی لبوں پر آنے لگا۔ یہ نمبر مومن پر پہلا کام ہے جو مومن کے مطالعے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ مومن پر ۱۹۲۸ء کے بعد جو کام ہوا ہے اس کی تحریک میں اس نمبر کو بڑا دخل ہے اور حقیقتاً یہ ہے کہ مومن پر کوئی کتاب کوئی مقالہ اور کوئی تذکرہ ان نگار کے مومن نمبر کو نظر انداز کر کے مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ مومن کا دوسرا ایڈیشن بھی اب سے چند سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اب نایاب ہے۔ اس لئے اس کا تیسرا ایڈیشن اضافہ کے ساتھ جلد شائع کیا جا رہا ہے۔

جنوری ۱۹۲۹ء ..... یہ خاص نمبر نگار کے سال احرا یعنی ۱۹۲۲ء کی یاد میں شائع کیا گیا ہے اور اس میں انھیں مضامین و منظومات کا انتخاب دیا گیا ہے جو نگار کی جلد اول یعنی ۱۹۲۲ء کے مختلف شماروں میں چھپ چکے تھے۔

جنوری ۱۹۳۰ء ..... "بہادر شاہ ظفر نمبر" اس میں مختلف مقالہ نگاروں نے ظفر کی زندگی، شخصیت اور شاعری کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے یہ نمبر ظفر کے سلسلے میں اولیں معیاری کام ہے اور ظفر پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جنوری ۱۹۳۱ء ..... کا خاص نمبر حسب ذیل تحریروں پر مشتمل ہے۔

(۱) علم فراست التحریر از سید یامین ہاشمی

(۲) داستان حسن و عشق۔ ورق خونیں۔ نیاز فتح پوری

(۳) ہمارے علمائے کرام کے عجیب و غریب نظریہ دینی۔ نیاز

(۴) خواب و خیال۔ مجنوں گورکھپوری

(۵) انجام و آغاز۔ نیاز فتح پوری

پہلا مقالہ خاصا طویل اور علمی انداز کا ہے اور اپنے موضوع پر ایک جامع کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جنوری ۱۹۳۲ء ..... "غالب کی شوخیاں" مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف لکھا تھا۔ عبدالباری آسی نے اس نمبر میں اسی "حیوان ظریف" کی ظرافت و شوخ نگاری کی تفصیل دی ہے۔ غالب کی اردو فارسی نثر و نظم دونوں کی چھان بین کے بعد یہ نمبر مرتب کیا گیا ہے اور غالب کے مزاج کی شوخی و ظرافت کا اس درجہ تفصیل و تحقیق سے جائزہ لیا گیا ہے کہ

اس نے ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ غالبؔ کی ظرافت کا اتنا جامع مطالعہ نہ اس سے بعد کیا گیا ہے اور نہ اس سے پہلے۔

جنوری ۱۹۳۳ء: "ملاحظات نمبر" .... نگار کے اداریے شروع سے "ملاحظات" کے عنوان سے لکھے گئے ہیں اور ان میں مدیر نگار نے ہمیشہ اہم سیاسی، مذہبی، علمی اور تاریخی و ادبی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ سیاسی مسائل خصوصیت سے "ملاحظات" میں زیر بحث آگئے ہیں اور ان میں برصغیر کی قومی و ملی تحریکات و رجحانات کی ایسی تفصیل محفوظ ہو گئی ہے جس کا مطالعہ افادیت و دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس نمبر میں ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک کے ملاحظات کا انتخاب دیا گیا ہے اور صرف وہی چیزیں شامل کی گئی ہیں جو وقتی نہیں بلکہ مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔

جنوری ۱۹۳۴ء: کا یہ خاص نمبر دو طویل اور اہم مضامین پر مشتمل ہے پہلا مضمون "لبوں کی داستان" سید مابین ہاشمی کا ہے جو تقریباً اسی صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور جس میں انھوں نے "لبوں" پر تاریخی و تحقیقی اور ادبی و اخلاقی انداز سے عالمانہ بحث کی ہے اور اس کی روایات و اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے مضمون کو نیاز فتح پوری کی ان قیمتی آرا کا مجموعہ سمجھئے جو انھوں نے مختلف چیزوں کے متعلق قائم کی ہیں۔

جنوری ۱۹۳۵ء: "اردو شاعری نمبر" اس نمبر کو اردو زبان و شاعری کی ایک مستند و معیاری تاریخ خیال کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ اس میں اردو زبان اور شاعری کی ہر صنف پر تاریخی و فنی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور اردو شاعری کے مختلف مکاتب فکر کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ دہلی، بہار، آگرہ، دکن، لکھنؤ میں اصلاح زبان و شعرا کے سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے اسے تنقید و تحقیق کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہر عہد، ہر دبستان اور ہر صنف کے ممتاز ترین شعراء کی فہرست بھی مرتب کی گئی ہے اور ان کے سوانح کے متعلق تحقیقی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ غرض کہ ۱۹۳۴ء تک زبان، فن اور فکر و اسلوب کی جو تبدیلیاں اردو شاعری میں رونما ہوئی ہیں ان سب کو اس نمبر میں بالتفصیل زیر بحث لایا گیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۶ء: "ہندی شاعری نمبر" ہندی کا اردو سے جتنا گہرا تعلق ہے وہ محتاج تفصیل نہیں لیکن ہندی شاعری و ادب پر اردو میں کوئی ایسا مواد موجود نہ تھا جو اردو جاننے والوں کو ہندی زبان و ادب سے روشناس کرانے کا ذریعہ بنتا۔ نگار کا یہ نمبر اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔ اس میں ہندی شاعری کے تدریجی ارتقا، اصناف شاعری کی خصوصیات، فطری مسائل و مباحث، مشہور شعراء کی سوانح اور خصوصیات پر بڑے پر مغز مقالے شامل ہیں۔ کلام کے انتخاب اور اشعار کے اردو ترجموں نے اس نمبر کو اور دلچسپ و مفید بنا دیا ہے۔ ہندی شاعری پر اب ایک دو کتابیں اور وجود میں آگئی ہیں لیکن بلحاظ معلومات جو مواد اس نمبر میں جمع ہو گیا ہے وہ کسی ایک کتاب سے آج بھی نہیں فراہم نہیں ہو سکتا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا اور اس میں چند نئے مقالات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

جنوری ۱۹۳۷ء: "اصحاب کہف نمبر" یہ نمبر نیاز فتح پوری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس نمبر میں (۱) ڈراما اصحاب کہف (۲) مسئلہ خلافت و امامت (۳) سائنس کی بعض دلچسپ معلومات (۴) آسکر وائلڈ کے خطوط (۵) نادرات کے عنوانات سے بڑی قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس لئے اسے دراصل "اصحاب کہف نمبر" کے بجائے "متفرقات نمبر" کہنا چاہیئے۔

جنوری ۱۹۳۸ء: "اسلامی ہند نمبر" پورا پرچہ مدیر نگار کا لکھا ہوا ہے اسے ہندوستان کے عہد اسلامی کی تاریخ خیال کرنا چاہیئے جس میں مدیر نگار نے مسلمان حکمرانوں کی سیرت طرز حکومت اور کارناموں پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۹ء "مصحفی نمبر" اُردو غزل گوئی کی تاریخ میں مصحفی کا نام خواجہ میر درد، میر تقی میر، آتش، غالب، مومن اور حسرت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ایک مختصر کتاب کے سوا ابھی کوئی کام ان پر نہیں ہوا حالانکہ نگار کے مصحفی نمبر نے ان کی شخصیت اور کلام پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے کئی نئی راہیں سجھا دی تھیں۔ چنانچہ آج اس نمبر سے بہتر صورت میں کوئی کام مصحفی پر موجود نہیں ہے۔ اس نمبر میں فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری نے مصحفی کے شاعرانہ رتبے کا تعین کیا ہے اور امیر احمد علوی اور عبدالباری آسی نے بالترتیب ان کی زندگی اور مثنویات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مدیر نگار نے آخر میں مضمون کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا طویل انتخاب دے کر اس نمبر کو اور بھی جامع بنا دیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس نمبر میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے۔ جو مصحفی کو سمجھنے اور اس کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن پچھلے سال پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء "نظیر نمبر" جس میں نظیر آبادی کی زندگی اور شاعری پر اُردو کے ممتاز اہل نقد نے اظہار خیال کیا ہے اس سے پہلے "نظیر" پر دو کتابیں لکھی جا چکی تھیں ایک "زندگانی بے نظیر" دوسرے "روح نظیر" ان دونوں کتابوں میں نظیر کی حیات و زبان پر مفصل بحث کی گئی تھی لیکن نظیر کے شاعرانہ مرتبے کے تعین کا مسئلہ تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ نظیر نمبر نے اس بڑی کمی کو پورا کیا اور نظیر کی شاعرانہ قدر و قیمت کو اس طرح منوالیا کہ آج نظیر کا شمار اردو کا ادلیں اور اہم ترین عوامی شاعر کے ہوتا ہے۔ اس نمبر کا دوسرا ایڈیشن بھی اب سے چند دنوں پہلے شائع ہو چکا ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء اس خاص نمبر کو "تذکرہ" نمبر خیال کرنا چاہیئے لیکن اس کی نوعیت تذکرہ نگاری کی روایت سے بالکل مختلف ہے اس نمبر یا تذکرے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات قلمبند کئے ہیں اور اپنے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ بیسویں صدی کی غزل اور غزل گو شعراء کے رجحانات و امکانات اور سوانح و مسائل کے سلسلے کا نہایت کارآمد مواد اس نمبر میں یکجا ہو گیا ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۴۲ء اس خاص نمبر میں ۳۵ اُردو کے ممتاز ناقدین نے جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر پر تبصرہ کیا ہے۔ اس طرح "غزل کی تنقید" کا جو پہلو سنہ ۱۹۴۱ء کے سالنامے میں تشنہ رہ گیا تھا وہ سیراب ہو گیا اور بیسویں صدی کی غزل پر ایسا جامع کام ہو گیا جو غزل کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء "ریاض خیرآبادی" کی شخصیت و فن کا مرقع ہے۔ اس میں خواجہ احمد فاروقی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، نیاز فتح پوری، سید عقیل احمد جعفری اور امرناتھ ہجا کے مقالات شامل ہیں۔ ریاض پر یہ پہلا اور آخری کام ہے جو ان کی زندگی اور کلام کے متعلق ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۴۴ء "جدید شاعری نمبر" اس میں ملک کے ممتاز اہل قلم نے جدید شاعری کے اصول و مقاصد اور رجحانات و امکانات کا جائزہ لیا ہے، اور معریٰ و آزاد نظم کے اصول وزن و قافیہ کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ نمبر اس وقت شائع ہوا تھا جبکہ جدید شاعری کا سورج اُبھر رہا تھا اس لئے اگرچہ اس نمبر کے ناقدین جدید شاعری کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرنے سے قاصر رہے ہیں پھر بھی یہ نمبر جدید شاعری کی تاریخ میں اہم خیال کئے جانے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ اس سے اس کی ارتقا کی ابتدائی منزلوں کا سراغ لگتا ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۴۵ء "قرآن نمبر" ڈاکٹر ٹ ہڈل نے "ما ھذا القرآن" کے عنوان سے قرآن پر جو اعتراضات کئے تھے وہ سب اس میں

پیش کئے گئے ہیں۔ جگہ جگہ حاشیائی نوٹ اور آخر میں مفصل تبصرے کے ذریعے مدیر نگار نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے اور دوسرے علمائے اسلام کو بھی اس کی جانب متوجہ کیا ہے۔ یہ نمبر نگار اور نیاز دونوں کی تاریخ میں اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ نیاز اور علمائے اسلام کے باہمی معرکے دراصل اسی کے بعد شروع ہوئے ہیں۔

جنوری ۱۹۴۶ء — "انتقاد نمبر" اس نمبر میں تنقید کی ماہیت و اصول تنقید پر مقالات ہیں۔ تنقید کے ہر پہلو، ہر نوع پر اس نمبر میں بحث کی گئی ہے اور مقالہ نگاروں نے اتنی محنت و تحقیق سے فکر انگیز مواد جمع کر دیا ہے کہ ہر مقالہ باوجود اختصار کے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر لطف الحسن ہاشمی ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ فراق گورکھپوری، خواجہ احمد فاروقی اور نیاز فتح پوری جیسے صاحبان فکر و نظر شامل ہیں۔

فروری ۱۹۴۶ء — "انتقاد دوم" یہ دراصل جنوری کے انتقاد نمبر کا تتمہ ہے جو اہم موضوعات جنوری کے نمبر میں زیر بحث آنے سے رہ گئے تھے وہ اس میں شامل ہیں۔ اس میں مجنوں گورکھپوری۔ احتشام حسین، سید مسعود حسین رضوی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ممتاز حسین وغیرہ نے تنقید کے نظری مسائل پر عالمانہ مقالات سپرد قلم کئے ہیں۔

جنوری فروری ۱۹۴۷ء — "مادجدلین نمبر" ۴۵ فرانس کے مشہور ادیب "الفونس" کا شاہکار ہے جسے حکیم رشید احمد معتصم پھلواری نے عربی ترجمے کی مدد سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

جنوری ۱۹۴۸ء — "پاکستان نمبر" پورا نمبر مدیر نگار کی فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ نمبر جو کہ قیام پاکستان کے صرف چار ماہ بعد منظر عام پر آیا ہے اور نیاز فتح پوری کی طرف سے اہل پاکستان کے لئے تہنیت و مژدہ کی حیثیت رکھتا ہے یہ نمبر برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم صحیفہ ہے جو اپنے موضوع و نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس میں برصغیر کے مسلمان فرمانرواؤں کی اس وسیع النظری و فراخ دلی۔ رواداری اور اخوت پسندی کی تفصیل دی گئی ہے جس سے بعض ۰۰۰ ہندو مورخین نے دانستہ چشم پوشی کی ہے اور مسلمانوں کو ظالم و جابر اور تنگ نظر سنگ دل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نمبر اگرچہ اس وقت شائع ہوا۔ جبکہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان سیاسی آگ لگ چکی تھی اور ہر طرف قتل و غارت کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ہندوستان میں بیٹھ کر پاکستان نمبر نکالنے کی ہمت نہ کرتا لیکن نیاز فتح پوری نے عین پر آشوب زمانے میں پاکستان نمبر شائع کیا اور اس میں محمد بن قاسم سے لے کر آخری بادشاہ سراج الدین ظفر کے عہد کا جائزہ لیا اور تحقیق کی روشنی میں اشتمال واقعات سے ثابت کیا کہ برصغیر میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور جذبۂ رعایا پروری سے پروان چڑھا ہے۔ اس نمبر میں پاکستان کے حکمران طبقے اور سیاسی رہنماؤں کے لئے بھی بہت کچھ تھا لیکن یہ نمبر ان لوگوں کی نظر سے شاید نہیں گذرا ورنہ پاکستان کی سیاسی و معاشی بدحالی کا رونا شاید نہ رہتا۔

جنوری فروری ۱۹۴۹ء — "افسانہ نمبر" اردو کے ان بہترین ۲۵ افسانوں کا مجموعہ ہے جو نگار میں شائع ہو چکے تھے۔

جنوری فروری ۱۹۵۰ء — "تنقید نمبر" ۱۹۴۶ء میں نگار کا جو انتقاد نمبر شائع ہوا تھا وہ تنقید کے نظری مسائل یعنی تنقید کی ماہیت و اصول سے تعلق رکھتا تھا ۱۹۵۰ء کا خاص نمبر عملی تنقید کے مثالی مقالوں پر مشتمل ہے۔ یہ نمبر دو حیثیتوں سے نہایت اہم ہے۔ اوّل اس لئے کہ اس سے اردو ادب کی بعض تحریکات، رجحانات و میلانات حکایت اور مراکز ادب کے تدریجی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اس میں بعض ایسی شخصیتوں پر جامع تنقیدی و تحقیقی مقالے شامل ہیں جن پر

اس سے بہتر انداز میں کبھی کسی نے قلم نہ اٹھایا تھا۔ اثر دہلوی۔ آسی غازی پوری۔ آزاد انصاری۔ بشیر علی افسوس۔ بیر منوں و یقین، ف لی۔ اور آتش کی شخصیتیں ایسی ہیں جن پر اس نمبر سے پہلے کوئی وسیع کام نظر نہیں آتا۔

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء ایک مستقبل کی تلاش یا مشرقِ وسطیٰ یہ نمبر دو خاص حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مارس ہنڈرس کی مشہور کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ ہے جس میں ان احمد نے ایران، مصر، عراق اور دیگر ممالک اسلامی کی اقتصادی حالات کا جائزہ لیا ہے اور ان کی موجودہ زبوں حالی کے تذکرے کے ساتھ ان کے روشن مستقبل کی نشان دہی کی ہے۔

دوسرا حصہ مدیر نگار کا لکھا ہوا ہے جس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور ان کے زوال کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۲ء حسرت نمبر: یہ نمبر حسرت موہانی کے انتقال کے صرف چند ماہ بعد شائع کیا گیا ہے اور اس میں تقریباً ملک کے سارے ممتاز اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔ اس نمبر کی جامعیت و اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس میں مجنوں گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، پنڈت کشن پرشاد کول، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، اثر لکھنوی، سید سلیمان ندوی کے مقالات کے سوا بھی بہت کچھ شامل ہے اور جو کچھ ہے اس درجہ مفصل، جامع مستند اور وقیع کہ اس سے بہتر کا تصور مشکل ہو جاتا ہے حسرت نمبر پر اب تک جو کتابیں اور رسائل شائع ہوئے ہیں ان سب سے کوئی بھی نگار کے نمبر حسرت تک نہیں پہنچتا اور یقین ہے کہ آئندہ بھی جو کام کیا جائے گا وہ اس نمبر سے مدد لئے بغیر مکمل و مفید نہ ہوگا۔ حسرت کی شاعری اور شخصیت پر خصوصیت سے جو مواد اس نمبر میں سمٹ آیا ہے وہ کہیں اور ملنا مشکل ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۳ء داغ نمبر: یہ نمبر داغ کی شخصیت اور شاعری کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ داغ کی غزل میں غالب، اقبال اور فانی کی سی فکری گہرائی یقیناً نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے وہ ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود طرز خاص میں ہونے کی وجہ سے اردو غزل گوئی کی تاریخ میں ہمیشہ رہنے والی چیز ہے۔ اس نمبر میں اردو کے ممتاز محققین و متقدمین نے داغ کی شخصیت اور غزل پر اظہار خیال کیا ہے اور داغ کی غزل گوئی کا ایسا بیش بہا مواد جمع کر دیا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بغیر داغ کا مطالعہ تشنہ رہتا ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۴ء فرمانروایانِ اسلام نمبر: پورا نمبر نیاز کی فکر کا نتیجہ ہے جسے تاریخ اسلام کی انسائیکلوپیڈیا خیال کرنا چاہیے۔ اس میں نیاز نے ولادت نبویؐ ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء سے لے کر دور حاضر تک کی ساری مسلم حکومتوں کے عروج و زوال کی داستان قلمبند کر دی ہے۔ ہر خاندان، ہر ملک اور ہر حکومت اور ہر دور کے متعلق مستند معلومات، تاریخی اطلاعات تعین کے ساتھ بہم پہنچائی گئی ہیں اور تاریخ نگاری کا حق ادا کیا گیا ہے۔ فرمانروایانِ اسلام کے سلسلے میں اب تک اس درجہ جامع و مستند اور مختصر تاریخی صحیفہ کسی زبان میں دیکھنے میں نہیں آیا۔

جنوری فروری ۱۹۵۵ء علوم اسلامی و علمائے اسلام: پورا نمبر نیاز فتح پوری کا لکھا ہوا ہے یہ نمبر مسلمانوں کے ثقافتی و علمی کارناموں کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کی مثال اردو میں نظر نہیں آتی عہد نبوی سے لے کر آج تک کی مسلم ریاستوں میں مسلمانوں نے مختلف علوم و فنون پر جو کام کیا ہے وہ سب نہایت اختصار، تحقیق اور جامعیت کے ساتھ اس نمبر میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس نمبر کو خاص چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں .... مختلف عہد اور مختلف ملکوں کی اسلامی سلطنتوں کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں

علوم اسلامی کی ارتقا پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں مشاہیر علمائے اسلام کا ذکر ہے۔ چوتھے حصے میں ہندوستان کے مشاہیر علماء کا ذکر ہے۔ غرض کہ یہ نمبر مسلمان حکومتوں، عالموں، اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کی ایسی انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں دنیائے اسلام سے متعلق تاریخ و فن کے اہتمام کے ساتھ ساری مفید باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

جنوری فروری ۱۹۵۶ء

"خدا نمبر" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ پورا نمبر نیاز کا نتیجہ فکر ہے۔ اس میں نیاز فتح پوری نے دنیا کے مختلف مذاہب کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ مختلف عہدوں اور مختلف قوموں میں خدا کا تصور کیا تھا اور کیا ہے۔ اس نمبر سے جہاں مدیر نگار کی وسعت مطالعہ اور مذاہب عالم کیلئے، ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں مذاہب پر ایسا وافر مواد مل جاتا ہے"

جنوری ۱۹۵۷ء
اصناف سخن نمبر

اردو میں اب تک کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس میں شاعری کے جملہ اہم اصناف کے فنی و تاریخی ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہو۔ یہ نمبر اس کمی کو پورا کرتا ہے، اس میں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، نظم اور نظم آزاد و معریٰ پر عالمانہ بحث کی گئی ہے اور اردو کے ممتاز محققین و ناقدین نے اپنے اپنے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے۔

جنوری ۱۹۵۸ء
معلومات نمبر

پورا نمبر نیاز فتح پوری کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے مختلف موضوعات کے تحت نہایت مفید اور اہم اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ یہ نمبر ایک طرف نیاز کے تبحر علمی کا اندازہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ دوسری مختلف علوم و فنون اور اشخاص و مقامات کے متعلق ہمیں ایسی قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے جو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد بھی میسر نہیں آسکتیں۔

جنوری ۱۹۵۹ء
تنقیح اسلام نمبر

پورا نمبر نیاز فتح پوری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں مذہب اور مذہب کی غایت پر بحث کی گئی ہے اور تقابلی مطالعہ کی مدد سے مذاہب عالم میں اسلام کا مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ اس نمبر کو دراصل نیاز کے مذہبی افکار و خیالات کا نچوڑ سمجھنا چاہیئے۔ عمر بھر کے مطالعہ کے بعد وہ مذہب کے سلسلے میں کس نتیجے پر پہنچے ہیں اور عقل و فکر کی روشنی میں مذہب کی نوعیت و افادیت کیا ہے۔ ان دونوں اہم سوالات کا جواب اس نمبر میں ملتا ہے۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور اردو کے اسلامی لٹریچر میں گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

جنوری ۱۹۶۰ء
انشائے لطیف نمبر

یہ نمبر عالشہ خاں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس میں مرتب نے نیاز کی زندگی اور فن پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے، اور نیاز کی تحریروں خصوصاً مکاتیب کا طویل انتخاب دے کر انشائے لطیف کی تاریخ میں نیاز کے مرتبے کا تعین کیا ہے۔

جنوری فروری ۱۹۶۱ء
غالب نمبر

غالب یہ نمبر نیاز فتح پوری کی مکمل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں نیاز نے غالب کی شخصیت، زندگی، اسلوب خاص اور جدت طرازی کا ناقدانہ اور محققانہ روشنی ڈالی ہے اور غالب کی اردو و فارسی، شاعری دونوں کو پیش رکھ کر ان کی قدر و قیمت متعین کی ہے آخر میں فارسی اور اردو غزلوں کا انتخاب بھی شامل ہے۔ اس نمبر میں نیاز کا وہ ناقدانہ موقف بھی بدلا نظر آتا ہے جو انھوں نے سنہ ۱۹۲۸ء میں مومن نمبر کے اجرا کے وقت اختیار کیا تھا اور جس میں انھوں نے مومن کو غالب سے بہتر غزل گو قرار دیا تھا۔

جنوری ۱۹۶۲ء اقبال نمبر اقبال پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب ان پر کوئی نئی چیز پیش کرنا آسان نہیں رہا۔ لیکن نگار کا "اقبال نمبر" اقبالیات پر ایسا اضافہ ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اقبال کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس نمبر میں اقبال کی شخصیت و فن کے بعض ایسے پہلوؤں پر بحث کی گئی جو ہماری نظر سے اوجھل تھے اور اقبال کے سلسلے میں جن سے واقفیت بہت ضروری ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال نمبر کے تین ایڈیشن چند مہینے میں ختم ہو گئے۔

سالنامہ ۱۹۶۳ء "نیاز نمبر" نیاز فتح پوری کی شخصیت، سوانح اور فن کا مرقع" آپ کے پیش نظر ہے۔

نگار پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر (سالنامہ ۱۹۶۲ء) جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نام نامی پر موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتدا اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

قیمت :- تین روپے

مصحفی نمبر نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، انکی ابتدائی تعلیم، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، انکی تالیف و تصانیف انکی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادباء اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت :- تین روپے

نظیر نمبر نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ، جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک اس کا فارسی و اردو کلام میں عارفانہ رنگ اسکی قدرت بیان و زبان اسی کا معیار تغزل، ادبیات اردو میں اسکا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازا اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صنائع و طبائع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسکی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت :- تین روپے

غالب نمبر سالنامہ ۱۹۶۱ء جس میں مرزا غالب کی فارسی و اردو شاعری کی خصوصیات کو بالکل نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ خاص نمبر اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے طلبار اور شائقین ادب کیلئے بیحد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔ قیمت پانچ روپے

ہندی شاعری نمبر جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔

قیمت :- چار روپے

نیاز کی آزاد خیالی

محمد عبد الشکور فکر ندوی

زندگی عبارت ہے حرکت سے اور شعر وادب زندگی کا ہی ایک شعبہ ہے، اس کا بھی کسی ایک نقطہ پر قائم رہ سکنا محال ہے، شعر و ادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اصول ارتقاء کے مطابق اردو زبان میں بھی ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہنچایا مگر انہیں ارباب کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونا لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے ماحول کا آلہ کار نہ تھے بلکہ ان لوگوں میں تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کرکے اپنی راہ الگ بناتے ہیں۔ اور اس طرح مستقبل کے لئے دلیل راہ بن جاتے ہیں چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد کی سطح سے بلند ہوتے ہیں اس لئے ان کے معاصر اور معاشرہ ان کو سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کر دیئے جاتے ہیں لیکن جلد یا بدیر وہ وقت بھی آجاتا ہے کہ جب ان کے فضل و کمال کی قدر کی جاتی ہے اور انکی پرستش ہونے لگتی ہے۔ یہی زمانہ آزادی کا حقیقی عہد ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی نفوس کے لئے ڈاکٹر جونسن لکھتا ہے:-

"ہر وہ شخص جسے لکھنا پڑھنا آتا ہے وہ قلم اٹھا سکتا ہے اور اٹھاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی کثرت زبان کو اسی صورت و حالت میں استعمال کرتی ہے جس صورت و حالت میں کہ زبان انکے سامنے آتی ہے۔ اس کے برعکس ایک فطین شخص زبان کو اپنے مقصد و ارادہ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اس کے دماغ میں غیر معمولی متنوع جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے احساس و خیال میں ایک ہمہ گیر وسعت ہوتی ہے اس کے تصورات عمیق ہوتے ہیں۔ زندگی و آداب زندگی کے متعلق اس کی رائے تقلیدی نہیں ہوتی، تاریخ کے باب میں اس کا فیصلہ خود اسی کے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور وہ ان سب مناسب الفاظ و زبان میں ایک مخصوص انداز بیان کے ساتھ پیش کرتا ہے اس کا یہ اظہار خیال چونکہ اس کے ذہنی بطون کا عکس ہوتا ہے اس لئے وہ کثیر الاشکال ہوتا ہے اور اس کے لئے جو زبان وہ اختیار کرتا ہے اس میں ندرت، لطافت و حلاوت کا بیک وقت نہایت دلچسپ امتزاج پایا جاتا ہے۔"

کیا جونسن کی یہ تعریف غالب دہلوی اور نظیر اکبرآبادی پر صادق نہیں آتی؟ عہد متاخرین تک اردو ادبیات کی تاریخ میں یہی دو ہستیاں تھیں جنھوں نے تمام مسلک کو ترک کرکے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے ان کے زمانہ میں ان کی قدر ہونا ناممکن تھا اگر ہوتی تھی تو بالکل غلط بنیاد پر لیکن انکی عزت کا عہد بھی آگیا چنانچہ آج ارباب کمال نے ان دونوں ہستیوں پر خصوصاً غالب پر اس قدر لکھا کہ کوئی پہلو لکھنے کے لئے نہیں چھوڑا۔ یہی حالت آج جناب نیاز فتحپوری کی ہے۔ جناب نیاز جس بنا پر آج ننگ اسلاف تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ موصوف کی آزاد خیالی ہے۔ اور یہی جوہر ان کے لئے باعث بدنامی ہے۔ جناب نیاز اگرچہ سماجی قوانین کے شکنجہ میں کسے ہوئے ہیں۔ لیکن اپنے رجحان آزادی کے مقابلہ میں کبھی سماج سے مرعوب نہیں ہوتے اور علانیہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جناب نیاز کا طرز نگارش نہ تفاخرانہ ہے نہ زاہدانہ

جس کا ثبوت ان کی داخلی و خارجی زندگی ہے یعنی ان کے جذبات و حسیات اور فعل و عمل میں شدید مطابقت پائی جاتی ہے۔

جناب نیاز کے الحاد کے متعلق اظہار خیال سے پہلے ملحدی کی حقیقت کو سن لیجئے۔ جہاں تک نفس اختلاف و اعتراض کا تعلق ہے حکمائے اسلام میں بہت سی ایسی ہستیاں گزری ہیں جنھوں نے جمہور علماء سے کھلم کھلا اختلاف کیا ہے۔ ابن راوندی، صالح ابن قدوس، یعقوب ابن اسحاق، فارابی، ابن سینا، ابن رشد سے لیکر، امام رازی، غزالی، طوسی ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم تک سب کے سب خود نیاز اس کو بالائے طاق رکھ کر بہت سے مسائل میں جمہور علماء سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن قیم اور علامہ ابن تیمیہ نے فنائے نار کے مسئلہ میں جو عقائد کا بہت زبردست مسئلہ ہے۔ علامہ نے اپنی ذاتی رائے کو جمہور کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے، جس کے موید جناب مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔ سوال یہ ہے کہ جب علماء کرام کہتے ہیں تو اعتراض نہیں ہوتا اور جب نیاز وہی بات کہتے ہیں جو وہ کہہ گئے ہیں تو ہدف ملامت بنائے جاتے ہیں۔ میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ "الحاد" کا لفظ بہت ہی محدود معنی میں نیاز صاحب کے مضامین پر مستعمل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ تقلید ترک کر کے خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جو سمجھتے ہیں اسے پوری بے باکی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب علامہ نیاز بھی وہی کہتے ہیں جو ہمارے بعض دوسرے علماء کرام فرماتے ہیں تو ان کے قول کو کیوں بنظر استحقار دیکھا جاتا ہے۔

نیاز صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہب کا تعلق چند متعین رسوم و قیود سے نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کا ایک فلسفہ ہونا چاہیئے تاکہ غیر مذہب کے عقلاء کے سامنے پیش کیا جا سکے اور اس طرح ہو کہ تمام مذاہب کسی ایک مرکز پر پہونچ کر اشتراک عمل پیدا کر سکیں لیکن عبدالماجد دریابادی کے قسم کے مذہبی لوگ اسے کفر و الحاد بتاتے ہیں۔

ہمارے علماء مذہب یا جمہور کی طرف سے ایسی غیر مہذب و ناشائستہ ذہنیت کا اظہار بجائے اس کے کہ لوگوں کو مذہب کی طرف سے مطمئن کرنے اور غیر مطمئن بنا دینے والا ہے کیونکہ اس سے لوگ یہ سمجھیں گے کہ علماء مذہب کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ان کا تنہا حربہ "کافر و ملحد" کہہ دینا ہے۔

جناب نیاز جب تک خدا کی وحدانیت اور رسالت رسول کے قائل ہیں (خواہ وہ رسالت کا مفہوم کچھ قرار دیں) دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ انھیں ملحد یا مرتد کہہ سکے۔

جس طرح عبدالماجد وغیرہ کو اپنی جگہ تفکر و تدبر کا حق حاصل ہے، نیاز کو بھی حاصل ہے اور انھیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے علماء کی تقلید کریں۔ اگر علماء اپنی جگہ اسلام کی خدمت اس بات میں سمجھتے ہیں کہ مذہب کو "عجوبۂ روزگار" بنا کر پیش کریں تو جناب نیاز بھی اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کی خدمت اس کو قرار دیتے ہیں کہ وہ "قابل فہم و عمل" چیز قرار پائے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج ہمارے علماء کرام الحاد و بیدینی کی اشاعت پر تو ماتم کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اس کا مجرم حقیقتاً خود انھیں کی ذات ہے جو اس دور "علم و عقل" میں بھی مذہب کو "مزخرفات" کا مجموعہ بنائے ہوئے ہے۔ دنیا کا کوئی ادارہ اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے اور یقیناً مذہب بھی زندہ نہیں رہ سکتا اگر اس نے زمانہ کا ساتھ نہیں دیا۔

نیاز صاحب میری نظر میں

سوز شاہجہانپوری

جناب نیاز کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ بڑی حد تک مغرور ہیں لیکن یہ بات کسی درجہ میں بھی صحیح نہیں ہے۔ دراصل حضرت نیاز کو دوست پہچاننا بہت مشکل ہے اور اس قسم کی خیال آرائیاں انہی حضرات تک محدود ہیں جنھیں کبھی نیاز صاحب سے قریب ہونے کا موقع نہیں ملا۔ ایک گروہ وہ ہے جو انانیت اور نیاز کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے، لیکن حقیقت ہمیشہ اس کے برعکس رہی یعنی یہ کہ انانیت اور نیاز فتحپوری دو متضاد چیزیں ہیں جو کسی نہج سے بھی لازم و ملزوم نہیں ہو سکتیں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ ان کی خود اعتمادی اس مقام پر ہے کہ بعض کم نگاہ اسے "انا" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسی قبیل کے کچھ اور عنوانات بھی ہیں جو سرزلف کے طور پر اکثر و بیشتر نیاز صاحب کے نام کے ساتھ استعمال ہوتے رہے ہیں مثلاً یہ کہ "نیاز صاحب انتہائی ضدی ہیں"، "اول درجے کے ہٹ دھرم ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

اب لگے ہاتھوں ذرا اس "ضد" اور "ہٹ دھرمی" کو بھی دیکھتے چلئے! نیاز صاحب کے سامنے جب کوئی موضوع آتا ہے تو وہ ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد اس کے اہم اجزا پر پوری دیانت داری سے غور و فکر کرتے ہیں، معقولات اور منقولات کو جانچتے ہیں اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اپنے علم کی روشنی میں اچھی طرح دیکھتے ہیں اس کے ہر ایک حصے کو عقل و نقل کی کسوٹی پر کستے ہیں اور پھر آخر میں موضوع کی اچھی طرح حد بندی کر کے پوری خود اعتمادی کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ اب اس کے بعد کوئی طاقت ان کا نقطۂ نظر نہیں بدل کر سکتی۔ اس لئے کہ انہوں نے موضوع کو سمجھنے میں پوری کاوش کی ہے اس کے الجھاؤ کو سلجھانے میں دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ روایت و درایت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

اب آپ ہی انصاف سے کہئے کہ اس قدر جانفشانی و عرق ریزی کے بعد کوئی صاحبِ علم و عقل صرف الٹی سیدھی منطق یا بے سرِ پا دلائل کے آگے سپر ڈال دے گا! اور اپنے موقف سے ہٹ جائے گا!! ہرگز نہیں، بس اسی اصول پر نیاز صاحب کو بھی منطبق کرنا پڑے گا۔

ان کا طرزِ استدلال اتنا وزنی ہوتا ہے کہ حریف کے لئے اس کا لنگر سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کروں گا۔

اب سے تقریباً بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے کہ نگار میں "مسئلہ خلق قرآن" کے بعض پہلوؤں پر بحث چلی تھی (حالانکہ یہ مسئلہ نیا نہیں ہے عباسیوں کے دورِ خلافت میں ایک گروہ قرآن کو ایک خاص حد تک مخلوق سمجھتا تھا) اس بحث کا لب و لباب یہ تھا کہ بین الدفتین جو کچھ ہے اس کا نام قرآن ہے۔ نیاز صاحب کا کہنا یہ تھا کہ صرف مفاہیم کا نام قرآن ہے اور استدلال یہ تھا کہ بین الدفتین جو کچھ ہے اگر اسے ہم کلام الٰہی تسلیم کر لیں تو عربی زبان کو بھی صفاتِ ربانی میں شامل کرنا پڑے گا درانحالیکہ نہ صرف عربی بلکہ دنیا کی

ہر زبان فانی ہے اور جو شے فانی ہے اس کے صفات، تبانی یا ذات، ربانی میں ہرگز شامل نہیں کیا جا سکتا (میں صرف نیاز صاحب کے انداز فکر اور طریقہ استدلال پر گفتگو کر رہا ہوں اصل مسئلہ کی یہاں مخالفت یا موافقت مقصود نہیں) نیاز صاحب کا یہ کہنا تھا کہ جس طرح دوسرے اکابرین سلف قرآن کو سمجھنے کا حق رکھتے تھے اسی طرح مجھے اور ہر مسلمان کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ کلام اللہ کو سمجھنے کے لئے اپنی عقل و فراست استعمال کرے پھر آخر مجھے کیوں اس حق سے محروم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس قسم کے مسائل پر جناب نیاز کے طرز استدلال کے سلسلے میں مجھے صرف ایک بات اور عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک میں نے نیاز صاحب کو پڑھا اور سمجھا ہے (میری زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا ہے میں نے نیاز صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے میں ان کی خدمت میں ہفتے میں دو چار بار ضرور حاضری دیا کرتا تھا) وہ اس سلسلہ کے مصداق ہیں جسے قرآن نے "وبذالک امرت وانا اول المسلمین" کہا ہے اور ظاہر ہے کہ دانا اول المسلمین کا بار وہی اٹھا سکتا ہے جس نے اسلام آنکھ بند کر کے نہیں بلکہ پیوستہ ہوش و گوش اور چشم بینا کے ساتھ اختیار کیا ہو (نیاز صاحب "موروثی" مذہب کے قائل نہیں ہیں)

ناظر حضرات یہ بھی جانتے ہیں کہ اس طرز استدلال و انداز فکر کو اختیار کرنے پر نیاز صاحب کو ذہنی جور و جبر کس قدر تکالیف برداشت کرنی پڑی ہیں مگر ان کے پائے استقامت کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔

غالباً ۱۹۳۵ء یا اس کے لگ بھگ جب ہر طرف سے دار و گیر شروع ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض محلے میں کو نیاز صاحب کی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی (انہیں دنوں غالباً مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الامان دہلی بعض سیاسی اختلافات کی بنا پر قتل کر دئے گئے تھے) مگر صاحب! کیا مجال کہ اس مرد آہن کے معمولات میں ذرہ برابر فرق آیا ہو۔ ایک روز دوپہر کو جو میں گیا تو دفتر میں سناٹا، نہ کاتب نہ چپڑاسی، ابھی میں نیاز صاحب کے کمرے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ چق کے پیچھے سے آواز آئی "اندر آ جائیے"

اندر جا کر دیکھا کہ حضرت یکہ و تنہا بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا "ایسے حالات اور ایسے عالم میں کہ سڑک سے لیکر یہاں تک سناٹا ہی سناٹا ہے آپ اکیلے بیٹھے ہیں"

فرمایا "جی ہاں: ایک نوٹ لکھ رہا ہوں"

اس کے بعد غالباً مجھے سگریٹ جلانے کیلئے دیا سلائی کی ضرورت پڑی۔ نیاز صاحب نے میز کے داہنی جانب والے خانے کی طرف اشارہ کیا میں نے جو دراز کھولی تو دیکھا کہ ایک کافی لمبا خنجر نیام سے بے نیاز دراز میں رکھا ہے، نیاز صاحب مسکرائے اور مجھے فوراً یاد آیا کہ معاملہ صرف ادیب یا مدیر کا نہیں بلکہ ماضی کے تھانہ دار اور پٹھان کا بھی ہے جو ماشاء اللہ اپنے تن و توش کے لحاظ سے دو چار پر تو لمحہ بھی بھاری ہے۔ نگار میں ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی کے کلام پر ایک تنقیدی مضمون چھپا لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں وہ مضمون کافی دنوں تک زیر بحث رہا۔ ایک دن شام کو راقم السطور اور مجاز مرحوم جوش صاحب کے ساتھ ان کی "محفل شبانہ" میں پہنچے۔ حضرت جوش کی نشست ان دنوں گولہ گنج میں مرزا جعفر حسین صاحب کے یہاں ہوتی تھی اور بقول جوش "غروب آفتاب کے بعد وہاں وہ جام بکف طلوع ہوتے تھے" اتفاق سے اس محفل میں بھی وہی مضمون زیر بحث آیا مضمون میں کسی مقام پر یہ بھی تھا کہ جوش صاحب نے اپنے ایک مصرعہ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اے امت بدر و حنین" (پورا مصرعہ مجھے یاد نہیں رہا بحر یہ ہے فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) اس مصرعہ پر اعتراض یہ تھا کہ "امت بدر و حنین" کا ٹکڑا بے معنی ہے اس لئے کہ بدر اور حنین مقامات کے نام ہیں اور امت رسول کو کسی مقام کی امت کہنا قطعی صحیح نہیں ہے۔ اور یہ کہ جوش صاحب کے اس تخاطب سے دراصل "فاتح بدر و حنین کی امت مراد ہے" اور لفظ فاتح جوش صاحب محذوف کر گئے

جب بحث میں کافی گرما گرمی ہونے لگی تو جوش صاحب نے اپنے اس بلند مقام سے جہاں وہ جام بکف ہونے کے بعد پائے جاتے ہیں ایک خاص انداز سے بحث کرنے والوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور جب ہم سب ان کی طرف مخاطب ہوئے تو فرمایا کہ گرفت کس نے کی ہے؟ اور پھر خود ہی جواب دیا۔ نگار نے۔ " لہٰذا بحث کی گنجائش نہیں تم سب کیوں میری شام "خراب" کر رہے ہو، اور ایسی صورت میں جبکہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

لکھنؤ میں اکثر بڑے بڑے مشاعرے بھی ہوتے رہتے تھے لیکن نیاز صاحب ان دنوں اس قسم کی محفلوں میں شریک نہیں ہوتے تھے ایسے ہی ایک بڑے مشاعرے کے موقع پر جبکہ ہندوستان بھر کے مشاہیر شعراء لکھنؤ میں جمع تھے، نیاز صاحب نے باہر سے آئے ہوئے بعض شعرائے کرام کو جن میں جگر صاحب بھی شامل تھے شام کی چائے پر مدعو کیا۔ مقامی شعراء میں راقم السطور کے علاوہ سراج لکھنوی، نذیر لکھنوی اور بعض دوسرے بھی تھے جب شعراء اپنا اپنا کلام سنا کر چلے گئے تو نیاز صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کی نظم خوب ہے۔ ذرا ابتدائی شعر پڑھئے گا میں نے پڑھا ۔

زمانے پر مسلط ہو چکی تھیں قوتیں شب کی
متاع آفتابی شب کے ہاتھوں لٹ چکی کب کی

فرمانے لگے یہ "متاع آفتاب" کی جگہ "متاع آفتابی" کیا؟ ایسی ہی ضرورت شعری اچھے قسم کے شعر کو خاک میں ملا دیتی ہے (نیاز صاحب کے نزدیک آفتابی کی یا معروف فاضل اور ضرورت شعری کے لئے استعمال ہوئی ہے)

اکثر مواقع پر جناب نیاز ایسی برمحل گرفت کرتے ہیں اور ایسی گہری چٹکی لیتے ہیں کہ انسان بلبلا اٹھتا ہے، غالباً ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں نگار کے کسی شمارہ میں میری ایک نظم "احساس پندار" شائع ہوئی۔ (اس نظم کی اشاعت سے پہلے کسی اور شمارے میں نیاز صاحب نے غالباً باب الاستفسار میں کہیں یہ بات کہی تھی کہ "مجھے آپ کی عقل سے زیادہ اپنی حماقت عزیز ہے اس لئے کہ وہ میری اپنی ہے") نظم چھپنے کے بعد جب حسب معمول نیاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور نظم کے متعلق نیاز صاحب کی رائے معلوم کرنا چاہی تو موصوف نے اس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے

رہین منت اہل خرد نہیں یہ شے
ہزار ہوش سے بڑھکر ہے اپنی بے خبری

اور فرمانے لگے کہ اس نظم کے تسلسل کیلئے تو یہ شعر بہت ضروری ہے لیکن کہیں زندگی کیلئے زہر کا حکم رکھتا ہے "آپ کو" اس طرح کے انداز فکر سے گریز کرنا چاہئے۔

ایک مرتبہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے منتظمین نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ایسا موضوع رکھا جائے جس میں شعرائے کرام اپنا کلام بھی سنائیں اور ساتھ ہی اپنے کلام پر خود ہی تنقید بھی کریں یعنی مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بھی بنیں اور پھر اپنے عیوب بھی گنوائیں، موضوع کی ندرت اور تنوع میں کسے کلام ہو سکتا تھا بہرحال موضوع مقرر ہوا، مگر نتیجے کے طور پر بہت سے مشاہیر نے انکار کر دیا لیکن جوش صاحب نے وقت مقررہ پر اپنا کلام معہ تنقید نشر کیا۔ دوسرے نمبر پر پنڈت آنند نرائن ملا آئے، اگلے ہفتے میں تیسرا نمبر میرا تھا میں نے نیاز صاحب سے اپنی ہچکچاہٹ کا ذکر کیا نیاز صاحب نے کہا ضرور جاؤ اور جس طرح کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیان" اسی طرح تصنیف کے حسن و قبح کو بھی مصنف سے بہتر کون جان سکتا ہے آخر کار وقت مقررہ پر میں اس مرحلہ سے گذرا، نیاز صاحب نے وہ نشریہ سنا اور جب اس مضمون پر مجھ سے گفتگو ہوئی تو فرمایا "اپنی شاعرانہ کمزوریوں کا ذکر آپ ریڈیو پر اس طرح کر رہے تھے جیسے کوئی مجرم عدالت میں اقبال جرم کرتا ہے" (ایک بات جو مجھے شروع میں عرض کر دینا چاہئے تھی وہ اب ذہن میں آئی ہے یعنی لکھنؤ میں علامہ نیاز فتحپوری سے میرے

قریب ہونے کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ نیاز صاحب کے برادر نسبتی عبدالرشید خاں (الیکٹرک انجینئر) میرے عزیز دوستوں میں ہیں اور رشید کے والد بزرگوار ولایت خانصاحب سابق انجینئر ریاست محمود آباد میرے بڑے چچا مرحوم کے ملنے والوں میں ہیں لہٰذا اس خاندان کی چھوٹی سی چھوٹی تقریب میں بھی میری شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی اور اس طرح مجھے ابتداء میں نیاز صاحب کو قریب سے دیکھنے کے مواقع زیادہ حاصل ہوتے رہے) دوسری جنگ عظیم کے دوران جب کاغذ کی کمیابی نایابی کے درجے کو پہنچ گئی اور ہندوستان کے متعدد اخبارات و رسائل پر بندش پڑنے لگی تو میں نے ایکدن نیاز صاحب سے پوچھا کہ حضور والا !

اب نگار کی اشاعت کیسے ہوگی تو نیاز صاحب نے جواب دیا وہ اسی عزم و خود اعتمادی کی تفسیر ہے جس کا ذکر راقم الحروف نے ابتداء میں کیا ہے اور جس کی بدولت نگار اپنی اس طویل عمر میں کبھی ایک اشاعت کا بھی ناغہ نہ کرسکا اور نگار کی یہ نظیر شاید اس برصغیر کا کوئی علمی و ادبی مجلہ پیش نہیں کرسکتا۔ نیاز صاحب نے فرمایا کہ میاں! نگار کے پڑھنے والے اس کی معنوی حیثیت کے دلدادہ ہیں نہیں ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کوئی سروکار نہیں لہٰذا نگار اس وقت تک شائع ہوتا رہے گا جب تک پتنگ بنانے کا کاغذ بھی دستیاب ہوتا رہیگا اور نگار بہرحال چھپتا رہا۔

اور صاحب کمال تو یہ ہے کہ نیاز صاحب جب لکھنؤ کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر کراچی گئے تو جولائی کا شمارہ نکال کر گئے اور اگلا شمارہ کراچی پہنچ کر نکال دیا۔

نیاز صاحب انتہائی بلند کردار، صاحب عزم اور عالی ظرف انسان ہیں۔ ان کی عالی ظرفی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ جب ہر طرف سے ان پر لعن طعن کی بوچھار ہوتی تھی اس وقت بھی وہ اتمام حجت کے طور پر خالص علمی و ادبی زبان استعمال کرتے تھے جب کہ حریف ہمیشہ سب و شتم پر اتر آتے تھے، نیاز صاحب بہت سادہ مزاج اور صاف دل آدمی ہیں لاگ لپیٹ سے کوسوں دور، ان کا ظاہر و باطن یکساں ہے میرے نزدیک ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے وہ اس طرح کے عالم و دانشور نہیں ہیں جن کہ یہ شعر صادق آسکے

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

ان کی خلوت و جلوت میں کسی قسم کا میل یا ملاوٹ نہیں پائی جاتی بات کچھ طویل ہوگئی حالانکہ اس کو سمیٹ کر بھی کہا جاسکتا تھا لیکن معاملہ چونکہ نیاز صاحب کا ہے اس لئے جی چاہا کہ جو کچھ کہنا ہے ذرا پھیلا کر کہو حالانکہ بقول شاعر ؎

بحرے میتواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

مختصر یہ کہ نیاز صاحب گوناگوں خصوصیات و صفات کے حامل ہیں بلکہ سیدھے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ نیاز صاحب ایک مکمل ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ خود ایک مکتبۂ خیال ہیں ان کا ایسا دیدہ ور اور مفکر صدیوں کی الٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

خدا ان کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے۔ آمین ؟

حضرت نیاز فتحپوری

احمد جمال پاشا

نیاز صاحب کے علم اور بد دماغی کے چرچے سن سن کر اشتیاق ہوا۔ ان کو پڑھنے کا اس کے بعد ان سے نیاز حاصل کرنے کا شوق چرایا۔ ایک بار ایک صاحب نے راستے میں دکھایا کہ یہ "نیاز فتحپوری" ہیں۔ میں نے جھک کر علامہ کو بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ سلام کیا مگر نیاز صاحب بغیر سلام کا جواب دیئے گذر گئے۔ پھر عرصہ تک ان سے ملنے کی ہمت نہ ہوئی۔ علیگڈھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ "ادیب" کا انشائیہ نمبر" نکالنے کی دھن سوار تھی۔ نہ جانے بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ "ادیب" کے کچھ پرچے بغل میں دبا کر سیدھا "نگار" کے دفتر پہونچ گیا۔ "نگار" کے دفتر کے سامنے سے بہت دفعہ گذرا تھا مگر کبھی اندر جھانکنے کی ہمت بھی نہ پڑی تھی۔ آج سامنے سے گذرنے کے بجائے دفتر کے اندر پہونچ گیا۔ نیاز صاحب کی نظر مجھ پر پڑی مگر مجھے ٹوکنے کے بجائے انگریزی کا اخبار اٹھا کر مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ اور میں نے ان کی میز سے کتابیں اور رسالے اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیئے۔ نیاز صاحب نے کچھ دیر بعد تھوڑا سا منہ ٹیڑھا کر کے بڑی بے رُخی کے ساتھ دریافت کیا۔ "کہیئے ۔!" میں نے اپنا تعارف کرانے کی رسم ادا کرتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ بولے۔ "پھر ۔؟" ایک بار تو اس "پھر" نے دل بٹھا ہی دیا مگر ڈھیٹ بنکر بولا۔ "علی گڈھ جامعہ اردو کا ماہوار رسالہ "ادیب" میں ہی نکالتا ہوں۔ اور اس کے کچھ شمارے آپ کو پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں ۔"

انہوں نے رسالے اٹھا کر میز پر رکھ دیئے اور پھر اخبار پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پھر مجھے موجود پاکر بولے۔ "اچھا؟" میں نے عرض کیا۔ "ادیب" کا انشائیہ نمبر نکالنا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے قیمتی مشورے اور انشائیہ لئے بغیر نہیں جاؤں گا۔" انہوں نے ایک بار پھر مجھے سر سے پیر تک بغور دیکھا چہرے پر کچھ نرمی کے آثار نمودار ہوئے۔ خود اٹھکر اندر گئے۔ "نگارستان" کی ایک جلد لاکر اس میں ایک "انشائیے" پر نشان لگا کر کتاب میرے حوالے کر دی۔ میں نے کہا ایک اور کام ہے۔ بولے۔ "کیا"۔ میں نے کہا۔ "اگلی بار پھر آنے بلکہ آئندہ آتے رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔" بولے۔ "ضرور آیئے۔" میں نے مزید ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "وہ وقت بھی بتا دیجیئے جب آپ اخبار پڑھ چکتے ہوں۔" نیاز صاحب ہنستے ہوئے بولے "آپ ہر وقت آسکتے ہیں۔"

دوسری بار ایک کتاب تبصرے کے لیئے لیکر گیا۔ نہ آنے کی شکایت کی اور اس کے بعد جو حکیمانہ، دلچسپ اور رنگین باتیں شروع کیں تو پھر ختم ہونے ہی نہ آتی تھیں۔ پھر جب کبھی موقع ملتا میں نیاز صاحب سے ملنے ضرور جاتا۔ ان کی باتوں میں اب بھی وہی سدا بہار رنگینی اور تازگی ہے۔ جو ان کے رومانی افسانوں کی روح ہے۔ اور وہی علمیت و ادبیت ہے جو "نگار" کا طرۂ امتیاز ہے۔

نیاز صاحب دراصل پکے صحافی ہیں اور صحافی کبھی کسی کا نہیں ہوتا۔ اسی لئے نیاز صاحب بھی سب کے ہیں اور کسی کے بھی نہیں ہیں۔ نہ دین کے اور نہ دنیا کے مگر دونوں جہاں کے ہیں۔ مگر ان کو سب کا ہونے کے بجائے کسی کا نہ ہونے ہی میں

لطف آتا ہے۔ ان کی صحافتی عشوہ طرازیوں میں ان کا یہ محبوبانہ انداز ہمیشہ آپ کو جلوہ گر نظر آئے گا۔ جب تک مخالفت اور ہنگاموں کے طوفان نہ اٹھیں نیاز صاحب چادر تان کر چین اور عیش کی نیند نہیں سو سکتے۔ اسی لئے جب میں ان کے بارے میں کوئی چونکا دینے والی بات سنتا ہوں تو مجھے قطعی تعجب نہیں ہوتا۔ ہاں یہ اطمینان ضرور ہو جاتا ہے کہ اس وقت نیاز صاحب بہت اطمینان سے ہونگے۔

سامری

سامری کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہے "کوئی شخص جو اہل سامرہ میں سے تھا" اس لفظ میں "ی" نسبت کی ہے۔ اگر کسی مخصوص شخص کا نام ہوتا تو کلام مجید میں "السامری" "ال" کے ساتھ نہ پایا جاتا۔ سامرہ، شامرہ یا سمارتن ایک شہر کا نام تھا جو کوہ شومرون کو اس کے مالک شمر سے خرید کر کے عمری بادشاہ نے بسایا تھا اور یہاں کے لوگ سامری یا شامری کہلاتے تھے۔ یہ لوگ پہلے سے سونے کا بچھڑا بنا کر اس کی پرستش کیا کرتے تھے۔

رہا یہ امر کہ اہل سامرہ میں سے کسی شخص نے ایسا بچھڑا بنایا تھا جو بولتا تھا اس کے متعلق ایک غلطی تو بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس کی آواز کو حقیقی معنی میں ایک زندہ بچھڑے کی سی آواز قرار دیا ہے، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہے اور دوسری غلطی اس آواز کے تعین کے اسباب میں کی گئی ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں سے کوئی آواز پیدا ہوتی تھی، لیکن اس کا سبب یا تو صاحب تفسیر کبیر کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ وہ بچھڑا کھوکھلا تھا اور اس کے اندر کوئی آدمی چھپ کر بچھڑے کی سی آواز نکالتا تھا یا تفسیر مجمع البیان کے قیاس کے مطابق اس کی ساخت اس طرح کی تھی کہ اندر سے ہوا پہنچکر کوئی آواز پیدا کرتا تھی۔ اس زمانہ میں ایسے کھلونے کثرت سے بنائے جاتے تھے اور اس میں کوئی استبعاد عقلی نہیں ہے۔

جن مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ جبریل کے سُم اسپ کی خاک سامری نے اٹھالی تھی اور اس کے ڈالنے سے بچھڑا بولنے لگا تھا انھوں نے حقیقتاً غلطی کی ہے اور کلام مجید کے الفاظ پر غور نہیں کیا، قرآن پاک کے الفاظ یہ ہیں:۔ "قال فما خطبک یا سامری قال بصرت بما لم یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذتہا وکذلک سولت لی نفسی" یعنی موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے اس نے جواب دیکر مجھے ایک ایسی بات سوجھی جو کسی اور کو نہ سوجھی تھی، میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی مٹی لے کر بچھڑے میں ڈال دی اور اس طرح میرے نفس نے مجھے دھوکا دیا۔

چنانچہ بعض مفسرین نے لفظ الرسول سے جبریل مراد لے کر دور از کار خلاف حقیقت باتیں پیدا کیں، حالانکہ الرسول سے مراد خود حضرت موسیٰ تھے اور سامری کا مقصود یہ کہنا تھا کہ میں نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے آپ کے قدم کی خاک بچھڑے میں ڈالدی تھی تاکہ اس کی آواز کی علت یہ قرار دے کر صحیح اسباب کی طرف سے لوگوں کے خیال کو ہٹا دوں لیکن یہ حقیقتاً میرے نفس کا بڑا فریب تھا۔ (نیاز)

اعتراف و اعتذار

خیر مقدم

بہار کوٹی

علم کا گنج شائگاں لے کر　　　فکر کا بحرِ بیکراں لے کر
خود شناسی۔ خودی خود آگاہی　　　عزم مستحکم و جواں لے کر
روحِ دراک و دیدۂ بیباک　　　قلب شوریدہ و تپاں لے کر
طلبِ حق کا ذوق بے پایاں　　　اک تب و تابِ جاوداں لے کر
ذوقِ تحقیق و جستجوئے کمال　　　شوقِ تخلیق بے اماں لے کر
ہدیۂ صد نگارشِ رنگیں　　　نذرِ انشائے دلستاں لے کر
بے تعلق بہ شانِ استغنا　　　بے نیازی کا ارمغاں لے کر

نثرِ اردو کا تاجدار آیا　　　حبذا مژدۂ بہار آیا
عصرِ حاضر کا بے بدل نقاد　　　عرصۂ فن کا شہسوار آیا
خامۂ صدق ترجماں لے کر　　　رن میں مردِ ستیزہ کار آیا
دیدہ ور فلسفی ادیب شہیر　　　یعنی یکتائے روزگار آیا
داعیٔ جانسپاری و ایثار　　　حق سرشت آیا حق [illegible]ر آیا
جودتِ طبع کا علمبردار　　　زہرہ و مشتری شکار آیا
دوستوں کی روش سے آزردہ　　　سینہ چاک آیا دلفگار آیا

بے نیازی کا شاہکار۔ نیازؔ — محرمِ رازِ لذتِ تگ و تاز
واقفِ تدبیرِ منزلِ جاناں — رہنِ اندیشہ ہائے دور دراز
خوش نظر۔ خوش مزاج خوش اندیش — زمزمہ سنج زمزمہ پرداز
نطق جس کا فسانۂ منظوم — خامشی جس کی غیب کی آواز
جس کی تحسین بخش دیتی ہے — پر شکستہ کو جراتِ پرواز
ابتداء جس کی انتہا آثار — منتہا جس کا نقطۂ آغاز
حوصلہ بے نیازِ سود و زیاں — عزم بیگانۂ نشیب و فراز

جس کو کہتے ہیں سب امامِ ادب — جس کے جویا تھے تشنہ کامِ ادب
منتظر جس کی رہبری کے تھے — رہ نوردانِ سست گامِ ادب
جس کی فکرِ جمیل پر موقوف — گرمیٔ محفلِ دوامِ ادب
منفرد جس کا حسنِ استنباط — مستند جس کا ہے مقامِ ادب
قاطعِ ہر عناد ہے۔ جس کی — بُرِشِ تیغِ بے نیامِ ادب
جس کی قدرت میں ہے ادب کا فروغ — جس کے قبضے میں ہے زمامِ ادب
شہریارِ سخن! سخن پر بھی — اک نگاہِ کرم بنامِ ادب

اس خرابے کو پر ضیا کر دے — حسنِ فکر و نظر عطا کر دے
ذوقِ شعرِ شکست خوردہ کو — حاملِ رازِ ارتقا کر دے
غلط اندیش رہ نوردوں کو — مائلِ جادۂ بقا کر دے
چھا رہا ہے فضا پہ اضمحلال — سُست گاموں کو برق پا کر دے
توڑ کر انقیاد کی زنجیر — ہم پہ رحمت کا باب وا کر دے
عزتِ نفس کا سبق دے کر — ناخنوں کو گرہ کشا کر دے
تو کہ ہر رنگ میں ہے فردِ فرید — اس ودیعت کا حق ادا کر دے

گنجِ دل افروز

دانش فرازی

(بہ حضور علامہ نیاز)

وہی ہے سلسلۂ روز و شب وہی آثار — وہی جہاں ہے وہی قید و بندِ لیل و نہار
اٹھائے دستِ جنوں نے ہزار ہا پردے — مگر ہنوز ہے چالاک حسنِ شعبدہ کار
میں جلوہ ہائے لطافت پہ جان دیتا ہوں — بنائے جوہرِ آئینہ ہے مگر زنگار
کھلی ہے آنکھ کشاکش کے درمیاں میری — نکھر رہا ہے مقامات کو دلِ بیدار
نظر پہ اب بھی وہی احتسابِ دیرینہ — زبانِ شوق کی جرأت پہ اذنِ تختۂ دار
ہوا ہے جب بھی چمن میں خیالِ بخیہ گری — مژہ سے کام لیا ہے بجائے ناوکِ خار
نہیں وہ عقل جسے کہیئے مصلحت اندیش — کہے جو سنگ کو الماس، آگ کو گلزار
تراش لیتے ہیں فن کار سنگ سے بھی کنول — مگر کہاں سے وہ لائینگے روشنی کی پھوار
فشارِ سنگ سے پھوٹی بھی اک کرن کوئی — تو ہو سکے گی کس طرح مطلعِ انوار؟
بقدرِ ظرف ہے ہر چیز کی نمود یہاں — کہ ذرہ اپنی جگہ، اپنی حد میں ہے کہسار
ابھارنے سے نہ ابھرے گی بوند شبنم کی — نہ چھپ سکے گا، چھپانے سے گوہرِ شہوار

ہزار خوگرِ خلوت سہی وجودِ نیاز — مگر ہے انجمن آرائے گرمیٔ گفتار
وہی تو اب بھی ہیں دیر ینہ بادہ کش اس کے — جنھیں شراب سے انکار جام سے انکار
انہیں کے لب پہ ہے با وصفِ ضبط ذکر اس کا — کہ جن کے زہد کی توہین ہے حدیثِ نگار
وہی ہیں معترفِ جوشِ قوتِ تخلیق — کہ جن کے حق میں ہے ہر لفظ ایک نا وکِ خار
وہی ہیں کشتۂ اسلوب دلنشیں اب تک — کہ زنگ خوردہ ہے جن کے شعور کی تلوار
غمِ نیاز سے منہ اپنا پھیرنے والے — ابھی ہیں دل سے تصدق بہ غمزۂ اقرار
اسی کا عکس ہے خوابوں کے آبگینے میں — اسی کو ڈھونڈ رہی ہے چمن چمن میں بہار
کلیمِ نغز بیاں ہے وہ طورِ معنی کا — حریفِ محفلِ انجم ہے نطقِ گوہر بار
فرشتہ اس کو کہوں بات کچھ نہیں بنتی — کہاں فرشتہ، کہاں آدمی کا رنگِ وقار
ادب ہے اس کی نگارش سے گنجِ دل افروز — سخن ہے اس کی توجہ سے تیغِ جوہر دار
عروجِ طبع فلک ناز اس کا مشربِ ناب — فروغِ دیدہ و دل ہے تجلیٔ افکار
ابھی بہت ہیں سرا پردۂ رموز سے دور — مگر وہ نصف صدی سے ہے محرمِ اسرار

مری بساط ہی کیا ہے کہ اس کی مدح کروں
میں ایک قطرۂ باراں، وہ قلزمِ ذخار

نیاز — سازِ صد آہنگ

نضا ابن فیضی

تیرے نفس کی تازہ روشی نے چمن چمن
موزوں ہے تیرے قد پہ بہاروں کا پیرہن
فن کی حسین قدروں نے پایا نیا نکھار
طبعِ گل و مذاقِ صبا کو بدل دیا
جس موڑ پر رکی تری چشمِ شگفتہ کار
تو نے غزل کدوں کی فضا کو بدل دیا

پہلے کہاں تھا اتنا گل و لالہ کو شعور
اف رے یہ فکر و فن کا مہکتا ہوا سرور
تجھ سے ہے مشکبار نفس روزگار کا
آٹھا ہے انجمن سے تری فتنۂ بہار
دامن ہے تیرے ہاتھ میں ابرِ بہار کا
آہو تمام تیرے ختن کے ہیں نافہ دار

کتنی حسیں ہے تیری طبیعت کی روشنی
دینے لگی ہے لو مہ و انجم کی چاندنی
آوارہ تیری موجِ گہر ہے صدف صدف
ہر گوشۂ خیال کو گلزار کر دیا
ہے قطرہ قطرہ جام بدست و سبو بکف
سینے میں گل کے تو نے زرِ ناب بھر دیا

لہجے میں تو نے جذب کیا ہے لبوں کا شہد
تیرے قلم نے چوس لیا ہے لبوں کا شہد
کیف و نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
تو نے چھپا لیا ہے نظر میں بہار کو
تحریر کی یہ تازہ روشی یہ شگفتہ پن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

یہ پرتوِ بہار و فروغِ مہِ تمام
تجھ سے ملا لطافتِ جذبات کو دوام
لرزاں ہے شخصیت پہ تری سر سے تا قدم
حریتِ ضمیر و نظر کے چراغ کو
صہبائے تازہ بخشی جنوں کے ایاغ کو
تیرے خمِ سحر سے ترا وش ہے نور کی
ڈھالے ہیں تو نے شوخیِ ادراک کے صنم
اک موجِ رنگِ فلسفیانہ شعور کی
تو نے یہاں فتیلہ و روغن عطا کیا
یہ تیرے ذہن کا چم و خم یہ شگفتہ سوچ

ہاتھوں کو دیکھے اہلِ نظر کے جنوں کا لوچ پیراہنِ شعور کو دامن عطا کیا
تیرے سدا بہار قلم کی لطافتیں ذہنوں میں رنگ بن کے معانی بکھر گئے
تجھ سے ہیں نبضِ عصرِ رواں میں حرارتیں تری نظر کا حسن، تری شوخیِ خیال
بن کر رُخِ نگار پہ ہے غازۂ جمال چھو کر تری نگاہ کو جلوے سنور گئے

کھولا ہے تو نے اک نگہِ نکتہ سنج سے عقل و حیات کی گرہِ ناکشودہ کو
چھوٹا نہ کوئی تیرے جنوں کے شکنجے سے چھیڑا ہے سازِ شوق کو آواز نے تری
باوصفِ سعی، نرگسِ غمّاز نے تری ہاتھوں سے کب دیا دلِ آساں ربودہ کو

افکار ہیں ترے کہ "صنم پارۂ خیال" اُسلوب کی یہ سیم تنی و سمن بری!
رنگینیِ بیاں ہے کہ رخسار پر گلال الفاظ ہیں کہ پھول پہ شبنم رکی ہوئی
جذبے کا ہے یہ تاز کماں یا تنی ہوئی رعنائیِ سخن ہے کہ شیشے میں ہے پری
اٹھی ہے موج جب تری طبعِ شگفتہ کی جنتِ غزل کا بندِ قبا کھولتی گئی
محفل میں بات آ گئی رازِ نہفتہ کی سینے میں بانسری کے تو لے بن کے ڈھل گیا
مینائے کائنات میں مے بن کے ڈھل گیا تری نظر، سبو میں کرن گھولتی گئی

تیرے مزاج کی یہ ادا بادہ شعریت پرکھے ہوئے کرشمے، ادائیں نپی تلی
یہ بولتی ہوئی ترے فن کی اشاریت کتنا لطیف ہے ترا افسانوی شعور
وہ جانتا ہے فن کی ادا، فکر کا سرور جس پر پڑی ہیں تیری نگاہیں نپی تلی!

یہ تیرے طرزِ فکر کی آفاقیت یہ حسن آزاد ہے تو لالۂ کہسار کی طرح!
یہ تازگی یہ کیف یہ موسیقیت یہ حسن ملتے ہیں تمکنت کے کہیں شوخیوں کی دھوپ
تیرے خیال و فکر کا یہ نرم نرم روپ رنگیں ہے سایۂ لبِ رخسار کی طرح

کس کو ملا یہ نثر نگاری کا بانکپن اک طرزِ خاص سے ہے گل افشاں ترا قلم
ہے خرمنِ نجوم ترا خرمنِ سخن وہ ابتدا ہو کفر و شریعت کے باب کی
یا سرگزشت ہو کسی مفتونِ شباب کی برسا ہے بن کے ابرِ بہاراں ترا قلم

کتنا بلند ہے تری تنقید کا عیار
ہے سرمۂ بصیرتِ منزل ترا غبار
فکر و نظر کے میکدۂ بے خروش میں

تو نے پرکھ لیا ادب و فن کی روح کو
گرمیٔ طبع سے تری، محفل ہے جوش میں
تازہ کیا ہے غلغلۂ ”الصبوح“ کو

تھا کون جدت واقفِ اسرار ارتقاء
ہے تیزیٔ نفس تری رفتارِ ارتقاء
شبنم کی بوند تجھ سے بنی لعلِ احمریں

تو نے بدل دیا ہے نئی نسل کا مزاج!
پیکر ہیں تیرے فن کے گُل اندام و نازنیں
تو نے چمن میں موسمِ گُل کو دیا رواج

”بہ چشمِ آگہی کی حکیمانہ شوخیاں“
تیرے نقوشِ پا ہیں حقائق کے کارواں
ہنستے ہیں پھول تیری بہاروں کے درمیاں

لفظوں کو پیکرِ ”من و یزداں“ بنا دیا
آسودہ تیرے سائے میں انسانیت کی جان
ننھی کلی کو تو نے گلستاں بنا دیا

ہے ختم تجھ پہ طرزِ نگارش کی یہ روش
کس کو ملی شعور کی یہ داخلی تپش
جب تک تپا نہ تیری بصیرت کی آنچ میں

تیرے قلم کا کوئی تتبع نہ کر سکا
ہیرے کا لطف پیدا کیا تو نے کانچ میں
سورج نہ کوئی اپنے افق سے ابھر سکا

زخمے سے انگلیوں کے ذرا چھیڑ سازِ حسن
تیرا جنوں ہے اب بھی کرشمہ طرازِ حسن
زہراب ارتقاء ہو کہ صہبائے سرمدی

سو جائیں زمزمے نہ شباب و جمال کے
اتری نہ چڑھ کے پھر ترے افکار کی ندی
تو پی گیا ہے ہوش کے ساغر میں ڈھال کے

تجھ کو یہ کس ختن کی کشش کھینچنے لگی
گُل کو کہاں چمن کی کشش کھینچنے لگی
تجھ سے شفق طراز ہوئی ہے اودھ کی شام

تیری تلاش میں ہیں غزالانِ لکھنؤ
بھوپال کی فضاؤں میں چھلکاتے تو نے جام
تجھ کو بھلا سکیں گے نہ یارانِ لکھنؤ

پرتو نہ ہو کہیں تری فکرِ بلند کا
مرکز ہے تو مری نگہِ خود پسند کا!
طے کی ہے میں نے راہ اجالوں کی چھاؤں میں

وہ آفتابِ تازہ جو میری نظر میں ہے
میں اجنبی نہیں ادب و فن کے گاؤں میں
تو ایک شمع بن کے مری رہگذر میں ہے

نیاز کو بوجہل و بولہب کہنے والوں سے

حسین گوہر

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے — تو پھر یہ دشمنیِ عقل و ہوش کیا معنی
یہ شورِ کافر و زندیق و ملحد ولے دین — برائے گوشِ نصیحت نیوش کیا معنی
سوالِ "وحی" پہ آخر یہ برہمی کیسی — مثالِ "نحل" پہ جوش و خروش کیا معنی

اگر "سکوتِ روایات" ہے "جوابِ خرد"
تو پھر یہ شورشِ محشر بدوش کیا معنی

"حدیثِ دین" کو عقل و خرد سے کیا نسبت" — یہ ادعا بزبانِ خموش کیا معنی
"بغیر نطق جو ممکن ہے گفتگو و پیام" — تو پھر وساطتِ پیکِ سروش کیا معنی
جوابِ میکدۂ غور و فکر باز نہیں — تو دعوتِ ہوس نائے و نوش کیا معنی
کلام و فلسفہ مانا خرد کے دھوکے ہیں — مگر یہ "علمِ حقیقت فروش" کیا معنی

فریبِ فہم ہیں آکر فریبِ فہم نہ دے
یقین کے نام سے ہم کو پیامِ وہم نہ دے

"نگاہ و فکر" کو ایمان طلب نہیں کہتے — تلاشِ حق کو "غمِ بے سبب" نہیں کہتے
"تجلیاتِ جنوں" "پردہ" "دلیل" نہیں — جمالِ حق کو حجابِ ادب نہیں کہتے
"یقینِ غیب" پہ تسکین کا مدار سہی — ہر ایک شکل تو ہم کو رب نہیں کہتے

محمدؐ عربی کو جو مانتا ہو نبی،
عزیز دوست! اسے بولہب نہیں کہتے

فضائے چرخ کو تو بندشِ نظر نہ سمجھ — اسے نہایتِ پرواز بال و پر نہ سمجھ
طلوعِ صبحِ قیامت ہے انتہا اس کی — فسانۂ غمِ تحقیق مختصر نہ سمجھ
جمالِ قدس پہ جس کی نگاہ رہتی ہو — اسے جہانِ تماشا میں بے بصر نہ سمجھ
رسول کو جو امامِ زمن سمجھتا ہو — اسے مقامِ رسالت سے بے خبر نہ سمجھ

نیازؔ عظمت و شانِ پیمبری داند
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

ضمیر کی آواز

(دشمنان نیاز سے)

محبؔ عارفی

ہر چند کہ نعمت ہے طبیعت کی بلندی
میں اپنی طبیعت کی بلندی سے ہوں بیزار

دنیا کو نہیں ایسی طبیعت کی ضرورت
جو آگ کے شعلوں کو سمجھتی نہیں گلزار

کیونکر خس و خاشاک کو میں پھول سمجھ لوں؟
ہے کیا خس و خاشاک کے دامن میں بجز خار؟

کرتا تھا کبھی میں بھی حقیقت سے کنارا
دنیا میرے قدموں پہ بھی رہتی تھی نگوں سار

آخر نہ ہوئی مجھکو گوارا یہ دو رنگی
فطرت ہی میری مجھ سے ہوئی برسر پیکار

ہونے لگے "آزادیٔ گفتار" کے چرچے
تحریر میں پائے گئے "الحاد" کے آثار

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
یعنی کہ ہوں آزادیٔ فطرت کا گنہگار

جو دیکھ رہا ہوں اسے لاتا ہوں زباں پر
اس بات پہ بگڑے ہیں قدامت کے طرفدار

اے مفتیٔ دیں! کیا اسے پرکھا بھی ہے تونے؟
جس شخص کو سمجھا ہے غلط بیں و سیہ کار

اس ذہن کے پردے میں نہاں اور بھی کچھ ہے
جو ذہن نہیں "وہم" کی لعنت میں گرفتار

آنا ہے ابھی مجھ کو تو میدانِ عمل میں
ہوتی ہے ابھی مجھ سے تو تزئینِ "سردار"

عقیدت کے چند پھول

(علامہ نیاز کے حضور میں)

برہم ناتھ دت

حسنِ مستور کی آغوش کو وا تو نے کیا — نالۂ عشق و تمنا کو رسا تو نے کیا
نثر کو مرتبۂ نظم عطا تو نے کیا — فنِ تنقید کو جبریل نما تو نے کیا

اک نیا طرز کیا تیرے قلم نے آغاز — تیری محفل میں ہم آہنگ ہوئے ناز و نیاز
تیرے اندازِ تکلم میں جمال و اعجاز — فکرِ عالی ہے تری طائرِ سدرہ پرواز

تیرے اندازِ نگارش میں بلا کی جرأت — تیرے اسلوبِ بلاغت میں غضب کی شوکت
تیری ہر بات کی بنیاد دلیل و حجت — جوشِ کردار سے ہم پایہ نکاتِ حکمت

تیری تحریر شہیر اور تصانیف لطیف — تیرے اخلاق جمیل اور خیالات نظیف
منتجاوز ہے مری فکر سے تیری توصیف — مرحبا فکرِ سلیم اور خوشا طبع شریف

یہ لوانجیِ معنی یہ ادائے مفہوم — جلوہ آرائیِ مستور و شہودِ مکتوم
یہ نوادر کا وفور اور حقائق کا ہجوم — تیرا سینہ ہے کہ معمورۂ دنیائے علوم

شیخ نے زاویۂ نفع و ضرر سے دیکھا — برہمن نے کہن انداز و اثر سے دیکھا
سب نے دنیا کو فقط دیدۂ تر سے دیکھا — تو نے انسان کو انساں کی نظر سے دیکھا

من چہ در پائے تو ریزم کہ خورِ رائے تو بود
سر نہ چیزیست کہ شائستۂ پائے تو بود

کارِ پیغمبری

عابد حشری

زندگی کل جو اک منتشر خواب تھی
ایک تصویرِ بے رنگ و بے آب تھی
زندگی کل جو مبہم سی آواز تھی
ایک الجھا تصوّر تھی اک راز تھی

آج زندہ حقیقت ہے وہ زندگی
مستقل رنگ، نکہت ہے وہ زندگی
آج وہ زندگی حُسنِ آہنگ ہے
ایک واضح تصوّر ہے صد رنگ ہے

زندگی کو یہ انداز کس نے دیے
کس نے بخشی شبِ تار کو صبحِ نور
کس کے فیضِ نظر سے ملا زیست کو
ایک عرفان اک آگہی اک شعور

علم و حکمت کی دیوی ترا شکریہ
فکر و فن کے خداوند تم پر سلام
کر دیا سہل یوں کارِ پیغمبری
زندگی بن گئی اک عمل اک پیام

فکر و فن علم و حکمت کا آئے گا نام
اپنے اوراقِ تاریخ الٹے گی جب
تجھ سے کیا ہو گی وہ زندگی بے "نیاز"
تیرے احساں ہوں جس پر "نگارِ" ادب

زندہ ادب اور ادیب

شاعر لکھنوی

حُسنِ فن، جُراُت و بے باکیٔ افکار کے ساتھ ایک تخلیق کے جذبے کا سبب بنتا ہے
وہ سیاست ہو کہ مذہب ہو، صحافت کہ ادب خوفِ اظہار کہیں جنبش لب بنتا ہے
ہو، جب تک کوئی عنوانِ سرِ لوح و قلم نقشِ فنکار کے معیار کا کب بنتا ہے
مدّتوں وقت کی بھٹی میں پگھلتا ہے شعور تب کہیں جا کے کوئی اہلِ ادب بنتا ہے

صلح کر لے جو کسی مصلحتِ وقت کے ساتھ فن سے اس کا کوئی رشتہ کوئی ناتا ہی نہیں
ہو جو شخصیت و ماحول کے ڈر سے مرعوب اس نے فنکار کا منصب کبھی سمجھا ہی نہیں
وہ زباں جس کی اندھیرے کو اندھیرا نہ کہے اس کے سینے میں یہ سمجھو کہ اجالا ہی نہیں
جس کی فطرت میں نہ ہو سیرت و کردار و عمل میں اسے فن کی کسوٹی پہ پرکھتا ہی نہیں

وہ ہے شاعر وہ ہے مصلح وہ ہے فنکار و ادیب دل کے طوفاں کو جو لفظوں میں سمو دیتا ہے
ذوقِ پاکیزہ و تقدیسِ زباں کی خاطر کبھی تنقید کے نشتر بھی چبھو دیتا ہے
لو حقیقت کی بھڑک اٹھتی ہے افسانے سے وہ اگر تلخیٔ حالات پہ رو دیتا ہے
بڑھ کے مذہب سے مٹاتا ہے فروعات کے نقش کشتیٔ وہم کو ساحل پہ ڈبو دیتا ہے

ذات میں جس کی ہیں سمٹے ہوئے اوصاف یہ سب اس نے اس راہ کے دیکھے ہیں نشیب و فراز
جس کی خدمت سے ہیں معمور زباں اور بیاں جس نے تنقید کے لہجے کو بنایا ممتاز
بخش کر گونگے خیالوں کو حقیقت کی زباں جس نے اس بزم میں چھیڑا نئے انداز کا ساز
جب بھی سوچیں گے کہ کیا چیز ہے اک زندہ ادب جگمگا کر افقِ ذہن سے ابھرے گا نیاز

علّامہ نیاز فتحپوری سے

ساقی جاوید۔ ایم۔ اے۔بی۔ایڈ

مذہب :- میں چاندی کی گھومتی مچھلی تو ارجُن کا تیر
تیری زد سے کیسے بچوں لے بوڑھے ماہی گیر

تنقید :- تو سونے کی کھری کسوٹی ہیرے کی میزان
پیتل کا بیوپاری چیخے بیٹھ گئی دوکان

رومان :- رنگوں کے اصنام تراشے خوشبو کے اہرام
بوڑھے آذر کون چکائے تیرے قلم کے دام

علم :- اُجلا اُجلا ایک سمندر کس نے دیکھی تھاہ
لہر اٹھی کس گہرائی سے کوئی نہیں آگاہ

شخصیت :- کس نے سمجھا کون کہے تو پھول ہے یا تلوار
شیشے کے احساس کے اندر لوہے کا کردار

مزاج:- آب و ہوا سے کیسے بدلے فطرت کا قانون
گنگا جل سے دھویا پھر بھی گرم رہا یہ خون

لطافتِ طبع:- نافۂ جاں خوشبو کا خزانہ جنت صحنِ خیال
روحِ چمن، اے عہدِ بہاراں اب بھی نہیں پامال

اردو:- دل کا رشتہ دل ہی جانے کون کسے سمجھائے
مجھ پر دنیا تیر چلائے اور تجھے لگ جائے

وطن:- ماتھا میرا کالا کالا مٹی میری لال
میرے غم میں عمر بتا دی تونے میرے لال

نگار:- میں اک راہی تو اک رہبر قسمت تیرے ہاتھ
میرے بوڑھے ساتھی میرا چھوڑ نہ دینا ساتھ

عمر:- دیکھ رہی ہوں تیرے سر پر ماہ و سال کا بار
بیتے دن میں کیسے لاؤں، بول مرے دلدار

جوش:- میں بھی ہوں اب عمر رسیدہ تو بھی کہنہ سال
جو کچھ گزرا خواب ہوا اب اس پر مٹی ڈال

لکھنؤ:- راہی اپنا بوجھ اٹھائے پہنچا کوسوں دور
لوگو اب کیا دیکھ رہے ہو شمع ہوئی کافور

کراچی:- تانبے کے اس شہر میں کیسا سونے کا بیوپار
کون خریدے کندن، بابا، کوئی نہیں تیار

ساقی جاوید:- ایک توجہ تیری پارس ایک نظر اکسیر
دل پر دل کی چوٹ پڑی اور چیخ اٹھی تحریر

علامہ نیاز مدظلہٗ

مضطر گجراتی ۔ بی۔ اے۔

اے کہ ہے تیرا مذاقِ علم فطرت آشنا   آشنا حکمت سے تو ہے، تجھ سے حکمت آشنا
تیرا اسلوبِ نگارش جانِ انشائے لطیف   تیرے فن پاروں سے فنکارانِ ملّت آشنا
تیری تنقیدوں سے اردو نظم نے پایا فروغ   تیرے افسانوں سے اردو نثر ندرت آشنا
ہر فسانہ کیف انگیز و تنوّع آفریں   ہر مقالہ معجزہ آثار و جدّت آشنا
وارداتِ عشق کے اظہار پر قدرت تجھے   نفسیاتِ حسن سے تیری طبیعت آشنا
تیری توجیہوں کے ہیں ممنون اربابِ سخن   تیری تشریحوں سے صنفِ شعر عظمت آشنا
اک طرف تیرا نگارستان فردوسِ نظر   اک طرف تیرا جمالستان، جنّت آشنا
اک طرف تیری رقم کردہ شہابی سرگزشت   جس کا ایک اک لفظ تابندہ و رفعت آشنا
تیرے مکتوباتِ رنگینی میں آپ اپنی نظیر   اس پر اندازِ بیاں تیرا سلاست آشنا
تیری فکری کاوشیں تاریخ و مذہب پر محیط   تیری ذہنی قوتیں اخلاق و سیرت آشنا
راہِ حق پر گامزن ہے باوجودِ اختلاف   کس قدر تیرا قلم ہے استقامت آشنا
کتنی نظروں کو کیا ہے تو نے آگاہِ جمال   کتنے سینوں کو کیا ہے تو نے حدّت آشنا
تیری تحقیقات کا ذکر انجمن در انجمن   کوئی معنی آشنا ہے کوئی صورت آشنا

مختصر ہے یہ کہ اے علامۂ علم و ادب
فخرِ قوم و ملک ہے تجھ سا حقیقت آشنا

(نیاز فتحپوری)

ایک فرد، ایک تحریک، اک انجمن

سرشار صدیقی

جہل کی تیرگی جس سے کافور ہے
ہر طرف جس کے افکار کا نور ہے
ذہن جس کی تجلّی سے معمور ہے

منفرد جس کا ہر ایک انداز ہے
جس کا اسلوب دنیا سے ممتاز ہے
جس کی تحریر سے فن سرافراز ہے

جس کی تنقیدِ بے رحم و آتش فشاں
ذہنِ خلّاق کے واسطے گلستاں
اور خاشاکِ تحریر، شعلہ بجاں

جس کی تحقیق کی حدّتِ بے اماں
پھونک دیتی ہے تقدیسِ وہم وگماں
جس کی نوکِ قلم زندگی کی زباں

جس سے کہنہ عقیدوں کے جوہر کھلے
فکر کے واسطے ذہن کے در کھلے
وہم پھرتے ہیں بازار میں سر کھلے

ایک گل ـ منظرِ رنگ و بوئے چمن
ایک شخص، ایک تاریخ تہذیب وفن
ایک فرد، ایک تحریک، اک انجمن

(مولانا حامد حسن قادری)

جناب مکرم فرمان صاحب السلام علیکم

یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہے کہ نگار کا سالنامہ اب کے نیاز نمبر ہوگا۔ بلاشبہ یہ تجویز نہایت مستحسن ہے نیاز صاحب ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے شعر و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ اور آپ لپٹ کر کتابوں کو اپنے ساتھ لپیٹ لیا ہے۔ وہ نہ صرف ادب نواز ہیں، بلکہ ادیب ساز بھی ہیں۔

نگار کے ذریعے سے انھوں نے چالیس سال تک اردو کی جیسی خدمت کی ہے، اس کا ایک ممتاز مقام ہے۔ شعر و ادب، تحقیق و تنقید کے مختلف شعبوں پر نیاز صاحب کی تصانیف نہایت قیمتی اضافہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نیاز صاحب کو تا دیر سلامت رکھے اور نیاز نمبر کو قبول عام عطا فرمائے۔

اثر لکھنوی

اس خبر سے بے حد مسرت ہوئی کہ نگار کا نیاز نمبر نکل رہا ہے۔

نیاز صاحب اردو کے بہترین نقاد اور ادیب ہیں اور جریدہ نگاری میں تو ان کا جواب نہیں۔ اسی کے ساتھ ان کا مبلغ علم نہایت وسیع و عمیق اور مطالعہ گہرا بلکہ ہمہ گیر ہے اختلاف رائے کی اور بات ہے مگر یہ امر واقع ہے کہ آج کوئی ادیب ان کا مد مقابل تو کیا ہم پلہ بھی نہیں۔ مجھے ہمیشہ ناز رہے گا کہ انہوں نے (غالباً ۱۹۴۰ء میں) میرے کلام کا انتخاب گلہائے جعفری کے نام سے شائع کیا اور مجھے ایسے الفاظ میں نوازا کہ تا زندہ ایم بندہ ایم (معرکے بھی ہوتے رہے مگر ان میں ذاتیات کو کبھی دخل نہیں ہوا بلکہ گویا ہم زبان حال سے کہتے رہے کہ آؤ اختلاف پر اتفاق کریں) اس طرح ہم دونوں گویا میر کا یہ شعر ایک دوسرے کو سناتے رہے ؎

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں

میں اپنی اس مختصر تحریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں! زندہ باد نیاز فتحپوری، پائندہ باد نیاز فتحپوری

مولانا ضیاء احمد بدایونی

کرم فرمائے من۔ ہدیہ سلام مسنون

کرم نامہ موصول ہوا تھا۔ شرمندہ ہوں کہ جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ نیاز صاحب کی ادبی خدمات ہند و پاک میں مسلّم ہیں۔ میں ضرور کسی نہ کسی پہلو پر لکھتا۔ لیکن افسوس کہ کچھ عرصے سے میری صحت گر گئی ہے جس کی وجہ سے لکھنا پڑھنا بہت کم کر دیا ہے۔ امید ہے کہ معذرت قبول فرمائی جائے۔ زیادہ کیا نگارش کی جائے۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی

ایک نیاز مند کی فرمائش مدیر صدق سے کہ وہ مناقب نگار و نیاز پر کچھ لکھے ——— ستم ظریفی کا شاہکار

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب!

فرمان کی تعمیل میں بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ نیاز صاحب سخن سنج، اچھے ہیں۔ شعر کی پرکھ خوب رکھتے ہیں اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ والسلام۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

محترمی و مکرمی السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ میری صحت آج کل اتنی خراب ہے کہ اپنے بہت ضروری کام بھی انجام دینے سے قاصر ہو رہا ہوں۔ اس لئے تعمیل ارشاد سے معذور ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔

مولانا غلام رسول مہر

مکرمی: یاد فرمائی کے لئے شکریہ قبول کیجئے

میرے دل میں نیاز صاحب کے لئے اس وقت سے گہری عقیدت ہے، جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور وہ مختصر سی مدت کے لئے "زمیندار" کے ایڈیٹر بن کر آئے تھے۔ میں ان کی زیارت کے لئے دفتر "زمیندار" میں گیا تھا۔ پھر مجھے اس زمانے کی یہ چیز بھی یاد ہے کہ ان کی نظمیں وقتاً فوقتاً "الہلال" میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پر لکھنے کے لئے جس قسم کی معلومات ضروری ہیں وہ اب تک حاصل نہ کر سکا اس لئے مجھے معذور سمجھئے۔

علامہ جمیل مظہری

عزیز مکرم۔ دعا و سلام کے بعد

یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ حضرت نیاز فتحپوری کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت ادا کرنے کی غرض سے رسالہ "نگار" اپنا خاص نمبر نکال رہا ہے۔ فرض شناسی کا یہ احساس (دیر ہی سے سہی) پھر بھی میری دعا ہے، کہ "دیر آید درست آید" کا مصداق ہے۔

نیاز فتحپوری کے متعلق میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ ع آخر نہ گیاہ باغ اویم، اور مجھی پر کیا منحصر ہے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کے عرصے میں اسلامی ہندوستان کا ہر وہ جوان یا نوجوان جسے ادب کا کچھ ذوق رہا ہو اس کی ذہنیت کی تعمیر میں نیاز کے قلم نے معمار کا کام کیا ہے۔ غالب نے اس برصغیر میں جس نئے ذہن کی داغ بیل ڈالی تھی، سرسید نے جس کی تعمیر کے سلسلے میں نیو کھودی اور شبلی نے جس پر چند دیواریں اٹھائیں اس کو اقبال اور ابوالکلام، نیاز اور جوش نے ایک چوتھائی صدی کے اندر ایک قصر رفیع بنا دیا۔ اب آپ جیسے ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ ہمارے ان ذہنی معماروں کی تعمیری خدمات کا اعتراف ایک مکمل تصنیف کی صورت میں پیش کر کے وقت کی اس امانت کو تاریخ کے سپرد کر دیں۔

نیاز فتحپوری کی علمی اور ادبی زندگی میرے خیال میں سید انشا کی زندگی کی طرح ایک ٹریجڈی رہی ہے جس طرح اُن کی علمیت کو اُن کی شاعری نے اور اُن کی شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے گومتی میں ڈبو دیا، اسی طرح ہماری مولانا نیاز کی شاعری کو ان کی انشا پردازی نے، ان کی انشا پردازی کو اُن کی افسانہ نگاری نے، ان کی افسانہ نگاری کو اُن کی تنقید نگاری نے اور ان کی تنقید نگاری کو نگار کی ایڈیٹری نے عہد بہ عہد صدمہ پہونچایا۔ شاید اس کی نفسیاتی وجہ یہ تھی کہ نیاز کو قدرت نے ایک رفارمر کا ذہن دیکر ایک قوم کے بگڑے ہوئے مزاج کی اصلاح کے لئے پیدا کیا تھا۔ اُن کا ذوق بیتاب دوسرے کوچوں میں خواہ مخواہ بھٹکا پھرا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے اپنی منزل پہچانی اور کچھ دیر یہاں قیام کر کے پھر پچھلے پاؤں لوٹا اور لوٹ رہا ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی

مکرمی فرمان صاحب، السلام علیکم

پیا پے آپ کے متعدد خطوط ملے اور میں جواب دے سکا۔ تقریباً ایک سال سے میں عرق النسا Sciatica کے درد میں مبتلا ہوں۔ کئی مہینے صاحب فراش رہا۔ پھر تکلیف میں کچھ کمی ہوئی اور میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگا۔ کئی مہینے سے پھر درد زیادہ ہے نقل و حرکت میں دشواری ہے ادھر ارشد کی موت نے اور بھی کلیجہ پاش پاش کر دیا۔ ارشد کا اصرار تھا کہ میں نگار کے خاص نمبر کے لئے ضرور کچھ لکھوں میں نے کہا تھا کہ ذرا طبیعت سنبھلے تو کچھ لکھوں، ابھی ہم طبیعت کے سنبھلنے ہی کے منتظر تھے کہ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے[1]۔ فرمان صاحب میرے لئے ارشد کی جواں مرگی ایک عظیم سانحہ، ایک قیامت ہے۔

---

[1] یہ خط پروفیسر ارشد کاکوی مرحوم کے نام ہے (فرمان)

شاگرد تو میرے بے شمار ہیں مگر ارشد کی طرح مخلص پرستار شاید کوئی ہو۔ والسلام۔

مولانا امتیاز علی عرشی

بے حد مسرت ہوئی اس خبر سے کہ نگار پاکستان کا سالنامہ ۱۹۶۳ء اس کے بانی مولانا نیاز فتحپوری سے متعلق ہوگا۔ نیاز کا نام اردو ادب میں نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ چونکا دینے والا بھی ہے۔ اُن کے قلم نے زنگ آلود ذہنوں کو مجلیٰ اور مصفیٰ کرنے کا کام جس بے باکی سے کیا ہے وہ بجائے خود لائق ستائش ہے۔ ان کے نظریات اور عقائد دونوں سے اختلاف کی بہت سی گنجائشیں نکل سکتی ہیں لیکن بے روح اور بے بنیاد عقیدت مندی چاہے وہ دُنیائے ادبیات میں ہو یا عالمِ دینیات میں مُضر ہے۔ نیاز نے کم از کم گنبد افلاک میں غلغلہ ضرور ڈالا ہے بلاشبہ یہ اُن کا ایک کارنامہ ہے کہ انہوں نے غور و فکر پر لوگوں کو آمادہ کیا۔ انکی تحریروں کی صحت مندی کا انحصار مخاطب کی ذہنی صلاحیتوں پر زیادہ ہے۔

نیاز صاحب کی تحریروں میں رنگینی کے ساتھ ساتھ گوارا طنز کی چاشنی بھی ہوتی ہے اگرچہ یہی عناصر ایک محدود طبقے میں انکی بدنامی کا باعث بھی ہوتے ہیں لیکن انھیں کے ذریعے نیاز صاحب نے پوری ایک نسل کے ذہنوں پر حکمرانی کی ہے۔ اردو ادب کو ان جیسا بانغ و بہار اور جاندار اسلوب کاہے کو ملے گا۔

میں بستر علالت سے یہ چند سطریں اس نمبر کے لیے بھیج رہا ہوں یہ صرف آپ کی فرمائش کی تعمیل نہیں ہے بلکہ اس بزم میں شرکت کی مسرت بھی حاصل کرنا ہے جو آپ میرے محترم دوست کے لئے منعقد کررہے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ وہ اسی دم خم کے ساتھ گل افشانی گفتار کے جوہر دکھاتے رہیں اور آپ ان کے شایانِ شان نگار کا خاص نمبر شائع کرسکیں جس میں زہر ہلاہل کو قند نہ کہا جائے اور قند کو زہر ہلاہل۔

سید محمد تقی

فرمان بھائی۔ دعائیں۔ آپ کے متعدد خطوط مضمون کے مطالبہ کے سلسلہ میں موصول ہوئے اور ادھر خود قبلہ نیاز صاحب سے بھی پرسوں ملاقات ہوئی۔ میں نے نیاز نمبر کے لئے سنجیدگی کے ساتھ بارہا مضمون لکھنے کا عزم کیا لیکن کوئی نہ کوئی عذر مانع آگیا۔ اور اس لئے معذرت خواہ ہوں کہ امتثال امر نہ کرسکا۔ ماہنامہ نگار کا نیاز نمبر شائع کرنے کا آپ کا ارادہ بڑا برمحل ہے زندگی میں ادب کا روں اور قلم کے سہارے زندہ رہنے والوں کے ساتھ بے اعتنائی اور مرنے کے بعد تعزیتی جلسوں اور کارناموں کا اعتراف لازماً کوئی صحت مند روایت نہیں ہے۔ اور اس لئے میں آپ کو اس ادب نوازی اور دانشور شناسی کی مبارکباد دیتا ہوں۔ نیاز صاحب کی زندگی ایک خاص تحریک سے وابستہ رہی ہے میں کئی جگہ ان سے پوری طرح متفق نہ ہوسکا لیکن انہوں نے [illegible] ہوئے نظریوں، سڑی بسی روایتوں اور اعتقادی تنگ نظریوں کے خلاف مسلسل جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ایک موڑ ہے ادب [illegible] کی سماجی زندگی میں سماجی بتوں کو توڑنے کا کام ابھی تک اس قوم پر قرض ہے اور اس مہم میں نیاز صاحب جو کام کرتے رہے ہیں وہ ہم سب کی یادوں میں تازہ رہے گا۔ اور اُسے جاری رکھنا آپ کا کام ہے کہ نگار کی ساری عملی نگرانی آپ کے سپرد ہے۔ مجھے اُمید ہے نگار کا یہ نیاز نمبر ما بہ الامتیاز حاصل کرے گا۔ اور اس پرچہ نے جو تاریخی نمبر اب تک شائع کئے ہیں ان میں نیاز نمبر

واقعی ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگا۔

محمد طاہر فاروقی

مکرم و محترم بندہ! السلام علیکم

پہلے بھی آپ کا ایک کرم نامہ آیا تھا۔ میں جواب نہ دے سکا۔ اب یہ دوسرا نوازش نامہ آیا ہے جس پہ تاریخ ثبت نہیں "نگار و نیاز" خاص نمبر خوب سوچا یقیناً اس کی ضرورت ہے۔ نیاز صاحب ادب و شعر کے خادم بھی ہیں اور مخدوم بھی۔ میں تو اب تک آپ کے ذریعے ان کے پاکستان آنے کی مبارکباد بھی نہ پہنچا سکا۔ اور نہ سلام نیاز پیش کرنے کی توفیق ہوئی۔ شرمندہ ہوں۔

نیاز صاحب نے خوب کیا کہ یہاں آگئے۔ خدا کرے کہ ان کی وجہ سے یہاں ایک خصوصی فضا پیدا کرنے میں مدد ملے۔ ہمارے لئے ان کی ذات مغتنم ہے۔ اور واقعی ہم اپنی عقیدت کا اظہار "نگار و نیاز نمبر" سے بہتر کسی صورت میں پیش نہیں کر سکتے۔ آپ نے کم وقت میں بات اٹھائی۔ اگر جنوری ۱۹۶۴ء کے خاص نمبر کے لئے سوچتے تو شاید عمدہ ذخیرہ فراہم ہو سکتا۔ بہرحال میں دعا کروں گا کہ آپ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوں، کہ یہ بڑا کام ہے۔

عابد رضا بیدار

برادرم آداب

میں تو نیاز صاحب پر دل کھول کر لکھتا۔ مگر کیا کیجئے کچھ تو ان کے پاکستان چلے جانے کا زخم اب تک مندمل نہیں ہو پایا اور کچھ میرا موضوع زیادہ مہلت چاہتا تھا۔ نیاز صاحب کے احسان جانے کا باوجود ان کا یہ احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گا کہ انہوں نے مجھے عقلیت اور مذہبیت میں توازن رکھنا سکھا دیا۔ وہ خود تو ایک انتہا پرست ہیں مگر اپنے پڑھنے والوں کو کم سے کم مجھ میں انہوں نے Balancing کی جو تھوڑی بہت نظر دی ہے۔ وہ میری زندگی اور میری سوچنے کے انداز پر اثر انداز بھی ہے اور میری سب سے قیمتی پونجی۔ نیاز صاحب کے باقی ادبی تنقیدی پہلوؤں کی میری نظر میں اتنی اہمیت نہیں ہے۔

محمد اسحٰق صدیقی، سابق پرنسپل مسلم انٹر کالج فتحپور

مکرمی فرمان فتح پوری السلام علیکم

یہ سن کر کمال مسرت ہوئی کہ ان دنوں آپ نیاز نمبر کی ترتیب و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ فی الواقع یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ جو آپ کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ عرصہ دراز پہلے ایسی اشاعت کی ضرورت تھی جب صاحب ممدوح کے بارے میں وقتاً فوقتاً بادِ سموم کے جھونکے چل کر علمی فضا کو مسموم و مکدر بنا دیتے تھے۔ ایسے وقت میں اگر کوئی صاحب نظر آپ کی زندگی پر کما حقہ روشنی ڈالتا اور آپ کی سچی شخصیت کو منظر عام پر لاتا تو بالیقین یہ کڑوے گھونٹ ہمیں نہ پینے پڑتے۔ بہرحال دیر آید درست آید۔ مردے از پردہ غیب بیروں آید و کارے بکند۔

نیاز فتحپوری کی شخصیت محتاج بیان نہیں آپ اردو زبان و ادب کے آفتاب اور جدید ارتقائی دور کے بادشاہ ہیں حضرت نیاز کی ذات والا صفات ہر قسم کی تعریف و توصیف سے بالاتر اور بے نیاز ہے تاہم ہم نیاز مندوں کو دو حروف آپ کے بارے میں لکھ کر ایک گونہ دلی تسکین ہو جاتی ہے۔

حضرت نیاز کا تعلق ایک مردم خیز علاقے سے ہے جو بظاہر ایک چھوٹا ضلع مگر حقیقتاً مسلمانان ہند کی بڑی بڑی تحریکوں کا منبع و مرکز رہا ہے۔ حضرت نصرت حسین اسیر مالٹا اسی ضلع میں پیدا ہوئے۔ نیاز فتحپوری کا ابتدائی دور فتح پور میں گزرا۔ نیاز مند کو دو تین بار آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا گو اس سے قبل آپ کے بارے میں سالوں اور پرچوں میں پڑھتا رہا اور دوسروں سے زبانی سنتا رہا۔ ۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور ایک خاص اجتماع کے موقعہ پر آپ سے پہلی بار تعارف ہوا۔ اس زمانے میں کمترین مدرسہ ہذا کی شاخ انگریزی (مسلم ہائی اسکول) کا صدر مدرس تھا اور اسکول کو پروان چڑھانے کے لئے کوششیں جاری تھیں۔ اسی اثنا میں اسکول کے ہر دلعزیز و ہونہار جوان العمر مینجر غلام مرتضیٰ خاں ایم اے (لندن) کا اچانک انتقال ہو گیا جس سے ہر کس و ناکس کو سخت صدمہ پہنچا، اور یہ تحریک ہوئی کہ مدرسہ میں آپ کے شایان شان کوئی یادگار قائم کی جائے۔ مرحوم کی تعلیمی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے طے پایا کہ آپ کے نام سے کتب خانہ قائم کیا جائے جو عام و خاص کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اس کے لئے فتحپور کا پہلا بڑا مشاعرہ، نیاز فتح پوری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس زمانے میں مشاعرے اتنے ...... عام نہ تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پنڈت امرناتھ جھا، پروفیسر دبیر اور فراق گورکھپوری خاص طور پر شریک ہوئے۔ فتح پور و نیز مدرسہ سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر آپ نے اس تعلیمی تحریک سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے جب آپ اسکول کا سرسری جائزہ لینے کے لئے احاطے میں گشت کر رہے تھے۔ اس وقت آپ جسمانی طور پر بالکل صحت مند اور جوان معلوم ہوتے تھے۔ گٹھیلا کسرتی بدن، گھنی سیاہ خاص وضع پر تراشی مونچھیں، میانہ قد، بھرا چہرہ گداز بدن، متانت و مسکراہٹ لئے ہوئے۔ سر پر ہیٹ، ہاتھ میں چھڑی کوٹ پہنے ہر چیز کے بارے میں اظہار خیال کرتے جاتے، عمارت سکول کے احاطے کے بیچوں بیچ حافظ خانہ تھا۔ یہ ایک مرتفع چبوترے پر ایک مربع کمرے کی عمارت تھی۔ جسمیں چالیس پچاس بچے بیک وقت بیٹھ کر حافظ کرتے۔ اس کے پاس جب آپ پہونچے تو نہایت متانت کے ساتھ چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے بولے کہ اس کو گرا کر زمین برابر کر دو۔ آپ کا یہ جملہ نہایت معنی خیز تھا یہ حافظ خانہ دراصل اسکول کی عمارت کی زیبائش میں فرق ڈالتا تھا۔ مگر بھلا یہ کسے جرأت ہو سکتی تھی کہ اس کا گرانا تو کجا اس کے انہدام کا اشارہ کر سکے۔ سچائی کو ظاہر کرنے میں آپ نے مخالفت کا کبھی خیال نہیں کیا۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیاز صاحب کے قلم سے بعض باتیں ایسی نکل جاتی ہیں۔ جنہیں مذہبی لوگ پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے اس وقت کی بات اسی قسم کی ہو۔ آپ نے مذکورہ کتب خانہ کے لئے بیش بہا عطیات دئے اور اسکول کی توسیع و ترقی کے لئے خاکسار سے جامع منصوبہ تیار کرایا مگر افسوس کہ تقسیم ہند سے یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

مدت گذر گئی اور پھر سترہ سال بعد ۱۹۵۳ء میں ملیر میں ملاقات ہوئی۔ فرمان فتحپوری نے نیاز صاحب کو اپنے گھر پر مہمان کیا۔ ایک خاصی تعداد فتحپوریوں کی دعوت میں شریک ہوئی۔ اب آپ کی شان ہی اور تھی، کبھی وہ مجاہد معلوم ہوتے تھے۔ جو قومی ترقی کے لئے مذہبی روک کو ہٹانے میں بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ اب وہ ایک شفیق بزرگ معلوم ہوتے تھے

جس میں اپنے وطن کی محبت و ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جہاں آپ نے بڑوں کا تذکرہ کیا اور مزیدار لطیفے سنائے آپ نے چھوٹوں کی بھی خیریت فرداً فرداً دریافت کی۔ اس وقت آپ سب میں شیر و شکر تھے اور چھوٹے سے چھوٹا بھی آپ سے بے جھجک گفتگو کر سکتا تھا۔

دوسرا قابل ذکر سین اسی طرح کا اجتماع ۱۹۶۰ء کا ہے جب فرمان فتحپوری نے آپ کو ایک ایٹ ہوم اپنی اقامت گاہ ملیر میں دیا اور فتحپوریوں کے علاوہ شہر کے ممتاز شعراء کو بھی مدعو کیا۔ اس موقعہ پر بھی آپ نے ملیر اور ملیر کے رہنے والوں کے حالات دریافت کئے اور یہاں کے پانی، آم ہر شے پر مناسب تبادلہ خیال کیا۔ بعد طعام شعراء کا کلام شروع ہوا اور آخر میں آپ سے فرمائش ہوئی کہ کچھ سنائیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی جب بالآخر آپ نے اپنا کلام بے باض سنانا شروع کیا جو بے شک کلام لاکلام کا درجہ رکھتا تھا۔ آپ کے علمی تبحر اور نثر نگاری سب کی طرح میں پہلے سے قائل تھا لیکن اس وقت تک یہ نہ معلوم تھا کہ آپ شاعری کا ایسا اعلیٰ ذوق ملکہ و مہارت رکھتے ہیں۔ اس اجتماع پر حضرت نیاز کی بے نیازی اور مشفقانہ ہمدردی ہمیشہ دلوں میں چٹکیاں لے گی۔

نیاز فتحپوری صف اول کے اہل قلم اور محقق ہیں۔ جو کام آپ نے اردو میں کیا اگر انگریزی میں کرتے تو ساری دنیا میں مشہور ہوتے لیکن آپ نے شہرت اور ناموری کی کبھی پروا نہیں کی اور اردو زبان کی ترقی و توسیع میں برابر مصروف رہے اور تنقید و تبصرہ و نیز دیگر علمی اصناف میں اردو کے لئے منئی شاہراہیں نکالیں، نئے الفاظ اور نئی تراکیب کا قابل قدر اضافہ کر کے اپنے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یادگار بنا دیا۔

آپ کے خیالات و ارشادات مدتوں معرض بحث بنے رہے۔ حق یہ ہے کہ آپ حق کو مانتے خواہ وہ کہیں اور کسی حال میں کیوں نہ ہو اور وہ اس صداقت کا پرچار اپنا فرض اور اسے اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں وہ یونان قدیم کے مشہور موحد حکیم سقراط کی طرح ہیں۔ روایتی تقدس اور رسمی اقدار آپ کے نزدیک قابل اعتنا نہیں۔ آپ عدل و توازن کے قائل ہیں سنجیدگی و متانت کی ان کے یہاں قدر ہے وہ سادگی اور سچائی کو پسند کرتے ہیں بشرطیکہ اس میں ستھراؤ ہو گو تکلف و تزئین سے کسی حد تک معرا ہو۔ یہی نکھار انکی زبان میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے لفظی تراشش و خراش اور تراکیب محاورات کی اختراع سے کام لیا ہے لیکن یہ کام ماہرانہ اور استادانہ انداز میں انجام دیا ہے۔ آپکی صلح پسندی سلاست روی اور دانشوری کا ہر فرد و بشر لوہا مانتا ہے۔ ان کا شمار دنیا کے صف اولین کے استادوں میں ہے۔ انکی لسانی و ادبی تخلیق بے مثال اور لازوال ہے ــــ توحید و رسالت کے دلدادہ انسان نے اپنی پسند کے بہت سے بت تراش لئے ہیں۔ اور اپنی خوش فہمی سے وہ ذات خدا کے بجائے انھیں کی پرستش... کو صحیح عبادت سمجھتا ہے۔ نیاز فتحپوری نے ان تراشیدہ وہمی بتوں پر سنگباری کی ہے گو ایسا کرنے میں انقلاب کو گمراہی سمجھنے والوں نے ان پر سنگباری کرنا اپنا دین و مذہب قرار دیا ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ غلو و تملق کو ان کے یہاں جگہ نہیں۔ انکی حالت اس مرد بزرگ جیسی ہے جو انسانی ارتقاء کی مختلف منازل طے کر کے ایسے بلند مقام پر پہنچ گیا ہو جہاں عامۃ الناس کی نظر خیرہ ہو جاتی ہے۔ ایسے مرد باکمال کی حقیقت کو سمجھنا کارے دارد، غالب کی قدر بعد از مرگ ہوئی۔ حضرت نیاز کا مان دان بفضلہ انکی زندگی میں رہا۔ مگر بالکل اسی طرح جیسے شیر ببر کی طرف لوگ دور سے انگلیوں سے اشارہ کریں۔ اللہ تعالےٰ آپ کی عمر و صحت میں ترقی و برکت دے تاکہ پاکستان میں مدت دراز رہ کر زبان اردو کو معراج پر پہنچا دیں۔ آمین۔

غلام مجتبیٰ خاں ، ایڈووکیٹ

محبی ، سلام مسنون

یہ سن کر بڑی خوشی ہوا کہ آپ نگار کا نیاز نمبر شائع کر رہے ہیں ، ہمیں نیاز صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ "فتح پور" کو بھی چمکا دیا۔ ورنہ ہم نے تو اپنے ضلع کو گمنام کر دیا تھا ، وکالت کا پیشہ ایسا ہے کہ کچھ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا ورنہ نیاز نمبر میں شرکت کی سعادت ضرور حاصل کرتا۔ آپ کوشش کیجئے کہ نیاز صاحب اور فتح پور کے متعلق مستند مواد اس نمبر میں یکجا ہو جائے۔

نیاز صاحب فتحپور کے ایک مقتدر و معزز پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے والد مرحوم غلام مصطفےٰ خاں اور دادا غلام قادر خاں سے نیاز صاحب کم و بیش واقف ہونگے۔ ۱۹۰۶ء کے فتحپور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے صفحہ ۱ پر پٹھان خاندانوں میں عبدالقدوس خاں اور غلام مصطفےٰ خاں کا نام خاص طور پر ملتا ہے۔ عبدالقدوس خاں اور میرے والد یکجدی تھے۔ اس وقت شہر فتح پور کی آبادی بارہ موضعوں پر مشتمل تھی جس میں کمال پور ، قصبہ فتح پور ، قصبہ سلیمان پور اور ماہ پور ہماری زمینداری میں تھے۔ پٹھانوں کا یہ خاندان غور گشتی پٹھانوں کے بنی خیل سے تعلق رکھتا تھا اور اسی لئے ہمارا محلہ بنی کے نام سے مشہور ہوا۔ کسی زمانے میں محلہ مسوانی یوسف زئی ، امرزئی ، بنی ، زیدوں اور پیرن پٹھو وغیرہ میں زیادہ تر پٹھانوں کی آبادی تھی ، باجرین۔ سید واڑہ اور خیلدار مسلمانوں کے مخصوص محلے تھے اور رستوگی گنج میں عموماً ہندو آباد تھے مغرب پور اور موسیٰ پور کی زمین بھی فتح پور کی آبادی میں شمار ہوتی تھی۔ بلکہ جس جگہ حضرت مولانا شاہ نجم الدین صاحب کا مزار ہے پہلے وہ جگہ شاہ عبدالسلام سے موسوم تھی۔ انکی تاریخ وفات "عبدالسلام بہ دارالسلام رفت" سے نکلتی ہے۔

فتحپور کی وجہ تسمیہ کا ذکر ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں اس طور پر کیا گیا ہے۔ کہ علاؤ الدین خلجی کے سپہ سالار نے یہاں کے مقامی راجہ پر فتح پائی تھی۔ بڑے بوڑھے بیان کرتے تھے کہ اس راجہ کا محل اس علاقے میں تھا جہاں ایک بہت بڑا گنج شہیداں ہے۔ اور جو انصاری پہلوان کا مقبرہ ہونے کی وجہ سے انصار گڑھ کہلاتا تھا۔ میرے بہنوئی رشید بھائی مرحوم سوری پٹھان تھے اور علامہ نیاز کے احباب میں تھے۔

محلہ باقر گنج ، فتحپور کے چکلہ دار (جو بادشاہ کی طرف سے حاکم تھے) کا محلہ تھا۔ آخری چکلہ دار جو شاہان اودھ کی طرف سے مقرر ہوئے تھے نواب علی حسین کے آبا تھے محلہ ابونگر چابک سواروں کا محلہ تھا۔ فتحپور کے ہنڑ اور چابک مشہور تھے اور ان کا بنانے والا بھی ہمارے بچپن تک ابونگر کا ایک ہندو تھا۔ خط طول پکڑ گیا اب ختم کرتا ہوں۔ علامہ کی خدمت میں سلام ،

حاجی سید سجاد حسین شاہپوری

عزیزی و محترمی فرمان صاحب

یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ جناب نیاز فتح پوری صاحب مستقلاً پاکستان تشریف لے آئے ، انشاء اللہ یہاں کے

ادبی اور علمی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو جائے گی۔ میں گزشتہ ماہ آنکھوں کے علاج کے سلسلہ میں کراچی ایک ہفتہ رہا۔ معلوم نہ تھا ورنہ انکی زیارت کے لئے حاضر ہوتا۔ لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً نیاز حاصل ہوتا رہا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ بھی ہوتا رہیگا۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء سے علالت کا سلسلہ جاری ہے۔ دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوا جس میں سے ایک کی نظر غائب ہو چکی دوسری سے کام لے رہا ہوں اور اب وہ بھی جواب دے رہی ہے۔ خدا اپنا فضل شامل حال رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے خط کا جواب ذرا دیر سے دے رہا ہوں۔ میری حالت بوجہ علالت و اختلاج قلب بالکل بدل چکی ہے اس قابل نہیں رہا کہ "نگار پاکستان" کے لئے کچھ لکھ سکوں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نیاز صاحب کی ذات بابرکات سے پاکستانیوں اور دیگر اسلامی ممالک کے لوگوں کو مستفید فرمائیے اور "نگار پاکستان" کو آپ کے زیر قیادت چار چاند لگائے اور دنیائے ادب میں بلند مقام عطا کرے۔ آمین۔

جناب غلام احمد پرویز، مدیر "طلوع اسلام"

مکرمی فرمان صاحب! السلام علیکم

آپ کا کارڈ ملا۔ اس سے پہلے آپ کا کوئی خط مجھ تک نہیں پہنچا۔ جیسا کہ آپ نے خود ہی تحریر فرمایا ہے میں ابھی تک طاہرہ بیٹی اور اس کے بچوں کے صاعقانہ حادثہ کے اثرات کو اپنے قلب و دماغ سے الگ نہیں کر سکا۔ اس لئے کسی فکری موضوع پر کچھ لکھنے سے ہنوز معذور ہوں۔ لیکن جناب نیاز کا ایک دیرینہ قرضہ میرے سر پر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے چکانے کا اس سے اچھا موقع شاید پھر میسر نہ آسکے۔ اس لئے چند سطور پیش خدمت ہیں۔

یہ غالباً ۳۳-۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے نیاز صاحب کے خلاف ایک مہم اٹھائی۔ میں اس وقت تک تنگنائے مذہب سے نکل کر دین کی کشادہ وادیوں میں نہیں پہنچا تھا اس لئے میں بھی اس ہجوم مخالفت میں پیش پیش تھا۔ معاملہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ اگر نیاز صاحب فراحسن تدبر سے کام نہ لیتے تو بات جیل خانہ کی سلاخوں تک جا پہنچتی۔

اس واقعہ کو قریب بیس سال گزر گئے۔ اس دوران میں نیاز صاحب سے تو میرا کوئی واسطہ نہ پڑا لیکن بہت سی مقدس قباؤں کے پیچھے جھانکنے کے مواقع اکثر ملے۔ میں کراچی میں تھا کہ ایک دن میرے ایک (مرحوم) دوست نے کہا کہ نیاز صاحب کراچی میں آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تو محض برسبیل تذکرہ یہ بات کہہ دی لیکن اس سے مجھ پر کیا گزری؟ ——— دل داند و من دانم و داند دل من ——— چند لمحوں کی خاموشی لیکن گہری کشمکش کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ ان سے ملیں تو میرا سلام عرض کر دیں اور یہ بھی کہ میں بھی کسی وقت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ بھیجنے کو تو یہ پیغام بھیج دیا لیکن اس کے ردعمل کے تصور سے جس بیم و رجا میں میں نے وہ رات کاٹی اسکی یاد آج تک باقی ہے ——— دوسری صبح کیا دیکھتا ہوں کہ جناب نیاز ——— ہاں ہاں! جناب نیاز بنفس نفیس میرے ہاں چلے آ رہے ہیں۔ آتے ہی ایسے تپاک سے گلے ملے کہ میرا دل اب تک اسکی حرارت محسوس کرتا ہے۔ بہت سی باتیں ہوئیں، بیشتر ایسے موضوعات پر جن میں مجھے ان سے اختلاف تھا ——— مجھے اب بھی ان سے کئی باتوں میں اختلاف ہے۔ جاتے وقت پھر بڑی محبت سے گلے مل کر رخصت ہوئے۔

جناب نیاز کے ساحرانہ اندازِ نگارش کی رعنائیوں اور ان کے شاعرانہ طرزِ انشاء کی دلربائیوں کے متعلق بہت سے احباب نے لکھا ہے۔ اور لکھیں گے۔ لیکن میرے نزدیک انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انکی یہی خصوصیت انہیں حیات جاوداں عطا کر دیگی۔ انکی خدمت میں میرا محبت بھرا سلام پہنچا دیجئے۔ والسلام۔

نصیر الدین ہاشمی

مجھ سے مکرمی فرمان صاحب نے حضرت نیاز فتحپوری کے متعلق مضمون کی خواہش فرمائی۔ میں نے معذرت چاہی، لیکن میرا عذر قابل پذیرائی نہیں ہوا۔ اس لئے چند سطریں بطور پیام پیش کر رہا ہوں۔

اردو ادب میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت کو مختلف وجوہ سے جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ آپ کی کتابیں، مضامین اور رسالہ نگار نے اردو کی جو خدمت کی ہے۔ وہ نہ صرف ادبی حیثیت بلکہ اور کئی وجوہ سے قابل ستائش اور لائق داد ہے۔

رسالہ نگار کے سالنامے اپنی تنوع اور خصوصیات کے لحاظ سے بلند مقام رکھتے ہیں معیار کی بلندی مضامین میں گہرائی اور معلومات آفرینی وغیرہ کے لحاظ سے انکو بڑی اہمیت ہے۔

تقسیم ہندوستان کے بعد آپ نے ہندوستان ہی میں سکونت کر لی تھی اور اپنی ادبی خدمات کے باعث "پدما بھوشن" کے خطاب سے ملقب ہو گئے تھے۔

اب ہندوستان کو خیرباد کر کے آپ نے پاکستان میں سکونت کر لی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے زور قلم سے پاکستان کی ادبی دنیا مستفید ہو سکے گی۔

منتخبات نیاز

شہر آشوب اسلام

اے زباں تجھ سے تکلّم کے طلبگار ہیں ہم زخم جان تجھ سے تبسّم کے طلبگار ہیں ہم
سازِ دل تجھ سے ترنّم کے طلبگار ہیں ہم اے نمی آنکھوں کے قلزم کے طلبگار ہیں ہم

لطف کر ذوق تپش ہستی سیماب اپنی
دیدے چنگاریاں اے نالۂ بے تاب اپنی

اے مرے نطق زباں نالہ و افغاں ہو جا اے مری نوک قلم ہمسرِ پیکاں ہو جا
اے مری آہ نکل دل سے پریشاں ہو جا قوت ضبط فغاں جا کہیں پنہاں ہو جا

رنگ خوں آنکھ سے ٹپکے ذرا گہرا ہو کر
اشک دامن میں جو آئے تو کلیجہ ہو کر

آج عریاں ہے جو تھا سینۂ داغی مستور یارب اس باغ کی نکہت سے جہاں ہو معمور
میری صورت سے نمایاں ہو جو درد موفور آپ بھی توڑ دیں اب زخم جگر کے انگور

مرے چہرے سے اگر رنگ تڑپ کر نکلے
اشک سے آپ کا دامن بھی مشجر نکلے

اے مسلمان ہمیں تجھ سے ہزاروں ہیں گلے سن لے پھر کس کو خبر ہم سے ملے یا نہ ملے
چمنِ دہر میں غنچے ترے نغموں سے کھلے ترے نالوں سے جبل کیا فلک و عرش ہلے

آج ہنگامۂ ہستی ترا خاموش ہے کیوں
نغمۂ صحبت دوشینہ فراموش ہے کیوں

حوصلوں کا وہ کلیجہ میں تلاطم نہ رہا — آرزوؤں کا وہ سینہ میں تراکم نہ رہا
سازِ ہستی کا وہ اگلا سا ترنم نہ رہا — جرأت آموز وہ اندازِ تکلّم نہ رہا
قلب میں درد کی وہ لذتِ پنہاں ہی نہیں
گلشنِ دہر میں تو زمزمہ ساماں ہی نہیں

دعوئ عشق مگر درد سے پیماں توڑا — زخم رکھتا ہے مگر پھر بھی نمکداں توڑا
صید کا عزم ہے اور تیر کا پیکاں توڑا — ہے مسلمان مگر رشتۂ قرآں توڑا
ہو گئے برہاں کے طالب درِ ایقاں بھولے
شیوۂ زندگیِ بوذر و سلماں بھولے

غیر لیتے ہیں سبق ہم سے جہانداری کا — عزم کا، ہمت راسخ کا، وفاداری کا
رنگ ملت بھی ہے یہ بیگانۂ ہشیاری کا — خواب بھی سو کے نہ دیکھا کبھی بیداری کا
درس لیتے نہیں اب سطوت سلجوقی سے
جاہ عباسیہ سے شوکت فاروقی سے

ایک مٹھی میں اگر اُن کے تھی اشتر کی مہار — دوسرے ہاتھ میں تھی اُن کے برہنہ تلوار
زخمی سی تھے پا، درد سے سینہ تھا فگار — نشۂ بادۂ ایماں سے مگر تھے سرشار
وہ جلالت تھی وہ ہیبت تھی شتربانوں کی
جھک گئی گردنیں بغداد کے رُہبانوں کی

نطع پوشانِ عرب کا وہ پر از جوش فسُوں — تیغ ہو جاتی اگر ہاتھ میں لیتے عرجوں

سحر تھا باتوں میں اور آنکھوں میں انکے افسوں   چشم و لب کی حرکت سے کیا اعداء کو زبوں
نام سے ان کے سلاطین عجم کانپتے تھے
سامنے آتے ہوئے قلب و قدم کانپتے تھے

جس طرف بڑھ گئے یوں فتح و ظفر لے کے بڑھے   جس طرح نور و ضیا ساتھ قمر لے کے بڑھے
روکا دشمن نے تو پھر اس کی خبر لے کے بڑھے   جھک گیا کوئی تو بس لطف نظر لے کے بڑھے
ہل گیا قاف سنا لوں سے اگر ٹکرا کر
نیل سے مل گئے پرچم بھی ادھر لہرا کر

گرز رکھے ہے وہ شانے پہ محمدؐ ثانی   ینچری آگے جلو میں عرب و ایرانی
مونچھ بل کھائی ہوئی چین سے بھری پیشانی   تیور ایسے کہ کریں شمشیر کا پتہ پانی
کبھی تک ہاتھ کھلے ان میں برہنہ شمشیر
شان سے نیزوں کی تھا ترک فلک بھی نخچیر

بت مریم سے نصاریٰ کو ادھر تھی امید   اب فلک سے کوئی ترکوں پہ بلا آئی شدید
جھانکتا ہی تھا ابھی بام فلک سے خورشید   کہ ادھر نور کو ظلمت پہ ہوئی یوں تصعید
دیر معمور تھا اسلام کے جانبازوں سے
صوفیا گونج اٹھا تکبیر کی آوازوں سے

زلزلہ پڑ گیا یورپ کے کلیساؤں میں   کھلبلی مچ گئی یونان کے داناؤں میں
آج غواص جو ٹیولس کے تھے دریاؤں میں   ڈیرے کل ڈالدے روم کے صحراؤں میں
بجلیاں تیغ کی گر آج گری بلقاں پر
چھا گئیں کل وہی بادل کی طرح ایراں پر

سرِ سودا زدہ میں عشق کی شوریدگی تھی   سینہ پُر داغ تھا اور قلب میں تفتیدگی تھی
حوصلے دل میں تھے اور روح میں بالیدگی تھی   جس طرف دیکھئے اسلام کی رو ئیدگی تھی
شعلۂ توحید کا ہر دل میں بھڑک جاتا تھا
مرغ تک نام خدا سن کے پھڑک جاتا تھا

یاد ہی ترک تری بولی میں اب ہیں پامال   خستگی روح میں اعضا میں تھکن دل میں ملال
ڈاڑھیاں سرخ ہیں اور خون سے یوں کپڑے لال   ڈال دے ہوری میں جس طرح کوئی رنگ گلال
سیلِ خونِ شہدا سے ہوا صحرا دریا
پٹ گیا لاشوں سے اور بن گیا دریا صحرا

ہو گئے قتل مکیں اور مکاں ہیں مسمار   جس طرف دیکھئے لاشوں کا لگا ہے انبار
بوڑھے ہیں ذبح جدا قتل الگ ہیں بیمار   ہے زمیں خونِ خواتینِ عرب سے گلنار
گردنیں بچوں کی اور آہنی شمشیریں آہ
کیسی خاموش ہوئیں بولتی تصویریں آہ

سن کے یہ سینہ میں بے چین جگر ہو کہ نہ ہو   خونفشانی کا محل دیدۂ تر ہو کہ نہ ہو
اپنے اعضا کی جراحت کی خبر ہو کہ نہ ہو   اپنے انجام پہ کچھ تجھکو نظر ہو کہ نہ ہو
نہ سہی یہ بھی مٹیں ترک تو کچھ خوف نہیں
شمع فاراں یہ مگر ڈر ہے نہ بجھ جائے کہیں

نہ مگر نالے میں تیرے شرر افشانی ہے   وہ جنوں ہے نہ وہ اندازِ حدی خوانی ہے
نہ ترے سینۂ صد چاک کی عریانی ہے   نہ جنوں کی تری وہ سلسلہ جنبانی ہے
تو بھلا بیٹھا غضب لذت دلسوزی کو
بیقراری کو مذاق تپش اندوزی کو

کیف کی اب نہ رہی آنکھ میں سرخی باقی نہ وہ رفتار میں ہے لغزش مستی باقی
بزم میں ساقی نہ اب بادۂ صافی باقی ہے فقط تذکرۂ جام و صراحی باقی
محفل عشرتِ دوشینہ کے افسانہ ہیں
بازی باد سحر کو پر پروانہ ہیں

سر طاعت ہے نہ ہے ذوق نیایش باقی نہ بھالت کا رہا شوق نمایش باقی
اب نہیں ہے طلب جاہ کی خواہش باقی رہ گئی غیر کی اک مدح وستایش باقی
ہمسری غیر کی اس بود پہ اللہ اللہ
رشک اغیار کے مقصود پہ اللہ اللہ

وہ طلب گار ہیں دولت کے وہ شیدا ان کی وہ ترقی کے شناسا وہ شناسا ان کی
یار ہے زیب نظر طرح کلیسا ان کی یا کرو عزم سفر چھوڑ دو دنیا ان کی
خس سکوں چاہے تو گرداب کو کیا پروا ہے
گرد شکوہ رم آہو سے کرے سودا ہے

فہم ان میں ہے ذکا ان میں حصانت انمیں علم ان میں ہے عمل ان میں دیانت ان میں
قومیت ان میں وفا ان میں مروت ان میں حلم ان میں ہے سخا ان میں ہے غیرت ان میں
حیف اسلام سے اسلام کی بیزاری پر
صدقے ہو جائے اس کفر کی دینداری پر

اے مسلمان نکل خون کا محضر لے کر گرم پیکار ہو پھر ہاتھ میں خنجر لے کر
ہاں نکل سینہ میں امیدوں کا محشر لے کر یہ سکوں ہیچ ہیں ظالم دل مضطر لے کر

کھینچ وہ نالہ کہ پیدا ہوں شرر دامن میں
آگ لگ جائے تری شمع کے پیراہن میں

ہو کے نکہت تجھے پرہیز پریشانی سے　　گل ہے اور ڈر تجھے آشفتہ گریبانی سے
جلوہ ہو کر تو جھجکنے لگا عریانی سے　　شعلہ ہو کر یہ حذر سوختہ سامانی سے
ہو گیا پست تو آواز محمد ہو کر
نور رہتا نہیں واللہ مقید ہو کر

سینۂ کوہ جسے سن کے دہل جاتا تھا　　لے کے وہ بار امانت تو سنبھل جاتا تھا
لن ترانی کی صدا سن کے مچل جاتا تھا　　یک جلوے کے لئے آگ میں جل جاتا تھا
جستجو کی وہ مگر تیری ادائیں نہ رہیں
ذوق آلود وہ پر درد صدائیں نہ رہیں

ساز توحید کا اک نغمۂ بیتاب تھا تو　　ایک جوہر تھا مگر پھر بھی نہ کمیاب تھا تو
مثل نرگس نہ کبھی شیفتۂ خواب تھا تو　　سرعت برق تھا تو ہستیٔ سیماب تھا تو
نہ ہوا جس کے لئے اف درِ خیبر بھاری
نظر آتا ہے اسی ہاتھ میں خنجر بھاری

کیا ترا بیعت رضواں میں یہی پیماں تھا　　کیا یہی درس علی و عمر و عثماں تھا
یہی اسلام تھا پہلے بھی یہی ایماں تھا　　کیا شۂ یثرب و بطحیٰ کا یہی فرماں تھا
جا نکل تو ہے مذلت کا اگر متوالا
تیرا محتاج نہیں گنبد خضریٰ والا

نور توحید بنا قلب کو مسکن اپنا　　مشتعل تجھ سے ہو پھر سینہ کا گلخن اپنا

کیوں بھلا بیٹھا تو دیرینہ نشیمن اپنا ہم کو ویسا ہی سمجھ کشتۂ چتون اپنا

منتظر بیٹھے ہیں تیری شرر افروزی کے

تیری ناوک سے طلبگار ہیں دلدوزی کے

تیرے جلوے سے ہو معمور مرا ذوقِ نیاز ناز تجھ پر ہو ہمیں تجھکو رہے ہم پر ناز

زمزموں سے ترے معمور ہو اسلام کا ساز نہ رہے لطف نظر شعبدۂ شیشہ باز

لے اڑے مستی صہبا ترے دیوانوں کو

توڑ دیں بزم میں ہم غیر کے پیمانوں کو

منتشر مری نوا صورت نکہت ہو جائے ہر جراحت کا نشاں دیدۂ عبرت ہو جائے

دل بے چین مری زیست کی لذت ہو جائے کلفت درد مجھے مایۂ عشرت ہو جائے

خط تقدیر مٹا دوں ترے در پر گھس کر

خاک ہو جاؤں ترے راہ کی میں پس پس کر

(الہلال ۱۹۱۰ء)

درسِ عمل

حصولِ مقصدِ فطرت تھا ہجرتِ اسلام　　نہاں تھے قصر بہ آغوشِ خانماں تبہی
حریفِ خاکِ عرب ہو سکا نہ آخر کار　　غرورِ خسروی و افتخارِ کج کلہی
تھی اپنی چینِ جبیں وجہِ رعشۂ دیہیم　　تھی اپنی چشمِ غضب لرزشِ سریرِ شہی
بنائے دولتِ اندلس ہٹا گئی ہم کو　　نہ مٹ سکے گا ستم سے غرورِ بے گنہی
ہر اک شکست ہے سامانِ صد ہزار عروج　　نوید نشۂ شب ہے خمارِ صبحگہی

قفس گذار و بہ سامانِ صد بہار بیا
سپند دار بروں شو سمند دار بیا

کسے خبر تھی کہ یہ پردۂ جہانبانی　　کرے گا پیشِ نظر منظرِ جہاں سوزی
قسم بہ شوقِ جفایت کہ آ گیا پھر یاد　　طریقِ ملک ستانی، اصولِ فیروزی
فشارِ تاک میں پنہاں ہے رونقِ مینا　　ہے سوزِ شمع سے وابستہ محفل افروزی
نہ خون سینہ سے بہتا نہ یادِ گل آتی　　بڑا ہی لطف تھا تیرِ جفا کی دلدوزی
تمہاری تیغِ ستم بھی دو نیم ہو گی اگر　　جو اپنی خوئے وفا ہو گئی بد آموزی

مرا بدامن اگر آتشے میسر گشت
ہزار شکر کز و جادہ ام منور گشت

الہلال سنہ ۱۹۱۰ء

صدا بہ صحرا

ہم نفس اب تجھ سے میں افسانۂ دل کیا کہوں　　داستان برہمی رنگ محفل کیا کہوں
حال قیس نارسائے اوج محمل کیا کہوں　　قصۂ اندوہ یک گم کردہ منزل کیا کہوں

ہاں زباں تک آ نہیں سکتا ہے اب دل کا پیام
ساز مجروح نوا ہے لب ہے مجروح کلام

سیکڑوں شکوے ہیں لیکن لب پہ لا سکتا نہیں　　ہیں ہزاروں قصۂ غم پر سنا سکتا نہیں
زخم لاکھوں ہیں مگر تجھ کو دکھا سکتا نہیں　　دل کا سیل اشک آنکھوں سے بہا سکتا نہیں

ہے ہجوم صد ہزاراں آرزو اور دل ضعیف
جوشش صد بحر طوفاں اور ساحل ضعیف

ہاں مجھے تڑپا رہی ہے ولولہ زائی میری　　اضطراب دل ہے خوئے ناشکیبائی میری
ریش پیشانی ہے اب تو جبہہ فرسائی مری　　کون دیکھے گا مگر نخوت کی رعنائی مری

کون سنتا ہے اگر آہنگ جاں بیتاب ہے
ساز دل بے صرفہ میرا تشنۂ مضراب ہے

جی میں ہے اب پارہ پارہ دیکھوں لاز بخیر جمود　　منتشر کردوں نظام دہر کا یہ تار و پود
پھر فضا عالم کی ہو اور پھر وہی اپنی نمود　　صفحۂ عالم پہ کردوں نقش پھر اپنا وجود

این مگر خوابے ست کو را کاوش تعبیر نیست
خاک چوں بر باد شد منت کش تعمیر نیست

یوں نصیحت کے لیے میری زباں بھی تیز ہے — شیخ بھی منبر پہ وقت وعظ شعلہ ریز ہے
ملک کا ہر فرد وقفِ درس جست و خیز ہے — رہبران قوم کا نوحہ بھی درد انگیز ہے
حال میں آتے نہیں لیکن گذر کر قال سے
کر نہیں سکتے جدا افعال کو اقوال سے

لفظ مسلم کا کبھی مفہوم تھا یکسر عمل — قوت عزم و ارادہ اس کی تھی ضرب المثل
نشرِ حق اک فعل تھا مستغنیِ بانگِ دہل — جب ہوئے اسلام میں تحلیل یوں صدہا ملل
بات یہ تھی دیکھ کر عالم جسے حیران تھا
ورنہ یوں تو ابن عبداللہ بھی اک انسان تھا

کیوں عرب کی وادیاں لبریزِ جلوہ ہو گئیں — چوٹیاں فاراں کی کیونکر رشکِ سینا ہو گئیں
وہ عرب کی وحشتیں ویرانیاں کیا ہو گئیں — اس کی صحرا خیزیاں کیونکر چمن زا ہو گئیں
قوت مافوق فطرت کا یہ جلوہ تو نہ تھا
ایک انساں تھا محمدؐ بھی فرشتہ تو نہ تھا

وہ یتیم بے نوا تھا علم سے بیگانہ تھا — صاحب جاہِ سلیمان و ید بیضا نہ تھا
اس کی آواز حزیں داؤد کا نغمہ نہ تھا — کچھ زباں میں اس کی افسونِ دمِ عیسیٰؑ نہ تھا
ہات میں اس کے فقط اک نسخۂ قرآن تھا
دل میں لیکن حوصلہ تھا عزم تھا ایمان تھا

پھر اگر حاصل کسی کو ہو نگاہِ حق شناس — فہم ربط و علت و معلول کے ہوں گر حواس

تو وہ کر سکتا ہے اس سے یہ نتیجہ اقتباس   غفلت و رفعت کا ہرگز ہو نہیں سکتا تماس
پرورش ہوتی ہے آغوشِ عمل میں اوج کی
جیسے دامانِ صبا ہے زندگانی موج کی

پست کرنا ایک کو اور دوسرے کو سربلند   فائدہ پہنچانا اس کو اُس کو پہنچانا گزند
خندۂ گل تم کو دینا میرے دل کو ریشخند   فطرت نظمِ دو عالم ہے اس پر کاربند
دیکھ لیتا ہے مگر وہ کون کس کا اہل ہے
کوئی خوش ہو یا خفا اس کو تو کرنا عدل ہے

پھر اگر ہم پست ہیں تو ہے ہمارا ہی قصور   ہے خطا اپنی اگر اقبال ہے ہم سے نفور
اپنی لغزش تھی اگر ہے ظرف ہستی چور چور   زہر اگر کھائیں گے ہم تو ہم کو مر جانا ضرور
خود تو ہوں برباد اور شکوہ کریں اللہ سے
ہو خدا بیزار ایسے رمز ناآگاہ سے

جب نہیں اصلاح تری ترکیبِ ہستی کا نظام   کیا کرے گا کوئی لے کر تیری بوسیدہ عظام
زخم تیرا ہے اگر نا آشنائے التیام   ہو نہیں سکتا گوارا دہر کو تیرا قیام
چشم بر عشرت نہادن ہستیِ افسردہ را
ہست محمود طرب بودن سرِ آزردہ را

اقتضائے حال ہے تیرا اگر ہے سرنگوں   ثمرۂ کردار ہے گر تیری حالت ہے زبوں
سچ ہے تیری خواریاں پہنچ گئیں حد سے فزوں   ہے گلہ تجھ کو مگر کس کا ذرا میں بھی سنوں
شکوہ سنجِ سیرِ آہو خاکِ صحرا ہو سو کیوں
خس کی بے تابی سے خائف موجِ دریا ہو سو کیوں

ہے اجل بھی زندگی سے تیری وقفِ انفعال　　دشت کے دل میں بھی تیری خاک سے گرد ملال
جامۂ ہستی ہے تیرا رشکِ دامانِ سوال　　تیری ہر جنبش کو ہے تیرا ہر ممکن محال

دیکھتے ہیں سب خزاں کو باغ میں آتے ہوئے
کوئی گلشن یوں نہیں دیکھا اجڑ جاتے ہوئے

آبلہ پا ہے مگر ناواقفِ لطفِ خلش　　نیم بسمل ہے مگر محرومِ آہنگ تپش
ان مصائب پر بھی ہے اب تک وہی تیری روش　　ہے ابھی باقی مگر کچھ اور شوقِ سرزنش

بے حسی سے خود تری تصویر شرمانے لگی
معصیت سے تیری خود تقدیر شرمانے لگی

حال یہ اور اس پر اُف یہ خود فراموشی تری　　اپنی جانِ ناتواں پر یہ ستم کوشی تری
سیل منگیں اور حبابِ آسا تنک جوشی تری　　قہر ہے اس عہدِ ہشیاری میں بے ہوشی تری

حیف بر گوشے نہ زد ہر پردہ اش کوس رحیل
وائے بر چشمے نگردش جلوۂ منزل کحیل

دہر سے تجھ کو ہے کیوں روئے تغافل کا گلہ　　دہر والوں سے ہے کیوں دستِ تطاول کا گلہ
کاش ہوتا اپنی ہستی سے تعطل کا گلہ　　اپنے پائے عزم سے ہوتا تزلزل کا گلہ

شکوۂ اشکے چہ ازرد پیشِ دامانِ سحاب
سیل راکے رحم آید بر نمِ چشمِ حباب

وضع اپنی چھوڑ دی اپنی معیشت چھوڑ دی　　اپنی ہستی کی ادائے مشرقیت چھوڑ دی
خوئے الفت چھوڑ دی رسمِ محبت چھوڑ دی　　ہات سے حبلِ متینِ مذہبیت چھوڑ دی

ایسی صورت تو بگاڑی روئے مغرب دیکھ کر
عادتیں لیکن نہ بدلیں خوئے مغرب دیکھ کر

تو وہی ہے جس نے دنیا کو دیا درسِ حیات — تو وہی ہے زندگی جس کی تھی فخرِ کائنات
ہر قدم تیرا تھا گویا صد جبل عزمِ ثبات — نام تیرا دہر میں تھا باعثِ امن و نجات

یا چنیں گشتی وجودت مرگ را شرمندہ ساخت
خفتِ ذاتت گیاہ و برگ را شرمندہ ساخت

ہاں دکھا دے جلوہ ہائے آرزو کی آب و تاب — توڑ دے ہاں شاہدِ مقصود کا بند نقاب
کر لے پہلے قلب میں پیدا مگر اک اضطراب — مدعا میں خوئے شورش خواہشوں میں التہاب

نالہ باش و چوں سپند از دام مجمر شو بروں
یا منال از سوزش دریاب از مرگت سکوں

سونے والو اب خیالِ قربِ منزل چھوڑ دو — یا کرو اک عزمِ محکم خوابِ غافل چھوڑ دو
ہو چکے پامال اب تحصیلِ حاصل چھوڑ دو — ڈال دو سیلاب میں اپنے کو ساحل چھوڑ دو

تو سمندر شو کہ حالا آتشے در جاں فتاد
باش مرغابی کہ اکنوں کار با طوفاں فتاد

زمیندار ۱۹۱۰ء

غم

ہستیٔ تاریک کا مجمرِ فروزِ دل ہے تو   طرحِ اندازِ سرِ ہنگامۂ محفل ہے تو
ہے سکوں دریاب راحت انتہائے جادہ پر   گو بظاہر انکسارِ ہمتِ راحل ہے تو
کامرانی ہے رہینِ اضطرارِ سعیٔ گرم   اضطرارِ سعیہائے گرم کا منزل ہے تو
موج کی بیتابیوں سے عرضِ جوہر کھل گیا   نغمۂ سیالِ جیحوں بر لبِ ساحل ہے تو
ہے وفورِ یاس میں پنہاں نمودِ قیسِ نجد   آئینہ دارِ جمالِ صاحبِ محمل ہے تو
خنجرِ تلخیٔ ناکامی ہے ظاہر بیں مگر   چشمِ حق بیں میں فراغِ خاطرِ بسمل ہے تو

تھا خلش تو آدم و حوا کی ماہ وطیں ہوا
برآمیٔ خلد سے تو دہر کا آئیں ہوا

شانِ دلداری شکستِ وعدۂ جاناں سے ہے   رونقِ عارض سوادِ گیسوئے پیچاں سے ہے
منحصر بو کی پریشانی پہ ہے کارِ مشام   گل شگفتہ اضطرارِ شبنمِ غلطاں سے ہے
پارہ پارہ سے کھلا یہ رازِ موجِ انبساط   خندۂ گل انقباضِ غنچۂ پیکاں سے ہے
پھونک لوں اپنے کو تو ہو خلق میری روشناس   مہرِ عالم دوست ، اپنی ہستیٔ سوزاں سے ہے
رقصِ پروانہ سرودِ خندۂ بزمِ وصال   ایک شمعِ شب نشیں کے دیدۂ گریاں سے ہے
اضطرابِ زخم سے ہے مرتعش تارِ رباب   یعنی کیفِ سازِ ہستی نالہ و افغاں سے ہے

گل گریباں چاک ہے تو خوشنوا بلبل بھی ہے
ہے فشار تاک تو مینا بھی ہے قلقل بھی ہے

اٹھ دل راحت طلب، پیدا سر شوریدہ کر — آپ بھی غمدیدہ ہو اوروں کو بھی غم دیدہ کر
پھونک دے محفل کو اپنی شعلۂ آواز سے — گرمئ ہنگامہ سے ہر قلب کو تفتیدہ کر
سرمہ آسا اہل بینش کی نگاہوں میں سما — ذرۂ ہستی کو اپنے اور بھی سائیدہ کر
شور پیدا کر جہاں میں نالۂ بے تاب سے — زخم ہائے سینہ کو اپنے نمک پاشیدہ کر
کر کے عریاں شمع ہستی کو دکھا اس کا فروغ — یعنی نذر شعلۂ غم جامۂ بوسیدہ کر
اک زمانہ دیکھ لے رفعت تری شکل ہلال — اور بھی اپنے تن کاہیدہ کو کاہیدہ کر

کارواں کی چشم خوابیدہ کو ہو جا درد تو
جب وہ سرگرم عمل ہو تو بن جا گرد تو

ساقیا پھر جلوہ پیرا ہو اسی انداز سے — زندہ کر دے اہل محفل کو اسی اعجاز سے
حسبۃ للہ ہماری خستگی پر کر نظر — زور بازو گھٹ گیا پر رہ گئے پرواز سے
جھانک لے پھر پردۂ برد یمانی سے ذرا — پھر سکھا طرز فغاں چشم نوا پرواز سے
وہ حدی خوانوں کے نغمے وہ رجز کے ولولے — ہو گئے بیگانہ سب اپنے شکستہ ساز سے
ہمنوا ہوں غیر کا میں بھی بھلا ممکن کہاں — جب کرا ہا تک نہیں جاتا یہاں آواز سے
محو کر دل سے خطا دلدادگان حسن کی — روٹھتا ہے یوں بھی کوئی عاشق جانباز سے

سر اگر ہم کو دیا ہے سرفروشی بھی سکھا
مے عنایت کی تو پھر وارفتہ ہوشی بھی سکھا

زمیندار ۱۹۱۰ء

"تاج"

ہے جو اک انداز گویائی تری تصویر میں　　نطق پنہاں ہے، جو اس خاموشی دلگیر میں
یہ جو اک روحانیت سی ہے تری تاثیر میں　　تاج سچ کہہ، بات کیا ہے اس تری تعمیر میں

یہ فضا میں تیری، جو اک طرزِ بیتابانہ ہے
دفن تیری خاک میں، وہ کونسا پروانہ ہے

کس کی جلوہ پاشیوں سے اس قدر معمور ہے　　تیرا جو ذرّہ ہے، وہ رنگین ہے، مخمور ہے؟
کونسا خمّار تیری خاک میں مستور ہے؟　　تاک ہے ہر نخل، ہر پھل، دانۂ انگور ہے!

پاؤں میں میرے، تجھے دیکھا تو لغزش آگئی
نیند سی آنے لگی، مستی سی سر میں چھا گئی

تو دلہن ہے خامشی بھی جس کی نغمہ ریز ہے؟　　یا مُشکّل، تو کسی کا خوابِ دل آویز ہے؟
تو کوئی پیراہنِ گل ہے جو نکہت بیز ہے؟　　یا تبسم ہے کسی کا تو، جو کیف انگیز ہے!

ایسی موسیقی کہاں سازِ ربابؔ چنگ میں!
کس قدر دوشیزگی ہے، تیرے ہلکے رنگ میں!

معدنِ سیماب اُبلا، اور ہوا اس کو قرار　　رہ گیا ہے جم کے، یا اک موجۂ سیلِ بہار
گر پڑے ہیں ایک جا یا ٹوٹ کر حوروں کے ہار　　جسم یا نورِ سحر نے کر لیا ہے اختیار

رات کو زُہرہ کے پڑھنے کا صحیفہ ہے کوئی؟
ماہ کی یا چادرِ سیمیں کا بوٹہ ہے کوئی؟

یہ تری محراب کی رنگین تحریروں کا حال! ہوں بیاضِ چشم میں جس طرح ڈورے لال لال
قطع مرمر پر حروفِ سنگِ موسیٰ کا یہ حال جیسے پانی میں کسی معشوق نے کھولے ہوں بال
آہ! ان گلہائے سنگیں کی صفت کیا کیجئے
چاہتا ہے جی کہ بس دامن میں رکھ ہی لیجئے

طاقِ ایواں ہیں ترے، یا حسن کی انگڑائیاں سنگِ در ہیں، یا فرِ شوکت کی جبہ سائیاں
رنگ وہ، جس سے خجل ہوں آئینہ سیمائیاں حوض کی صناعیاں، اللہ رے بابل زائیاں
نہر ہیں یہ تیرے رخشندہ حبابوں کا سماں
کثرتِ انجم سے جیسے کھل رہی ہو کہکشاں

دستِ لیلیٰ شاخِ گُل، اور اُس پہ ساغر گُل ہوا قطرۂ شبنم کا پڑنا، اس میں جوشِ مُل ہوا
کس کا سامانِ صبوحی، خندۂ قلقل ہوا تو طلب کس کیلئے اے مُطربِ بلبل ہوا
گنگ ہے سوسن، تو نرگس تو ہی آنکھیں کھول دے
مریمِ غنچہ، نہیں صایم، تو، تو ہی بول دے

جانتا ہوں تاج، جو ہے تیرے سینہ میں نہاں کالبدِ ممتاز کا اور پیکرِ شاہ جہاں
کیوں نہ ہو پھر، تیری ہر شے دلفریب و دلستاں! تیری ہر ہر خشت سے ملفوف ہے اک داستاں
گلشنِ مغلیہ میں تھا، ایک جو چوٹی کا پھول
ہے وہی آغوش میں اب تیرے ہلکے جتنا پھول

رفتگانِ ہند، وہ صاحب منال و مال کے   نصب ہر گوشہ میں تھے جن کے علم اقبال کے
تھا نہ لیکن حوصلہ، یہ جاہ وفر کے با سکے   بات تو کرلیں، ذرا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے

یوں جھکے رہتے تھے سب شاہ، جہاں کے سامنے
جس طرح پشتِ کماں، دستِ جواں کے سامنے

جس جگہ جبریل کے جاتے ہوئے جلتے تھے پر   نام سن کے جس کا رہ جاتا تھا عالم کانپ کر
ہے اسی دربار کا یہ حال اب پیشِ نظر   ہم سے آوارہ گداؤں کا بھی ہے اس جا گذر

تیری اے دنیائے دوں، اللہ ری نیرنگیاں!
تیرے سازِ پُر فسوں کی، اللہ ری نا آہنگیاں!

میری نظروں میں، مگر اس کی جلالت ہے وہی   شہ جہاں بھی ہے وہی اور اسکی شوکت ہے وہی
ہے وہی جبروت اس کی، اس کی عظمت ہے وہی   ہے وہی ممتاز بیگم، اس کی عصمت ہے وہی

کیسے دیکھوں ان کی تربت سر اٹھا سکتا نہیں
چھوڑ دو دلگیر میں تو پاس جا سکتا نہیں

دور ہی سے ہو، مرا شاہ شہاں مجرا قبول   ہو نیاز خستہ کا یہ ہدیۂ رسوا قبول!

نقاد - دسمبر ۱۹۱۳ء

"کوئل سے"

اے نوید جانفزا، اے طائر فرخندہ فال — آگئی بارے تو لے کر پھر پیام برشگال
یعنی آپہونچی وہی شوریدگی سر میں لئے — اک جہانِ بے قراری جنبشِ پر میں لئے

کیا ہو، ہم تجھ سے اگر شیون کی مستی چھین لیں — کیا رہے تجھ میں، جو تیرا ساز ہستی چھین لیں
تیرے نغموں کا ذرا دیکھوں تو کیسا ساز ہے — تو کہیں ہے بھی کہ بس آواز ہی آواز ہے

دو منٹ بیٹھی یہاں اور پھر ادھر کو اُڑ گئی — چار آوازیں لگائیں اور پھر تو اڑ گئی
کیسی بے چینی ہے تو، شرمندہ جس سے پارہ ہے — میں سمجھتا ہوں کہ تو موسیقیٔ آوارہ ہے

اے سراپا درد، اے فریادیٔ فصل بہار — کیوں صدا تیری ہوئی جاتی ہے میرے دل کے پار
تو کسی کی آہ کا انداز بے تابانہ ہے — یا کسی ناکام کا تو دکھ بھرا افسانہ ہے

اے نقیب ابرو باراں، اے علمدار بہار — اے کلید میکدہ اے آرزوے مے گسار
اے کہ تیری ہر صدا گویا جواز بادہ ہے — کچھ گنہ گرنے یہ میرا دل بھی اب آمادہ ہے

سوگ ہے کس کا تجھے جو ماتمی ملبوس ہے   جس کی پروانہ ہے تو وہ کونسا فانوس ہے
ہائے اس سن میں یہ تیری جان کو کیا ہوگیا   بڑھتے بڑھتے غم ترا آخر کو سودا ہوگیا

جوگ کس کا تونے سادھا ہے تو جوگن کس کی ہے   ہر گھڑی کی رونے والی تو برہ گن کس کی ہے
کس کے غم میں آہ تو یوں جان سے پھرتی ہے تنگ   اف یہ سوزِ بیوگی اور یہ جوانی شیام رنگ

ہم ہنسا کرتے تھے تیری بیت بازی پر مگر   زخم الفت سے حقیقت ہوگئی پیشِ نظر
یعنی تو اک شعر ہے جو درد سے معمور ہے   کچھ نہیں ہے تو مگر اک نالۂ مجبور ہے

تو ہی اک تنہا نہیں، ہیں اور بھی فرقت زدہ   تجھ کو لیکن دیکھ کر ہوں اس لیے حیرت زدہ
ہوگئی فریاد میری نغمۂ تر کس طرح   میرے شیون کے خدا بالگ گئے پر کس طرح

۱۹۱۴ء

جھکی ہوئی نگاہ

یہ جھکی ہوئی نگہ ہے کہ مزارِ ناتوانی — یہ خموشیاں ہیں اس کی کہ زبان بے زبانی
زہے باصرہ نوازی زہے ماجرا چکانی — جو اٹھے تو اک تماشہ، نہ اٹھے تو اک کہانی

کبھی پُر عتاب تابش، کبھی ریزشِ ترنّم — کبھی سر بسر ستم ہے کبھی یک جہاں ترحم
جو ہزار حشر برپا کرے شورشِ تکلم — تو اٹھائے لاکھ طوفاں یہ تموجِ تبسّم

نہ اٹھے اگر یہ پوری تو ہے نیمچہ سراسر — جو کھنچے بحد ابرو تو ہے تیغ کے برابر
جو ہو سیدھی یہ تو پیکاں جو ہو کج ذرا تو خنجر — ہے چھری جو لوٹ جائے کبھی ایک بار چل کر

یہ جگا دے لاکھ جادو جو ہو اس میں بے حجابی — یہ سُلا کے سب کو رکھ دے جو ہو اس میں نیم خوابی
یہ خراب کر دے عالم ہو اگر کبھی شرابی — یہ سکھا دے بادہ خواری ہو اگر کہیں گلابی

جو اُدھر سواد مژگاں سے بپا قیامتیں ہیں — تو اِدھر بھی سینہ چاکی کی بہت شکایتیں ہیں
ہوئی اس پہ منفعل وہ تو یہ کیا رعایتیں ہیں — میں ہی جانتا ہوں جیسی یہ خجل جسارتیں ہیں

جو ہو اختیار اس کو تو کرے نہ چارہ سازی — مگر اس سے ہو سکے بھی کہیں رسمِ دلنوازی
جو وہ جان لے کہ اس میں ہے ادائے بے نیازی — تو وہ چھوڑ ہی نہ دے پھر روشِ ستم طرازی

نہیں گر خمار اس کا، تو ہے کیوں مجھے خموشی — ہوئی محو اس نشے میں مری سب جنوں خروشی
ہے اسی کے دم سے قائم یہ رواجِ بادہ نوشی — رہے تا ابد سلامت یہ دوکانِ مے فروشی

(نقاد جنوری ۱۹۱۳ء)

لیلۃ القدر

اے شبِ قدر، اے بساطِ جلوۂ حسنِ ازل   اے کہ بیتاب مسرت از تو جانِ صد امل
اے کہ شد بالیدہ از تو در جہاں روحِ عمل   اے کہ آئی با ہزاراں یوسفستاں در بغل

آ کہ تجھ سے آ رہی ہے بوئے پیماں دوست کی
نکہتِ خُلّت، شمیمِ لطفِ پنہاں دوست کی

کس جمالِ نور پرور کی تو جلوہ گاہ ہے   شب ہے تو واللہ، لیکن رشکِ مہر و ماہ ہے
آرزوئے عیسیٰ مریم کی جولانگاہ ہے   تجھ میں آسودہ تمنائے خلیل اللہ ہے

تو کہانی مصر کی ہے، طور کا افسانہ ہے
ہائے کیا کیا ہم پہ لطفِ پرسشِ جانانہ ہے

کیسا پُر از ہنگامہ تیرا منظرِ خاموش ہے   کس بلا کا شام میں تیری، سحر کا جوش ہے
کس قدر تیری فضائے تار الفت کوش ہے   جس کا ہر ہر ذرہ اک پھیلی ہوئی آغوش ہے

تو محمدؐ کے قریں لائی تھی اللہ کا کلام!
اے خوشا لطفِ دو عالم، اے خوشا حسنِ پیام

اے کہ تیری زلفِ پر چین کی ختن افشانیاں   چھا گئیں عالم پہ یکسر از زمیں تا آسماں
اے کہ تیرے ساز میں تھیں زمزمہ سامانیاں   اے کہ تھیں پنہاں ترے پیغام میں خوش کلیاں

اب ذرا کاشانۂ مسلم کی آبادی کو دیکھ
آ، پرستاروں کی اپنے خانہ بربادی کو دیکھ

وہ تری آمد وہ اپنی منہمک تیاریاں　　صحنِ مسجد میں وہ جبہہ سائیاں، وہ زاریاں
آہ، لیکن اب کہاں راتوں کی وہ بیداریاں　　تیری خلوت میں وہ اپنی مستیاں، سرشاریاں

دیکھ لے، اب حالتِ شب زندہ داراں دیکھ لے
اک ذرا کیفیتِ شہرِ خموشاں دیکھ لے

سر وہی ہے، اس میں لیکن آہ وہ سودا نہیں　　دل وہی ہے، اب مگر نالہ فلک پیما نہیں
اپنی ہستی ہے وہی لیکن تماشہ زا نہیں　　یعنی اب ہم آشنائے ملتِ بیضا نہیں

درد کی جب حس نہیں کیا فکر درماں کیجئے؟
جب نہیں غیرت تو پھر کس کو پشیماں کیجئے؟

نقاد ستمبر ۱۴ء ص ۴۴، ۴۵

ساحلِ جمن پر ایک صبح

(آگرہ کی ایک صحبت کی یاد)

کس مزہ سے آہ، تیری بھی گذرتی ہے جمن　　　شہر ہو یا بادیہ، تجھکو یونہی پھرنا مگن
شوخیاں عادت تری، اٹکھیلیاں تیرا چلن　　　وہ تری رفتار میں اک بے خبر مستانہ پن

موج ہے یہ بھی تری جو دشت سبزہ زار ہے
کس قدر فیاض تیرا دستِ رعشہ دار ہے

راحتِ جاں ہیں مناظر اور بھی لیکن نہ یوں　　　دیکھکر تجھ کو نہیں اب حالِ دلِ میرا زبوں
یہ طمانینت کہاں تھی، اور پھر ایسی فسزوں!　　　بیقراری ہے تری، یا ایک طوفانِ سکوں

میں سمجھتا ہوں کہ تو صرف ایک نزہت ہے رقیق!
اک لطافت ہے بسیط، اک لطفِ رافت ہے عمیق

تو کوئی جادہ ہے، اور جادہ بھی کیسا منتقل　　　یا سراپا ایک عریانی ہے تو نا منفعل
نغمۂ سیّال ہے تو، یا گدازِ مُرتحل　　　کچھ نہیں ہے، ہاں مگر اک لوچ ہے تو مستقل

عرض ہے تو اک جبینِ پابندیٔ جوہر نہیں
آب ہے تو، اور پھر منت کشِ گوہر نہیں

کس طرح سمجھیں تری ہستی کا پیچیدہ نظام　　　گفتگو بھی تیری خامُش، خامشی بھی اک کلام

جامعِ اضداد ہے، پھر بھی ہے کیا حُسنِ قوام   وہ تری رفتار قائم، وہ قیام پُر خرام
کس نے ایسی چادرِ آبِ رواں تری بُنی
کون ہے وہ جس نے تیری آستیں ایسی چُنی
گاہ پاتے ہیں تجھے بیتابیٔ طوفاں خروش   اور کبھی یکسر متانت صلح پرور امن کوش
تو کوئی مجذوب ہے شوریدہ سر، دارفتہ ہوش   سچ بتایا تو کوئی سالک ہے سجادہ بدوش
کس قدر پر لطف تیری آرزو پیمائی ہے
کیسی رشک انگیز تیری کامیاب انگڑائی ہے
وہ شبِ مہ اور وہ تیری خنک رعنائیاں   نیمروز، اور وہ تری رخشاں تجلی زائیاں
صبح زریں، اور وہ تیری آئینہ فرمائیاں   شامِ رنگیں، اور وہ تیری انعکاس آرائیاں
تجھ میں بس کر رہ گئی سورج سے جو نکلی کرن
اک شعاعستاں ہے یا تیری جبیں پُر شکن
وہ نسیم صبح، اور وہ اس کی نکہت باریاں   چلنے نکلنے کے لئے موجوں کی وہ تیاریاں
وہ فضا ساحل کی زندہ جس سے ہوں میخواریاں   اور پھر بینیِ نظر، اف اف ہزاروں ساریاں
اللہ اللہ، آج سارا کافرستاں ڈھل پڑا
گویا آذر خانہ دامانِ سحر سے کھل پڑا
تیرے دامن میں خراماں آفتیں ہیں کس قدر   کتنے فتنے ہیں بپا ساحل پہ تیرے بے خبر
اُنی دوشیزہ نگاہیں اور یہاں بس اک جگر   کس کو دوں اب تو ہی بتلا اور کروں کس سے حذر
کیا دکھاتی ہے کمندیں موج کی ٹوٹی ہوئی
دیکھ ادہر ساحل پہ زلفیں سینکڑوں چھوٹی ہوئی

ہاتھ میں جس کے ہے اک پھولوں کی ڈالی دیکھ لے　　تنگ کف پر جس کے ہے ، ریشم کی جالی دیکھ لے
کان میں جس کے نہیں ہے کوئی بالی دیکھ لے　　پان کی اب بھی ہے جس کے لب پہ لالی دیکھ لے

"چتو نیں لہسا کی بھری" اسکی کھلادیں کچھ مجھے
ہاں اُسی کے "مدھ بھرے ینناں" پلادیں کچھ مجھے

ہے گھنی پلکوں میں آرامیدہ یوں مضطر نگاہ　　جس طرح تھک کر ہرن نے لی ہو سایہ میں پناہ
وہ بیاضِ شانہ پر آسودہ گیسوئے سیاہ　　وہ جبینِ صندلیں ، دوشیزگی کی جلوہ گاہ

ہے کمر ہر وقت آمادہ لچکنے کے لئے
کمسنی تیار رہے ہر دم جھجکنے کے لئے

لب وہ جن سے گویا چھوٹا ہے ابھی جامِ شراب　　وہ نمود سینہ جس میں بند طوفانِ شباب
شوخ آنکھیں اور وہ ہلکے رنگ کا ہلکا نقاب　　مچھلیاں جیسے تڑپتی پھر رہی ہوں زیرِ آب

جسم پر اس کے ہے کچھ ساری کی تزئیں اس طرح
ہو ضیائے شمع سے فانوس رنگیں جس طرح

حسن سنجیدہ ہے اس کا با سراپا دیویت　　چال ہے یا ہے خرامِ پیکرِ موسیقیت
ہے چھریرا جسم اس کا یا مجسّم شعریت　　اُس کی پیشانی ہے یا اک جلوۂ معصومیت

شعر و موسیقی ہے وہ ، دیویت و عصمت ہے وہ
بہترین تصنیف فطرت ، یعنی اک عورت ہے وہ

اس کی ہر حرکت تکلم ، ہر ادا نطقِ عیاں　　رنگ ہے یا جلد کے نیچے تبسم ہے رواں
سینہ سے آنچل ڈھلک آنے کا وہ نادم سماں　　کیا قیامت ہیں جوانی کی بھی یہ مجبوریاں

نیند سی آتی ہے مجھکو زلف شبگوں دیکھ کر
اور وہ خمیازۂ چشم پر افسوں دیکھ کر

یہ نہیں خواہش کہ وہ لطف و عنایت ہی کرے میں نہیں کہتا کہ وہ مجھ سے محبت ہی کرے
وہ ستم مجھ پر کریں وہ مجھ سے نفرت ہی کرے ظلم ہی مجھ پر کرے، برباد حسرت ہی کرے

یعنی قدموں تک وہ اپنے مجھکو اف آنے تو دے
اور وہاں اک "آہ" کرکے مجھ کو مرجانے تو دے

نقاد دسمبر ۱۹۱۴ء ص ۴۸-۴۹-۵۰

"جگنو"

اے وجودِ مشتعل اے ہمعنانِ سوزِ آہ
اے سراپا جستجو، اے عاشقِ گم کردہ راہ

صحنِ گلشن میں ترے راتوں کی او یہ بجلی
یک جہاں نطق و شورش آہ تیری خامشی

مختصر ہستی تری اور یہ [illegible] ریزیاں
آگیا پھر پھونکنے دنیا کو اے برقِ آشیاں

تو کوئی اقلیم شب میں روز کا جاسوس ہے
یا کوئی تو شمع ہے جو فارغ از فانوس ہے

ہر نہالِ دشت پر ہے اس قدر کیوں جلوہ بار
سچ بتا کیا وادیٔ ایمن کی ہے تو یادگار

یہ تری رہ رہ کے تابش کیا تکلم ہے ترا
یہ تری موجِ ضیا ہے یا تبسم ہے ترا

ہے نوید سیرِ فرسودہ پروں کے واسطے
ہو نہ ہو یا تو ہم سے دیوانہ سروں کے واسطے

دامنِ زہرہ سے ٹوٹا بادلہ کا تار ہے
شب کی زلف پرشکن یا آج افشاں بار ہے

جم گیا ہے حور کا تارِ نظر آکر کوئی
یا شعاعِ ماہ ٹوٹی ہے گرہ کھا کر کوئی

ابر میں وہ تیری پروازِ طلائی کی بہار
دے کے خط جیسے کسوٹی پر کسے سونا سونار

تو کوئی بوتہ زرِ محلول سے لبریز ہے
یا شرارِ آہِ بلبل کی تو جست و خیز ہے

نغمۂ فردوس کی تو کوئی مُرکی تو نہیں
دامنِ لیلائے شب کی کوئی چٹکی تو نہیں

باغ میں تو لینے آیا ہے زرِ گل کا سراغ
چوریاں کرتا ہے ظالم ہاتھ میں لیکر چراغ

دیکھ میری پھبتیوں پر مشتعل ہونا نہ تو
آشنا کی بات سے آزردہ دل ہونا نہ تو

تجھ سے اے شب تاب مجھکو الفت دیرینہ ہے
مجھ پہ تیرا تجھ پہ میرا حال سب آئینہ ہے

عہدِ طفلی کی وہ بازی گاہ الفت یاد ہے
بیمروت تجھ کو وہ فانوس دامن یاد ہے

کنج کے اندر کبھی اور کنج کے باہر کبھی
گھاس پر ملتا کبھی تو اور گلبن پر کبھی

وہ مری ٹوپی میں شب کو جگمگانا یاد ہے
سر پہ میرے تجھ کو اپنا آشیانہ یاد ہے

گو میں فرطِ غم سے یکسر ہستیٔ ناکارہ ہوں
لیکن اب بھی دیکھکر تجھ کو تپش آمادہ ہوں

کیوں مگر رہنے لگی تجھکو بھلا ایسوں کی یاد
تو کہاں اک برق زادہ اور میں خاکی نژاد

۱۹۱۵ء

غزل

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنار دوست — قایم رہے کہیں خلش انتظار دوست

کچھ کچھ ہمارے دل کو سکوں ہو چلا تھا پھر — یہ تونے کیا کیا نگہ بے قرار دوست

سب شکوے دل کے مٹ گئے بس اک جواب میں — اف رے فریب وعدۂ نا استوار دوست

غربت کے دن بھی کٹ ہی گئے خیر شکر ہے — اچھا مرا سلام ہے یاد دیار دوست

ہاں ، ہر خلش جنوں کدۂ اضطراب دل — واں ہر نگہ کرشمۂ بے اختیار دوست

اے وائے صد ہزار تمنائے مضطرب — خلوت میں بھی وہی ہے فریب وقار دوست

گو تم نے لاکھ کام لیا ضبط سے نیاز — پہچان ہی گئی نگہ ہوشیار دوست

نقاد اپریل ۱۹۱۲ء صد ۳

غزل

عیاں ہے سب پہ کہ دل کو ذرا قرار نہیں — کہوں یہ کیسے مجھے ان کا انتظار نہیں

میں تم کو دیکھ کے اللہ جانے کیوں چپ ہوں — یہ کیسے جانا کہ دل میرا بے قرار نہیں

یہی ہیں کیوں نہ کہوں تیرا حسن ہی ہے بلا — یہ کیوں کہوں کہ مجھے دل پر اختیار نہیں

گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھیے کہ دل پہ مجھے — ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں

عزیزو ڈال دو اب میرے منہ پہ تم چادر — اور ان سے کہہ دو کہ اب مجھ کو انتظار نہیں

نیاز صبر کرو ہو گیا ہے کیا تم کو

زمانہ روتا ہے پر ایسا زار زار نہیں

نگار ۱۹۲۲ء

انتساب

اک نازنیں رشکِ قمر کشتی میں محوِ خواب ہے
پرتو سے جس کے سطحِ آب اک چادرِ سیماب ہے

کشتی ہے روئے آب پر اور اس میں حسنِ صبح زا
ہے برگِ نیلوفر پہ یا اک قطرۂ شبنم پڑا

کشتی تموّج میں ہے یا مضطر ہے چشمِ نیم وا
کشتی میں ہے وہ برق وش ہو آنکھ میں جیسے ضیاء

یہ حسنِ سیمیں اور یہ رنگینیٔ کیفِ شباب
بت ساز نے بلّور کے پیکر میں بھر دی ہے شراب

ابرو میں پورا خم لئے صیدِ زبوں کے واسطے
رخسار میں بجلی لئے صبر و سکوں کے واسطے

آویزہ اس کے کان کا عارض پہ ہے ٹھیرا ہوا
درجِ صدف سے یا کوئی موتی ڈھلک کر رہ گیا

چوٹی ہے یا دو ناگنیں باہم دگر مالوف ہیں
یہ لب ہیں یا دو پنکھڑیاں اک پھول کی ملفوف ہیں

آنکھیں ہیں بند اس پر بھی ہے یہ راز ان کا برملا
اندر ہی اندر سحر ہے سانچے میں ان کے ڈھل رہا

اک ہاتھ نیچے سر کے ہے اور دوسرا سینہ پہ ہے
بادل میں ہے اک جوئے شیر اور ایک آئینہ پہ ہے

گردن ہے شانہ تک کھلی سینہ کمر تک بے حجاب
کیا جانئے منظور ہے فطرت کو اب کیا انقلاب

کشتی جو ساحل سے لگی تو ہو گئی بیدار وہ
اور اس طرح دیکھا مجھے گویا کہ ہے بیزار وہ

کہنے لگی "تو کون ہے کیا اس فضا میں تیرا کام
بولا میں "تجھ سے رکھتا ہے اک گونہ نسبت یہ غلام

"جلوہ ہے تو میں ہوں نگہ، تو برق ہے خرمن ہوں میں"
"تو پھول ہے بلبل ہوں میں گوہر ہے تو دامن ہوں میں"

تو حسن ہے میں عشق ہوں تو آگ ہے میں ہوں گداز"
"تو بادشاہ میں ہوں گدا، تو ناز ہے میں ہوں نیاز"

یہ سن کے وہ ہنسنے لگے اور پھول برسانے لگی
پھر مجھ کو یہ سب دے گئی جب لوٹ کر جانے لگی

ان خندہ ہائے حسن کی کرتا ہوں قائم یادگار
یعنی انہیں پھولوں کا ہے چھوٹا سا گلدستہ نگار

(نگار فروری سنہ ۱۹۲۲ء)

غزل فارسی

عرضہ مدہ کنوں بہ او طرحِ فسونِ ناز را   اے کہ خراب ساختی از نگہت نیاز را
شمع کجا بہ بزم او بینم وہاں ز دیدہ من   می شنوم فسانۂ جلوہ جاں گداز را
تو ہمہ غفلت آمدی عشق فسوں پذیر را   من ہمہ شوق آمدم حسن کرشمہ ساز را
خوش سحرے کہ خواب را ختم کنی و من چشم   از دو لبم شراب آں نرگس نیم باز را
گر نہ رسد بہ دیگراں جور خلوص پرورت   من نہ کنم گہے گلہ لطف ستم طراز را
من بہ حضور خلوتت گریہ چساں فرو خورم   آہ، کجا بزم کنوں سیل نوائے راز را
شد سحرے ولے چہ شد من بردم بخوابِ مرگ   ہاں، ندہم زکف کنوں، زلف شبِ دراز را
دست ہمیں کشم از و، آہ، ولے علاج چیست   ایں دل بیقرار و آں چشم فسوں طراز را
آنچہ بدیگراں کن، آں بدل نیاز ہم   اوز تو خواست اندکے شیوہ امتیاز را

(مارچ ۱۹۲۲ء)

توئی زاہد او ہوشے و کنار امن کوشے   من و لغزشے و سیل نم چشم میفروشے
نگہ ستم بر ستم، چہ شود، خبر ندارم   ز نگاہِ کیف پرور اگر گہی تو نوشے
چہ زید کسے بہ عہد نگہ کرشمہ سازت   کہ چکد ہزار بابل ز نگاہ سحر کوشے
چو شد ست حق پسندے بہ ہمیں مقال واعظ   نہ وہی مرا خدایا، سرگوش حق نیوشے
نہ نیاز ہم ربودے دل پر سکوں چو دیدے
سحر بیاض گردن قمر برہنہ دوشے

(اپریل ۱۹۲۲ء صـ۲۹)

ایک غزل اور مختلف آہنگ

(شعراء متقدمین کے رنگ میں)

جب قفس میں مجھ کو یادِ آشیاں آجائے ہے
سامنے آنکھوں کے اک بجلی سی لہرا جائے ہے

میرے اوراقِ کتابِ زندگانی ہائے ہائے
جیسے بن دیکھے کوئی ان کو الٹتا جائے ہے

دل مرا وہ خانۂ ویراں ہے اجل بجھنے پہ بھی
راکھ سے جس کی دھواں تادیر اٹھتا جائے ہے

میں نہ کہتا تھا کہ تابِ دید کا کیا اعتبار
آج لے، اے دل ترا یہ بھی سہارا جائے ہے

تم تو ٹھکرا کر گزر جاؤ، تمہیں ٹوکے گا کون
میں پڑا ہوں راہ میں تو کیا تمہارا جائے ہے

چشم تر ہے اُس طرف اور اِس طرف ابرِ بہار
دیکھنا ہے آج کس سے کتنا رو یا جائے ہے

ہائے جو گھر رات بھر جلتا رہا ہو، صبحدم
اس کی ویرانی کا منظر کس سے دیکھا جائے ہے

میں تو بس یہ جانتا ہوں اس کو ہونا ہے خراب
کیا خبر اس کی مجھے، دل جائے ہے یا آئے ہے

کون ہے دُنیا میں اب مجھ سے زیادہ نامراد
ہائے وہ "میں" جو تری نظروں سے گرتا جائے ہے

شمعِ محفل جل بجھی، پر یادگارِ بزمِ دوش
جا بجا اب بھی پرِ پروانہ پایا جائے ہے

ہاں، اسی کو لوٹ کر آنا نہیں ہوتا نصیب
تجھ سے پھر ملنے کی جو لیکر تمنا جائے ہے

میرا پندارِ خدائی اس گھڑی دیکھے کوئی
جب مجھے بندہ ترا کہکر پکارا جائے ہے

اب وہ کیا آئیں گے تم بھی آنکھ جھپکا لو نیاز
صبح کا تارہ بھی اب تو جھلملاتا جائے ہے

(مومن و غالب سے لیکر مصحفی، جرأت، جعفر علی خاں حسرت، دانش، جلال، نسیم، داغ و حسرت موہانی تک)

منزلِ خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے
ہوش کھوتا جائے ہے، پردہ سا اٹھتا جائے ہے

قصۂ کشتی و ساحل! ناخدا تو ہی بتا
کون ان دونوں میں کس سے دور ہٹتا جائے ہے

جو نہ مرنے دے نہ جینے دے، دمِ رخصت وہ شوخ
اک نگہ ایسی بھی ہم پہ صرف فرما جائے ہے

راستہ جو دیر کو جاتا ہے اے شیخ حرم
جائے ہے کعبہ کو بھی وہ اور سیدھا جائے ہے

التفاتِ دوست مانا وجہ تسکیں ہے مگر
ہاتھ رکھ کر وہ تو دل کو اور تڑپا جائے ہے

اے وہ نقشِ نامرادی ہی سہی، پر کیا کروں
بیٹھ کر محفل میں اس کی کس سے اٹھا جائے ہے

محو ہو جاتے ہیں سارے شکوہ ہائے دردِ دل
سامنے جس دم وہ جانِ آرزو آجائے ہے

جاں گسل ہے گو بہت ترکِ محبت کا خیال
لیکن اس پیمانِ شکن کو یوں بھی چاہا جائے ہے

حسن کا ہوگا تعلق دیکھنے سے بھی ضرور
اپنے مشرب میں تو اس کو صرف سمجھا جائے ہے

بتکدہ اور کعبہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے
بتکدہ بنتا ہے خود کعبہ بنایا جائے ہے

کرکے توبہ دیر سے جاتا ہوں جب سوئے حرم
دیر تک خود کعبہ آکر مجھ کو پہنچا جائے ہے

ذوقِ تخلیق برہمن کی بلندی دیکھئے
بت بناتا جائے ہے، سجدہ بھی کرتا جائے ہے

انتظار ان کے کرم کا ہے کچھ ایسا انتظار
کھنچ نہیں سکتا ہے، لیکن پھر بھی کھنچا جائے ہے

تو کہ ہے ہر نقش پا تیرا چراغِ رہگزر
مجھ سے چھپ چھپ کر کہاں راتوں کو جایا جائے ہے

---

(۲) مرکب تشبیہات اور سخن گسترانہ تعبیرات

صرف اک لرزش ہے نوکِ خار پر شبنم کی بوند
پھر بھی اس فرصت پر اس کی مجھ کو رشک آجائے ہے

میری تنہائی نہ پوچھو، جیسے کوئی نقشِ پا
دور صحرا کے کسی گوشہ میں پایا جائے ہے

سنگ کیا ہے بس سراپا انتظارِ بت تراش
زندگی کا خواب لو گو یوں بھی دیکھا جائے ہے

شب کا وہ پچھلا پہر اور پھیکی پھیکی چاندنی
رات بسکر جیسے کوئی ہار کمھلا جائے ہے

اس تصور سے کہ میرے انکے لب ہوں متصل
ایک نقطہ پر سمٹ کر زندگی آجائے ہے

رات کی تنہائیاں اور ان کی آمد کا خیال
چاند جیسے روح کے اندر سے گزرا جائے ہے

اس سہی قد کا خرامِ ناز وہ فتنہ ہے جو
ہر قدم پر اک نئے سانچہ میں ڈھلتا جائے ہے

ان کی آنکھوں کا تبسم آج رکتا ہی نہیں
ساغرِ لبریز جیسے کوئی چھلکا جائے ہے

اب یہ حالِ دل ہے جیسے رکھ کے کانٹوں پر نیاز
ریشمی چادر کو بیدردی سے کھینچا جائے ہے

(محبوب کا جسمانی تصور اور محاکات و معاملات)

ہاتھ سے لیتی ہے اس کے اور لوٹا جائے ہے — ورنہ مہندی میں کہاں یہ رنگ پایا جائے ہے
ہو برا تیرا نگاہِ شوق وہ جانِ حیا — دیکھ تو کیسا پسینہ میں نہایا جائے ہے
وہ خنک سی تابناکی اس کے رنگِ جسم کی — مجھ کو تو اس چاندنی میں نیند سی آجائے ہے
یہ تناسب ہے ترے اعضا کا یا جوشِ شباب — جتنا بڑھتا جائے ہے، کانٹے پہ تلتا جائے ہے
بے حجابی کا بھلا کیا ذکر میرے سامنے — جب وہ گزرے ہے تو اور آنچل کو ڈھیرا جائے ہے
مجھ کو مارا ہے اسی نوخیز نے، ہاں ہاں وہی — جو دبا کر دانت سے آنچل کا کونا جائے ہے
ہم سنانے کو سنا دیں داستانِ غم مگر — کس سے ان بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھا جائے ہے
اُف رے وہ ٹھنڈا سا اور ہلکا سا نم جو بعد غسل — سوکھ جانے پر ترے بالوں میں پایا جائے ہے
حاصلِ صد عمرِ محرومی ہے وہ یک قطرہ اشک — جو سرِ مژگاں پہ اس کافر کے پایا جائے ہے
اس نگاہِ شرمگیں کی برق سامانی نہ پوچھ — جو اچٹ کر آئینہ سے ناگہاں آجائے ہے
آنکھ ملتے آ رہے ہیں خوابگہ سے بزم میں — تیر پہلا دیکھئے کس پر چلایا جائے ہے

(جدید رجحانات کو سامنے رکھ کر)

تار کی جھنکار ہی سے بزم تھرا جائے ہے — گاہے گاہے سازِ ہستی یوں بھی چھیڑا جائے ہے
قافلہ چھوٹے زمانہ ہو گیا لیکن ہنوز — یادِ آوازِ جرس رہ رہ کے تڑپا جائے ہے
سیل و طوفاں بن کے آ، پر ناخدا بن کر نہ آ — اے خدا اس نام سے دل میرا تھرا جائے ہے
خود زمانہ رخ ہمارا دیکھتا ہے، ہم نہیں — جس طرف مڑتے ہیں ہم دھارا بھی مڑتا جائے ہے
سر جو گردن پر نہیں تو کیا، ہتیلی پر سہی — منزلِ عشق و جنوں سے یونہی گزرا جائے ہے
روشنی ہی روشنی ہے، عہد و برق و نور ہے، — یہ مگر سایہ سا کیوں دنیا پہ چھایا جائے ہے
ہم کہاں ڈوبے تھے یہ کل پوچھئے گا آج تو — کچھ تلاطم سا ابھی موجوں میں پایا جائے ہے
مشورہ کچھ ہم سے مجبوروں کا بھی لیجئے ضرور — اے خدا عالم اگر پھر سے سنوارا جائے ہے
عقل والو کچھ کہو، یہ رشتۂ رازِ حیات — کیوں الجھتا جائے ہے جتنا کہ کھلتا جائے ہے
کل اسی آہنگ پر ہوتا ہے تعمیرِ فغاں — آج جو کچھ زیرِ لب دیوانہ کہتا جائے ہے
آ رہا ہوں دوستو، ٹھیرو، مگر یہ تو بتاؤ — مجھ کو کس گوشہ سے صحرا کے پکارا جائے ہے
میں ہوں وہ رندِ گریباں چاک اس دنیا میں جو — کچھ نہیں کہتا پہ تقدیریں پلٹتا جائے ہے (رشید ۱۹۶۰ء)

افادات نیاز

افادات نیاز ایک نظر میں

(اشاریۂ نگار)

قیصر ابن حسن

کلیات و تالیفات عامہ

عنوان	ماہ و سال	صفحات
تاریخی، علمی، ادبی، مذہبی معلومات	جنوری و فروری ۵۸ء	۱ - ۱۳۶
روس کے مدارس، اخبارات اور کتب خانے	مئی ۵۷ء	۳۸ - ۳۹
مغرب میں اخبار کیونکر مرتب ہوتا ہے	مارچ ۲۲ء	۵۱ - ۵۶
مغربی صحافت کے نوادر	جون ۳۶ء	۲۸ - ۳۲
صحافت مغرب کی حیرت ناک داستان، نیویارک ٹائمس کی ترقی کے ساحرانہ مناظر	دسمبر ۳۱ء	۷۳ - ۷۷
روس کی موجودہ صحافت	اکتوبر ۴۲ء	۲۳ - ۲۴
چینی صحافت کی ذہنیت	جون ۳۶ء	۶۷
شمالی امریکہ کے اخبارات و رسائل، اشاعت۔ ترتیب۔ پالیسی	جون ۶۱ء	۳۱ - ۳۲
بانکی پور کی لائبریری	اگست ۲۲ء	۶۶ - ۷۱
پیشین گوئیاں ــــ جنگ کی ابتدا اور انتہا کے متعلق	ستمبر ۲۳ء	ص ۲۱۱ - ۲۱۶
نوسٹراڈامس کی عجیب و غریب پیش گوئیاں	اپریل ۴۲ء	۴ - ۶
تقدیر اور گردش کواکب یا جاذبیت عامہ اور علم نجوم	مارچ ۵۵ء	۳۰ - ۳۲
کیا اجرام فلکی کی گردش کا انسان کی قسمت پر اثر پڑتا ہے؟	اکتوبر ۲۳ء	۳۰.۸
علم نجوم اور انسانی مستقبل	مارچ ۳۶ء	۶۰ - ۶۳
علم فراست الید یا سمدرک	اپریل ۲۷ء	۶۱ - ۷۰
" " "	مئی ۲۷ء	۲۴ - ۳۱
" " "	جون ۲۷ء	۲۷ - ۳۲
" " "	جولائی ۲۷ء	۴۴ - ۵۴
" " "	اگست ۲۷ء	۴۲ - ۴۶
" " "	ستمبر ۲۷ء	۴۹ - ۵۳
" " "	اکتوبر ۲۷ء	۴۹ - ۵۲
" " "	نومبر ۲۷ء	۶۲ - ۶۵
" " "	دسمبر ۲۷ء	۴۷ - ۴۹

فلسفہ

عنوان	ماہ و سال	صفحات
عالم فطرت، ماورائے علم و ادراک	دسمبر ۵۸ء	۳۱ - ۳۲
حسن اور کشاکش غمزہ	اکتوبر ۳۶ء	۲۷ - ۳۰
وقت اور زمان کی حقیقت	دسمبر ۳۱ء	۶۴ - ۷۲
سمجھ میں نہ آنے والے واقعات	مارچ ۲۸ء	۵۰ - ۵۲
محیرات	مارچ ۳۷ء	۷۲ - ۷۵
علم و عقل کی گمراہیاں۔ روحانیات پر ایک تنقیدی نظر	دسمبر ۳۲ء	۳۷ - ۴۴
روحانیین مغرب کی شعبدہ کاریاں	اکتوبر ۳۵ء	۴۱ - ۴۴

مادیین کا مذہب	فروری ۲۳ء	۱۲-۱۲۸
" "	اپریل ۲۳ء	۲۷۱-۲۷۷
کیا خدا کا وجود ہے؟	فروری ۳۲ء	۵۵-۵۹
خدا ہے یا نہیں	اگست ۵۸ء	۴۳-۴۶
خدا کے وجود کے سائنسی دلایل	مئی ۵۰ء	۴۰-۴۲
خدا کا صحیح تصور	اپریل ۵۴ء	۴۸-۵۰
خدا اور خدائی (کفر و دیندار کے نقطۂ نظر سے)	اپریل ۵۵ء	۳۷-۴۱
خدا لامذہبیت کے زاویۂ نگاہ سے	نومبر ۵۲ء	۳۰-۳۹
عہدِ حاضر کے منکرین خدا و مذہب کیا کہتے ہیں	جنوری ۵۹ء	۸۳-۱۰۳
خدا کی جستجو میں ایک زنگی لڑکی کے تجربات (شاکی ایک کتاب کی تلخیص)	اگست ۳۴ء	۱۳-۲۶
خدا کا تصور عہدِ تاریک سے لے کر عہدِ حاضر تک — مذاہبِ عالم پر بے مثل تاریخی تحقیق		
تبصرہ — (خدا نمبر)	جنوری فروری ۵۶ء	۹-۱۴
لامذہبیت یعنی مذہب ایک لامذہب کے نقطۂ نظر سے	فروری ۳۷ء	۵۱-۵۹
" " "	اپریل ۳۷ء	۳۵-۴۴
آفرینش کی اعجوبہ نمائیاں اور خلق دنیا کے حیرت انگیز مناظر	فروری ۳۳ء	۵۲-۵۴
خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا	مارچ ۵۴ء	۲۰-۲۴
مذہب و عقل کی جنگ	اپریل ۵۶ء	۴۱-۴۵
حریتِ فکر اور اشاعتِ علم کے خلاف مذہب کی جنگ	دسمبر ۳۵ء	۹-۱۳
عہد نامۂ عتیق کی روایات کا ماخذ	مئی ۳۲ء	۲۵-۳۶
" " "	جون ۳۲ء	۹-۱۸
دینِ مسیحی اور صنفِ نازک کی تحقیر	اکتوبر ۳۲ء	۲۸-۳۸
اسفار موسیٰ علوم جدیدہ کی روشنی میں	جون ۳۷ء	۹-۲۱
" " "	اگست ۳۷ء	۴۸-۵۴
" " "	ستمبر ۳۷ء	۵۳-۵۸

اسفار موسیٰ علوم جدیدہ کی روشنی میں	اکتوبر ۳۷ء	۴۱-۴
روح کی حقیقت	اگست ۵۹ء	۹-۱۲
روح و بقاء روح — علمی اور اسلامی نقطۂ نظر سے	مارچ ۴۳ء	۳-۱
بقاء روح اور حشر و نشر	اپریل ۵۵ء	۳۱-۳۴
روح و بقاء روح کی دلچسپ داستان	اکتوبر ۵۵ء	۴۵-۴۸
روح کا مذہبی اور علمی تصور	ستمبر ۵۸ء	۲۶
ایک معارضہ کے جواب میں (بقائے روح و معاد)	نومبر ۵۵ء	۳۴-۴۷
ضمیاتِ یونان و روما	ستمبر ۳۳ء	۳۵-۴۰
ہندوؤں کا علم الاصنام	اکتوبر ۳۳ء	۲۶-۴
علم الاصنام پر ایک اجمالی تبصرہ	اگست ۳۳ء	۵۹-۶۴

اسلام

مذاہبِ عالم میں اسلام کا مرتبہ	جنوری ۵۹ء	۱۴-۲
اسلام کا صحیح نظریہ	جولائی ۵۷ء	۴۵-۱
نظریۂ اسلام میری نظر میں	ستمبر ۵۳ء	۴۷-۵
مستشرقیات اور علمائے مغرب	مارچ ۲۵ء	۴۷-۲
علومِ اسلامی اور علمائے اسلام	جنوری فروری ۵۵ء	۹-۱۰
" " "	جولائی ۵۵ء	۱-۲
علومِ اسلامی پر ایک مؤرخانہ نظر	مارچ ۲۲ء	۳۷-
" " "	جنوری ۲۹ء	۸۱-
" " "	جنوری فروری ۴۸ء	۱۱۹-۸
" " "	جولائی ۵۴ء	۵-
اندلس کے آثارِ علمیہ یورپ میں	دسمبر ۲۴ء	۳۷-۳
" " "	جنوری فروری ۴۸ء	۱۲۶-۱
قدیم تمدنِ اسلام کی تازگی	مارچ ۴۴ء	۹-
" " "	جنوری فروری ۴۸ء	۱۸۴-۹
اسلام اور جمہوریت	مئی ۶۱ء	۶-

مذہب اور خدا کا تصور (عقل و فکر کے نقطۂ			خلا، قرآن اور محمدؐ یا		
نظر سے)	اکتوبر ۵۳ء	۴۱-۴۷	محمدؐ، قرآن اور خدا	اکتوبر ۵۹ء	۳۳ - ۴۳
حق اللہ کوئی چیز نہیں	جنوری ۵۹ء	۳۲-۳۴	حروبِ صلیبیہ کا ایک اہم واقعہ —		
اسلامی روایات کا خرافیاتی عنصر	مئی ۵۵ء	۲۴-۲۸	رسول اللہ کے جسدِ مبارک کو لیجانے کی		
معجزہ و علم غیب	جنوری ۵۹ء	۱۲۷-۱۳۱	کوشش (تاریخ کے نقطۂ نظر سے)	اپریل ۴۴ء	۲۳ - ۳۶
عالم برزخ — غیر اسلامی و قرآنی			مسئلہ خلافت و امامت	جنوری ۳۴ء	۴۹ - ۹۶
نقطۂ نظر سے	اگست ۵۹ء	۳۲-۳۶	مسئلہ خلافت و امامت		
باغِ ارم	اگست ۵۸ء	۵۱	(میرے نقطۂ نظر سے)	فروری ۳۶ء	۱ — ۲۴
جنت الحمقا — فردوس کے حاملانِ نغمہ و سرود	دسمبر ۵۸ء	۳۴-۳۷			
جہنم کے اژدہوں اور کوڑوں سے دور	دسمبر ۵۶ء	۳۰-۳۶	**علوم اجتماعیہ**		
عہدِ عباسیہ کے مختلف دلستانِ خیال (معتزلہ،			تمدنِ جدید کی دردناک داستان	جولائی ۲۲ء	۳ - ۴
اشعری، صوفیت، شیعہ، قرامطہ اور نصیری)	مئی ۵۵ء	۵-؟	تمدنِ جدید کی دردناک داستان		
نزاعِ دیر و حرم	دسمبر ۵۵ء	۴۱-۴۳	تہذیب و شائستگی کے صحیح خط و خال	جولائی ۵۶ء	۳۷ - ۴۲
عہدِ اسلام میں کنیزوں کا اثر و اقتدار	نومبر ۳۱ء	۳۸-۴۴	تاریخ تمدنِ حدیث کا ایک باب	مارچ ۲۲ء	۳ - ۸
" " "	جنوری، فروری ۵۹ء	۲۲۷-۲۳۲	" " "	اپریل ۲۳ء	۳ - ۷
عہدِ اسلامی کے غلام اور کنیزیں	مارچ ۶۰ء	۹-۱۱	زندگی اب سے دس سال بعد	ستمبر ۵۶ء	۲۶ - ۳۰
رسمِ غلامی اور اسلام	مئی ۶۲ء	۶-۸	دنیا آئندہ ۲۵ سال میں	جون ۵۶ء	۴۹ - ۵۰
ابو الہذیل معتزلی امام کی مناظرانہ فراست	مئی ۶۲ء	۲۷-۲۹	داستانِ شاہین و کنجشک		
حضرت میرزا غلام احمد — (احمدیت)			(اادارہ فحاشی اور ایک لڑکی کبھی		
احمدی جماعت	ستمبر ۶۱ء	۲۷-۳۲	ہوجانے کے بعد)	دسمبر ۵۵ء	۲۴ - ۳۱
احمدی جماعت اور میں	دسمبر ۵۹ء	۳۹-۴۰	بعض تاریخی کسبیوں کے خطوط		
میں اور احمدی جماعت	دسمبر ۶۰ء	۲۸	(السفران)	دسمبر ۳۵ء	۴۵ - ۴۶
چند گھنٹے قادیان میں	ستمبر ۶۰ء	۲۱-۲۳	زنگاری یا جپسی جماعت کے دلچسپ		
ولادتِ نبوی کی صحیح تاریخ	جنوری ۲۹ء	۹-۱۴	حالات۔	فروری ۲۴ء	۱۲ — ۱۹
مسلمانوں کا یوم النبی			خودکشی		
(ولادتِ نبوی کی صحیح تاریخ)	دسمبر ۵۲ء	۲۵-۲۸	(نفسیاتی روشنی میں)	مئی ۳۶ء	۳۴ — ۴۲
ولادت و ہجرتِ نبوی کی صحیح تاریخ۔			بعض دلچسپ اعداد و شمار	نومبر ۳۶ء	۷۵ - ۷۶
(دہریت کے نقطۂ نظر سے)	دسمبر ۲۲ء	۱۰۸-۱۱۸	ہندوستان کی آبادی ۱۹۵۱ء	جون ۵۳ء	۴۱ — ۴۲
			لزمیات ۱۹۴۸ء چند سیاسی اصطلاحیں	اپریل ۴۸ء	۹ — ۱۸

بعض سیاسی تحریکات	جون ۳۶ء	۴۶-۵۱	سوئٹزرلینڈ کا سلوک بیکاروں کے ساتھ	دسمبر ۳۵ء	۹ - ۱۷
سیاسیات یورپ (ان سائٹ یورپ سے ماخوذ)	فروری ۳۸ء	۴۸-۵۹	نازی حکومت اور مزدور	اگست ۴۰ء	۹ - ۱۱
〃	مارچ ۳۸ء	۳۰-۳۹	افراط زر کاغذی کی حیرت ناک مثال	نومبر ۴۷ء	۵۲ - ۵۳
〃	اپریل ۳۸ء	۲۶-۳۴	چین کی موجودہ اقتصادی مشکلات		
〃	جون ۳۸ء	۴۹-۵۶	اور سکہ کاغذی کی افراط	جولائی ۴۴ء	۴۲ - ۴۴
〃	جولائی ۳۸ء	۲۸-۳۴	اسٹالن اور ویلز (ایچ۔جی۔ویلز) کی تاریخی ملاقات — فلسفۂ اشتراکیت		
〃	اگست ۳۸ء	۴۲-۴۵			۵
〃	ستمبر ۳۸ء	۲۵-۳۱	ایک ماہر اشتراکیت کی زبان سے)	مئی ۵۳ء	۱۸ - ۲۵
〃	اکتوبر ۳۸ء	۲۹-۳۶	ایک نہلسٹ کی زندگی کے کچھ واقعات	فروری ۳۳ء	۵۹ - ۴
〃	نومبر ۳۸ء	۵۲-۵۴	اشتراکیت	فروری ۲۴ء	۷۳ - ۷۶
〃	دسمبر ۳۸ء	۴۸-۵۲	اشتراکیت حربی (نظام حکومت و اقتصاد جنگ کے زمانے میں)	جون ۲۲ء	۶۳ - ۶۹
حکومت پاکستان کی خدمت میں بصد معذرت (ایک مفروضہ جو خدا کرے جھوٹ ہو)	ستمبر ۵۲ء	۳-۵	سوشلسٹوں سے!		
استقلال قومی	دسمبر ۲۲ء	۳-۸	(ایک امریکن سرمایہ دار کا نقطۂ نظر)	ستمبر ۳۶ء	۷۰ - ۷۳
استقلال قومی کے عناصر ثلاثہ (حکومت، صحافت اور جامعہ ملیہ کی اہمیت)	جنوری ۲۳ء	۳-۷	فوضویت (انارکزم)	مارچ ۲۲ء	۱ - ۸
			انارکزم آنسہ می کے نقطۂ نظر سے	جنوری ۲۴ء	۶ - ۱۰
حیات قومی کے اجزائے ترکیبی	جولائی ۲۸ء	۵-۸	مارشل پلان کی حقیقت		
مشرق ادنیٰ کی سیاسیات پر برطانوی اثر	ستمبر ۳۹ء	۹-۱۴	(ڈی۔ای۔ٹیسکی) تاس ایجنسی	اپریل ۴۸ء	۱۶ - ۱۹
و اشتریہ سویم میوک سنگھ	مئی ۴۸ء	۱۷-۲۰	مارشل پلان کا اثر روس پر	اکتوبر ۴۹ء	۴۶ - ۴۷
اقتصادی استغنا کی ایک مثال	جنوری ۴۶ء	۱۱۱-۱۲۷	تاوان جنگ کا اثر تجارت و اقتصاد پر	اکتوبر ۲۲ء	۳ - ۸
وقت کا سب سے بڑا مسئلہ	مئی ۴۱ء	۱۷-۲۲	ہندوستان کا قرض انگلستان پر		
سرمایہ و عمل کی جنگ	اکتوبر ۲۵ء	۶-۱۲	(اسٹرلنگ بیلنس)	اگست ۴۵ء	۵ - ۱۳
دنیا کا مستقبل	نومبر ۴۹ء	۴۲-۴۶	جرمنی حرب و تجارت کا ایک راز	فروری ۲۲ء	۵۷ - ۶۳
انگلستان کی اقتصادی بدحالی — جنگ کے اثرات			آئندہ جنگ اور بیوپاری صنعت و تجارت	ستمبر ۳۹ء	۳۸ - ۴۳
مابعد۔	نومبر ۴۷ء	۲۱-۲۳	روس کی پنج سالہ اسکیمیں	اپریل ۵۰ء	۲۰ - ۲۸
برطانیہ کا اقتصادی بحران	مارچ ۴۸ء	۳۶-۳۸	امریکہ کا ڈالر اور روس کی جنگی تیاریاں	جون ۵۱ء	۲۵ - ۲۶
بھوکا اور بیمار ہندوستان	دسمبر ۴۹ء	۵۷-۵۸	دنیا کا دائمی امن و سکون	مارچ ۴۸ء	۲۸ - ۳۰
ترکی کا اقتصادی مستقبل	مارچ ۳۳ء	۵۰-۵۲	اعلیٰحضرت کا ایک اور فرمان		
مجیدہ حافظ کا تارمعی (امریکہ)	مئی ۴۸ء	۲۷-۳۹	عظمت نشان	اکتوبر ۳۹ء	۶۲ - ۶۴

علومِ نظری

فنونِ جمیلہ　　　ادب

مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر تبصرہ	جون ۳۳ء	۹ - ۲۴
مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر سرسری تبصرہ	جولائی ۳۳ء	۹ - ۲۰
" " "	اگست ۳۳ء	۹ - ۱۲
نادرات: آسکر وائلڈ کی تصانیف کے چند اقتباسات)	جنوری ۳۷ء	۱۳۸ - ۱۴۴
نادرات وائلڈ: آسکر وائلڈ کی تصانیف سے چند اقتباسات)	اکتوبر ۵۹ء	۱۱ - ۱۵
آسکر وائلڈ کے متعلق بعض انتقادی مذاکرات	ستمبر ۳۶ء	۹ - ۱۷
آسکر وائلڈ کے خطوط	جنوری ۳۷ء	۱۲۱ - ۱۲۸
ایران اور ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر	اگست ۲۳ء	۱۰۸ - ۱۱۱
" " "	ستمبر ۲۳ء	۱۸۶ - ۱۹۰
ڈانٹے ۱۲۶۵ء — ۱۳۲۱ء	نومبر ۲۳ء	۳۴ - ۳۷
حکومت اسلام اور سنسکرت	اپریل ۲۱ء	۷۱ - ۷۳
ہندی شاعری کی تاریخ	جولائی ۲۱ء	۱۴ - ۲۸
" " "	اگست ۲۱ء	۲۴ - ۳۲
" " "	ستمبر ۲۱ء	۱۷ - ۲۹
ہندی شاعری	اکتوبر ۲۴ء	۴۴ - ۵۲
ہندی شاعری کی تاریخ	جنوری ۳۶ء	۱ - ۴۶
ہندی شاعری کی بعض نادر تشبیہات	جنوری ۳۶ء	۴۷ - ۴۸
ہندی شاعری اور جذبات محبت	جنوری ۳۶ء	۱۲۷ - ۱۴۳
رامائن و مہابھارت	جنوری ۳۶ء	۵۴ - ۵۷
آلہا اودل - ہندوستان کے قدیم راجپوتوں کی ایک رزمیہ داستان	اگست ۴۴ء	۴ - ۸
ہندی شاعری کا مشہور رزم گو شاعر (بھوشن)	جنوری ۳۶ء	۱۲۳ - ۱۲۶
زمانۂ حال کی ہندی شاعری	مارچ ۲۵ء	۳۶ - ۴۰
انجمن ترقی اردو اور حیدرآباد	جون ۴۷ء	۲۹ - ۳۳
قدیم تذکرے	جون ۵۶ء	۱۳ - ۱۶
اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ	جنوری ۳۵ء	۳ - ۵۶
عہد بہ عہد اردو زبان و شاعری کا ارتقا	جنوری ۳۵ء	۲۲۵ - ۲۳۴

ہر دور کے قابل ذکر شعرا (اردو)	جنوری ۳۵ء	۴ ، ۲۳۴
ہر دور کے مشہور یا بہترین شاعر	جنوری ۳۵ء	۲۳۵
اردو غزل گوئی ولی سے عہد حاضر تک (ایک سرسری تبصرہ)	جنوری، فروری ۵۵ء	۴ - ۱۶
غزل گوئی اور ترقی زبان پر عہد بہ عہد تبصرہ	جنوری ۳۵ء	۱۵۳ - ۱۶۴
ہر دور میں چوٹی کا ایک ایک غزل گو شاعر	جنوری ۳۵ء	- ۲۳۵
دلی اسکول کے چار بڑے شاعر	جون ۶۱ء	۱۲ - ۱۶
نظیر میری نظر میں	جنوری ۴۰ء	۵ - ۱۶
سید محمد میر سوز - دہلی کا ایک شاعر جس کو دنیا نے بہت کم یاد رکھا	نومبر ۳۴ء	۹۷ ، ۷۸
دہلی کے وہ شعرا جو لکھنؤ یا جوار لکھنؤ کی طرف گئے	جنوری ۳۵ء	۱۹۰ - ۱۹۱
انشا اور جرأت	دسمبر ۶۰ء	۴۵ - ۴۸
وہ مشہور شعراء جو اودھ یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے یا ان کا نشو و نما یہاں ہوا۔	جنوری ۳۵ء	۲۰۷ - ۲۰۸
لکھنؤ کی شاعری لکھنؤ اسکول کے قیام سے قبل یعنی اودھ کا سب سے پہلا جذبات نگار شاعر — نواب آصف الدولہ بہادر	جنوری ۳۵ء	۱۳۷ - ۱۵۰
لکھنؤ کا نہایت مشہور شاعر جس نے صرف گیارہ شعر کہے - ناسخ	جنوری ۳۵ء	۱۰۲
لکھنؤ کے عہد شباب کی ایک شاعرہ نواب حجاب بیگم	اکتوبر ۲۶ء	۳۵ - ۳۸
لکھنؤ کی صحیح رنگ کی شاعری اور سجاد بید مرحوم	فروری ۲۸ء	۸۱ - ۸۶
فصاحت لکھنوی کی اصلاحیں	نومبر ۳۴ء	۶۰ - ۶۲
اغلاط آتش	اپریل ۶۰ء	۱۰
میرا اولین تعارف غالب سے	مارچ ۶۰ء	۱۷ - ۲۰
چند لمحے غالب کے ساتھ — جہنم میں	نومبر ۶۰ء	۴۱ - ۴۵

غالب، ولی بادہ خوار	جنوری ۶۱ء	۵۷ - ۶۵	چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے	جون ۶۳ء	۳۰ - ۴۱
غالب ایک صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے	نومبر ۵۲ء	۲۲ - ۲۸	اکبر الہ آبادی	نومبر ۶۱ء	۴۱ - ۴۶
غالب کا آہنگ و لب و لہجہ	جنوری ۶۱ء	۱۰۳ - ۱۱۰	دگیر اکبر آبادی مرحوم	جولائی ۴۴ء	۴۰ - ۴۲
غالب کا طرز شاعری	جنوری ۶۱ء	۳ - ۷	اقبال کا ذہنی ارتقا	جنوری ۶۲ء	۲۱ - ۲۹
غالب کا نہاں خانۂ ازل	جنوری ۶۱ء	۴۲ - ۶۰	اقبال کے سیاسی رجحانات	جنوری ۶۲ء	۳۴ - ۴۱
غالب کی شاعرانہ خصوصیات	جنوری ۶۱ء	۹ - ۵۶	اقبال شاعر کی حیثیت سے	مئی ۶۱ء	۲۲ - ۲۶
غالب کی مثنوی نگاری	نومبر ۵۵ء	۲۸ - ۳۳	اقبال کا رنگ تغزل	جنوری ۶۲ء	۶۵ - ۷۴
غالب کی مثنوی نگاری	جنوری ۶۱ء	۸۱ - ۸۸	اقبال کا فلسفۂ خودی	جنوری ۶۲ء	۴۸ - ۵۴
مشکلات غالب	جولائی ۵۶ء	۴۳ - ۵۲	اقبال کا فلسفۂ خودی	مئی ۵۲ء	۲۶ - ۴۴
″	اگست ۵۷ء	۴۱ - ۴۸	اقبال کا فلسفۂ خودی (علمی نقطۂ نظر سے)		
″	ستمبر ۵۷ء	۴۴ - ۴۹	بانیٔ اسلام کی وہ تعلیم جسے ہمارے موجود؟		
″	اکتوبر ۵۷ء	۳۷ - ۴۴	علمائے اسلام نے جسے کم سمجھا	اکتوبر ۵۳ء	۱۲ - ۱۵
″	نومبر ۵۶ء	۳۷ - ۴۴	اقبال کی زندگی کا خاکہ	جنوری ۶۲ء	۹
″	مارچ ۵۷ء	۴۱ - ۴۴	اعترافات ——— ریاض کی شاعری کے		
″	اپریل ۵۷ء	۲۵ - ۳۲	منتخب	جنوری، فروری ۳۳ء	۲ - ۱۰
″	مئی ۵۷ء	۵۰ - ۵۶	حضرت ریاض [illegible]	جنوری ۳۶ء	۵۱ - ۴۰
″	جون ۵۷ء	۴۰ - ۴۵	ریاض مرحوم	ستمبر ۴۱ء	۴۴ - ۵۰
″	جولائی ۵۷ء	۴۹ - ۵۲	حسرت کی خصوصیات شاعری	جنوری، فروری ۵۲ء	۶۷ - ۸۰
″	اگست ۵۷ء	۲۵ - ۳۸	کلام حسرت کی توقیت	جنوری، فروری ۵۱ء	۷۴ - ۰۵
″	ستمبر ۵۷ء	۲۸ - ۴۰	تذکرۂ حسرت	جنوری، فروری ۵۱ء	۷ - ۹
کلام مومن پر ایک طائرانہ نظر	جنوری ۳۵ء	۲ - ۸	دورِ حاضر کی شاعری	جنوری، فروری ۴۴ء	۲ - ۸
مومن کی ہنر بندیاں	اکتوبر ۶۲ء	۵ - ۸	″ ″		۱۱۷ - ۱۲۰
قصائد مومن میں عنصر تغزل	اپریل ۶۲ء	۲۸ - ۳۴	تلخیص و تبصرہ ——— نگار جنوری ۴۱ء		
ظفر کی شاعری	جنوری ۳۷ء	۲ - ۱۶	میں شرکت کرنے والے شعرا کے کلام پر تبصرہ	جنوری، فروری ۴۲ء	۷۶ - ۸۰
دہلی اور لکھنؤ کے مشہور شعرا جو رامپور گئے	جنوری ۳۵ء	۱۹۲	لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر [illegible]	اپریل ۲۱ء	۳۶ - ۰۵
رنگ ناسخ کو منسوخ کرنے والا پہلا لکھنوی			سیماب کی نظم مرحد اعظم	ستمبر ۳۴ء	۱۶ - ۱۶
شاعر (جلال لکھنوی)	جنوری ۳۵ء	۱۰۳ - ۱۰۴	کلام جگر ——— اڈیٹر نگار کے نقطۂ نظر سے	جولائی ۲۱ء	۲ - ۵۰
داغ کا فن	جنوری، فروری ۵۳ء	۲ - ۸	جوش ملیح آبادی کی اہمال سرائیاں یعنی عظمت		
میاں نظام شاہ رامپوری	اگست ۲۴ء	۱۱ - ۲۳	الفاظ میں کھوئے ہوئے شاعر کی گمراہیاں	فروری ۳۲ء	۱۰ - ۵۱

جوش کی شاعرانہ خامیاں — مارچ ۳۳ء — ۴۳ - ۳۹ — غزل بعنوان رشحات نیاز

جوش کی شاعرانہ لغزشیں — اپریل ۳۳ء — ۴۴ — ۳۹ — عیاں ہے سب پہ کہ دل کو ذرا قرار نہیں

" " " — مئی ۳۳ء — ۴۴ — ۴۹ — کہوں یہ کیسے مجھے ان کا انتظار نہیں اگست ۲۲ء — ۶۵

" " " — جون ۳۳ء — ۴۰ — ۴۲ — غزل سے

" " " — جولائی ۳۳ء — ۲۱ — ۲۸ — ہوسکے کیا تیرے حسن فتنہ ساماں کا جواب

یو۔پی کا ایک نوجوان ہندو شاعر — یعنی میری یاس کا حال پریشاں کا جواب مارچ ۲۴ء — ۱۹

فراق گورکھپوری — مئی ۳۶ء — ۶۲ — ۷۲ — شعرائے متقدمین کے رنگ میں سے

فراق کی رباعیاں — مئی ۴۵ء — ۵۱ — ۵۴ — جب قفس میں مجھ کو یاد آشیاں آجاتے ہے

اردو غزل الوالکمال اُمید امیٹھوی — جولائی ۳۸ء — ۵۵ — ۵۸ — سامنے آنکھوں کے اک بجلی سی لہرا جائے ہے جولائی ۵۴ء — ۴۱ — ۴۲

غزل نیاز — مومن و غالب سے لیکر ــــــ حسرت موہانی تک

اُدھر کچھ بےخبر وہ اپنے حسن بے محابا سے — منزل خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے

اِدھر مجبور کچھ ہم اپنے قلب ناشکیبا سے نومبر ۲۲ء — ۶۶ — ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے جولائی ۵۷ء — ۴۲

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنار دوست — محبوب کا جسمانی تصور اور محاکاتی معاملات

قایم رہے کہیں خلش انتظار دوست اپریل ۲۲ء — ۷۳ — ہاتھ سے لیتی ہے اس کے اور لوٹا جاتے ہے

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنار دوست — درد مندی میں کہاں یہ رنگ پایا جائے ہے جولائی ۵۷ء — ۴۲

قائم رہے کہیں خلش انتظار دوست جنوری ۲۹ء — ۱۶ — ایک تشبیہات اور سخن گسترانہ تعبیرات سے

تھا ضبط بھی لازم الفت ہیں، پر آپ سے چھٹ کر ہو نہ سکا — صرف ایک لرزش ہے نوک خار پر شبنم کی بوند

یہ کام بہت مشکل نہ سہی، پر ہم سے تو اکثر ہو نہ سکا اکتوبر ۵۷ء — ۴۶ — پھر بھی اس فرصت پہ بس کی مجھ کو رشک آجائے ہے جولائی ۵۷ء — ۴۳

غزل سے — جدید رجحانات کو سامنے رکھ کر سے

جانا یہ کس طرح کہ محبت نہیں مجھے — تار کی جھنکار سے بزم تھرا جائے ہے

ہاں تم سے عرض حال کی جرات نہیں مجھے دسمبر ۲۴ء — ۹۴ — گا ہے گا ہے ساز ہستی یوں بھی چھیڑا جائے ہے جولائی ۵۷ء — ۴۳ - ۴۴

چاہتے ہیں وہ کہ اظہار شکایت چھوڑ دوں

یعنی الفت چھوڑ دوں اس کی تمنا چھوڑ دوں جون ۲۲ء — ۷۴

اردو نظم

اردو غزل سے — انتساب۔

خدا معلوم دنیائے محبت کیسی دنیا ہے — اک نازنین رشک قمر کشتی میں محوخواب ہے

جو دشمن ہے تمنا کا وہی جان تمنا ہے جولائی ۳۳ء — ۷۱ — پر کو سے جس کے سطح آب اک چادر سیماب ہے فروری ۲۲ء — ۱

لوگ کہتے ہیں کہ آج آپ نے کوسا مجھ کو

وائے اگر اب بھی ہو جینے کی تمنا مجھ کو نومبر ۵۷ء — ۵۵ — " — " — " جنوری ۲۹ء — ۲

ڈرامہ

افسانہ

تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق				دنیا کا اولین بت ساز	اگست ۲۴ء	۶۰	۷۳
۱۔ فاتح اندلس کا ایک رومان				دو خط	مارچ ۲۵ء	۶۵	۷۲
۲۔ صلاح الدین کے دو آنسو	ستمبر ۶۱ء	۸۰	۸۸	رادھا	جون ۲۰ء	۵۴	۶۲
تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق				سسّی	دسمبر ۲۲ء	۷۳	۸۰
ملکہ قیلوفطرہ کا دارالتوبہ —— عورت کے				" "	فروری ۲۳ء	۱۱۳	۱۱۷
نفسیاتی تلونات	مئی ۴۳ء	۱۸	۲۰	" " "	اپریل ۲۳ء	۲۹۳	۳۰۱
تاریخ مذہب کا ایک خونیں ورق	جولائی ۳۶ء	۱۹	۲۱	" "	جنوری ۲۹ء	۱۷	۳۱
تاریخ محبت کا ایک گمشدہ ورق	جون ۲۷ء	۸۳	۸۶	سرزمین سندھ کی ایک تاریخی کہانی			
تاریخ یونان کا ایک پوشیدہ ورق				(سسّی، پنوں)	جولائی ۲۹ء	۳۹	۴۲
سکندر اعظم کی تخت نشینی کی خونیں داستان	مئی ۵۵ء	۳۲	۴۲	سوداے خام	اگست ۲۵ء	۶۲	۶۹
ٹیلی فون ۶۷ء	ستمبر ۳۱ء	۲۱	۲۸	" "	ستمبر ۲۵ء	۵۷	۶۲
جاالعالم ملکۂ مہرنگار	فروری ۲۷ء	۲۶	۳۷	" "	اکتوبر ۲۵ء	۱۳	۱۸
جنت سے نکل کر	اپریل ۵۵ء	۴۳	۴۷	سیاہ بلی (ایڈگر ایلن پو)	اکتوبر ۵۵ء	۱۹	۲۵
جنگ اور جاسوسی	دسمبر ۲۳ء	۴۴	۴۹	شاہزادہ حرم ادرا یا بیل (آسکر وائلڈ)	جولائی ۳۰ء	۵۶	۶۴
چنگاری	فروری ۲۸ء	۶۰	۶۶	شبستان کا قطرۂ گوہریں	نومبر ۳۱ء	۶۵	۶۸
" "	مارچ ۲۸ء	۷۳	۷۶	" " "	دسمبر ۳۱ء	۵۶	۶۳
" "	اپریل ۲۸ء	۴۰	۴۵	" " "	فروری ۳۲ء	۵۹	۶۴
" "	مئی ۲۸ء	۵۷	۶۱	" " "	مارچ ۳۲ء	۳۷	۴۳
" "	جون ۲۸ء	۵۴	۶۰	شذرا	دسمبر ۲۸ء	۷۵	۷۹
[illegible] فرشتہ	مئی ۳۲ء	۳۰	۳۹	مسٹر لاک ہومز	اپریل ۲۷ء	۴۱	۴۹
حروب صلیبیہ کی تاریخ کا ایک گمشدہ ورق				شہاب کی سرگزشت	جولائی ۲۳ء	۲۲	۳۶
مسلمانوں کے عسکری اخلاق کی ایک حیرتناک مثال	دسمبر ۲۰ء	۲۸	۳۱	" "	اگست ۲۳ء	۱۲۴	۱۳۷
حسن کی شہر آشوبیاں	ستمبر ۲۳ء	۴۹	۵۵	سرگزشت شہاب	ستمبر ۲۳ء	۱۷۵	۱۸۵
داستان حسن و عشق کا ورق خونیں اور				شہاب کی سرگزشت	اکتوبر ۲۳ء	۲۵۷	۲۶۳
جلوۂ بے محابا کی ایک قاتل رات	جنوری ۳۱ء	۶۵	۸۵	" "	نومبر ۲۳ء	۳۳۸	۳۴۳
دام خیال	ستمبر ۶۱ء	۶۹	۸۲	" "	دسمبر ۲۳ء	۴۳۷	۴۴۲
درس محبت	فروری ۲۰ء	۴۸	۵۵	" "	جنوری ۲۴ء	۳۹	۴۶
مدہائے بیل کی دیوی —— مصر پر				" "	فروری ۲۴ء	۲۰	۲۶
نپولین کا تسلط اور قاہرہ کی بغاوت	جولائی ۴۱ء	۶	۸	" "	مارچ ۲۴ء	۱۵	۱۹

غہب کی سرگزشت	اپریل ۲۲ء	۳۶ - ۴۱	نفسیاتی عذاب		
"	مئی ۲۳ء	۳۴ - ۳۸	(روبرس ڈی لااسل آڈم)	نومبر ۵۰ء	۱۹ - ۲۳
"	جون ۲۴ء	۵۹ - ۷۱	نقاب اٹھ جانے کے بعد	جون ۲۶ء	۶۵ - ۷۱
شہید آزادی	دسمبر ۲۴ء	۲۱ - ۳۶	"	نومبر ۲۶ء	۱۲ - ۲۱
صدائے شکست	اکتوبر ۲۸ء	۵۲ - ۵۶	"	دسمبر ۲۷ء	۴۱ - ۴۶
"	نومبر ۲۸ء	۶۰ - ۶۴	نوجوان بادشاہ (آسکر وائلڈ)	اگست ۳۰ء	۳۵ - ۴۶
"	دسمبر ۲۸ء	۶۸ - ۷۴	ولے بخیر گزشت	جولائی ۲۹ء	۸۹ - ۹۲
ضلع کا ڈاکٹر (ترگینو)	مارچ ۳۷ء	۱۹ - ۲۷	یورپ کی ایک حسین راہبہ	نومبر ۲۲ء	۱۲ - ۲۰
اکتوبر ۵۱ء	اکتوبر ۵۱ء	۲۴ - ۲۸	شباب و شاعر	مارچ ۳۲ء	۵۸
عمر برق خرام (ایچ-جی- ویلز)	نومبر ۳۱ء	۵۴ - ۴۳	"	نومبر ۵۰ء	۴۷
عہد عباسی کا ایک تاریخی واقعہ			در منثور	ستمبر ۳۹ء	۶۳ - ۶۴
(جسے تاریخ نے نظر انداز کر دیا)	دسمبر ۴۰ء	۴۵ - ۴۸	بکھرے ہوئے موتی		
فاطمہ	جولائی ۲۶ء	۴۴ - ۵۱	(مختلف تحریروں سے اقتباسات)	جنوری ۳۴ء	۸۱ - ۱۴۰
فریب خیال	مارچ ۲۶ء	۶۰ - ۶۸	اشارات وکنایات	مئی ۴۶ء	۵۱ - ۵۳
"	اپریل ۲۶ء	۶۱ - ۶۶	دستۂ گل	اگست ۵۹ء	۴۸ - ۵۰
"	مئی ۲۶ء	۴۳ - ۵۰	کوزہ و دریا	دسمبر ۵۳ء	۴۹
قبیلہ بنی عذرا کی داستان حسن و عشق	مارچ ۲۹ء	۴۴ - ۴۸	بات میں بات	فروری ۳۶ء	۷۳ - ۷۴
نظرۂ آتشیں	اپریل ۲۸ء	۲۳ - ۲۷	کوئی کہانی سناؤ (ٹیگور)	جولائی ۶۰ء	۸۶ - ۸۷
" " (کارولی کوالڈی)	اپریل ۶۲ء	۴۱ - ۴۴	گیسو (ماخوذ از ترکی)	فروری ۲۲ء	۶۴
قطرہ بقطرہ	جولائی ۲۲ء	۲۳ - ۲۸	"	جنوری ۲۹ء	۵۶
قوت، شجاعت کا دیوتا اور حاکم زہریمی			—— کی ڈائری کا ایک ورق	نومبر ۲۷ء	۶۶ - ۷۰
ہنی بال کا افسانہ عروج و زوال	اکتوبر ۳۱ء	۳۶ - ۴۳	آنسہ می کا شعر منثور ——	ستمبر ۲۴ء	۶۶ - ۶۸
ماں کی محبت (ترجمہ از عربی)	ستمبر ۶۱ء	۸۹ - ۹۱	زندگی کا بوجھ (میخائیل نعیمہ)	دسمبر ۳۳ء	۶۳ - ۶۴
محبت کی دیوی	اپریل ۲۲ء	۶۲ - ۶۹	طائر خاموش پر ایک آنسو (لوطفی مصر)		
محلہ کی رونق	جون ۳۰ء	۸۱ - ۸۵	(آنسہ می کے شعر منثور کا ترجمہ)	فروری ۲۵ء	۵۲ - ۵۵
"	جون ۶۱ء	۴۱ - ۴۴	عدمیت (آنسہ می کے نقطہ نظر سے)	اپریل ۲۳ء	۲۴۴ - ۲۵۱
میر بیتاب	ستمبر ۲۶ء	۳۸ - ۴۲	میرا وطن کہاں ہے؟ (آنسہ می کے ایک		
نپولین کی زندگی کا ایک پوشیدہ ورق			مضمون کا ترجمہ)	جون ۲۵ء	۶۲ - ۶۴
(کینن ڈائل)	مارچ ۲۵ء	۲۰ - ۲۶	میں اور ایک بچہ (آنسہ می کے منثورات شعری)	مئی ۲۵ء	۷۵ - ۷۷

مہر صفا، کا نغمہ (آنسہ می)	جولائی ۲۵ء	۱۳ ۔ ۱۴	اعتبارات	جون ۳۱ء	۷۲
بلاد مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے			"	جولائی ۳۲ء	۶۱
(آنسہ عنبرہ سلام)	جولائی ۲۸ء	۳۷ ۔ ۴۴	"	اگست ۳۲ء	۶۱
تصویر افکار (ترجمہ از عربی)	اکتوبر ۲۵ء	۵۱ ۔ ۵۴	"	اکتوبر ۳۲ء	۶۴
یہاں وہاں سے (جرائد سے ماخوذ پر لطف			"	اکتوبر ۳۳ء	۶۹ ۔
باتیں)	جون ۲۵ء	۶۶ ۔ ۷۸	"	فروری ۳۶ء	۱ ۔ ۷۲
" " "	جولائی ۲۵ء	۸ ۔ ۸۱	"	مارچ ۳۶ء	۷۷
تاثرات (اقتباسات و معلومات مختلف			"	اپریل ۳۶ء	۷۹ ۔ ۸۰
کتب اور رسائل سے	فروری ۲۵ء	۹۴ ۔ ۹۶	"	جولائی ۳۶ء	۷۲
یہاں وہاں سے (عربی جرائد سے ماخوذ			"	جون ۴۱ء	۲۳
پر لطف باتیں)	مئی ۲۵ء	۶۵ ۔ ۶۷	"	جولائی ۴۳ء	۴۰
ملاحظات (یعنی جنوری ۲۶ء سے لے کر ۳۱ء			"	دسمبر ۵۳ء	۵۲ ۔ ۵۳
تک کے ملاحظات کا اقتباس یک جائی)	جنوری ۳۳ء	۴ ۔ ۱۵۲	"	دسمبر ۵۵ء	۴۸
چاند کی طرف پہلا قدم ۔ آیندہ گرما میں	ستمبر ۲۷ء	۵۵ ۔ ۵۹	"	مارچ ۵۷ء	۴۵ ۔ ۴۸
میری ڈائری کا ایک ورق			ایک خط ـــــ جو مکتوب الیہ		
(از ماہ تا بہ ماہی)	فروری ۲۸ء	۷۶ ۔ ۸۰	تک کبھی نہ پہونچ سکا۔	جولائی ۳۳ء	۲۷ ۔ ۲۹
میری ڈائری کا ایک ورق			حاجی دوست کے نام اڈیٹر نگار کا خط		
(رخ ... بقلم نگار آورم)	مارچ ۲۸ء	۶۸ ۔ ۷۲	(شعر و تصرف)	ستمبر ۶۱ء	۴۶ ۔ ۴۸
(میری) ڈائری کا ایک ورق	اپریل ۲۸ء	۵۲ ۔ ۵۷	مکتوبات نیاز ـــــ جو رسالہ نگار		
" "	مئی ۲۸ء	۵ ۔ ۸	میں متواتر شائع ہوتے رہے۔		
" (چاند کا سفر)	جون ۲۸ء	۸۱ ۔ ۸۳	نگاہات	اگست ۳۹ء	۶۹ ۔ ۷۲
" " "	جولائی ۲۸ء	۴۴ ۔ ۴۸	"	مارچ ۶۲ء	۴۹
" " "	اگست ۲۸ء	۸۵ ۔ ۸۸	میر بکائی	جون ۵۱ء	۷۱ ۔ ۷۸
اقتباسات	نومبر ۳۱ء	۸۴	پیغمبروں کے لطائف	جولائی ۴۴ء	۲۱ ۔ ۲۶
"	دسمبر ۳۱ء	۸۹ ۔ ۹۰	" "	جنوری و فروری ۴۸ء	۲۳۲ ۔ ۲۳۹
"	فروری ۳۲ء	۶۵ ۔ ۶۶	جھوٹوں کے بادشاہ	جون ۴۲ء	۵ ۔ ۶
"	مارچ ۳۲ء	۶۵ ۔ ۶۶	جھوٹوں کا بادشاہ (بیرن منشوزن		
"	اپریل ۳۲ء	۶۰ ۔ ۶۱	کے چند سفید جھوٹ)	اپریل ۵۵ء	۴۵ ۔ ۴۷
"	مئی ۳۲ء	۶۳ ۔ ۶۴			

کاغذی قوت (روس کی موجودہ زندگی)			تو و واعظا و ہوشے و کنار من کوشے		
(طنز)	اکتوبر ۴۹ء	۱۵-۱۶	من و لغزشے وسیل نم چشم میفروشے	جنوری ۲۹ء	۱۴۴
جنت کی حقیقت یا افسانۂ فردا	مئی ۳۱ء	۴۴-۵۹	جزاک اللہ چہ خوش گفتی سراو اک پیدا کن		
دو گھنٹے جہنم میں	اکتوبر ۳۰ء	۲۵-۳۲	دگر سی گومت ہاں، غمزۂ بیباک پیدا کن	فروری ۲۳ء	۱۰۸
چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	ستمبر ۲۹ء	۴۹ ۵۶	حال دل نمی پرسی این چہ دلنوازیہاست		
مہاجر اہل قلم (پاکستان سے ہندوستان			درد جاں بیقراری این چہ چارہ سازیہاست	جولائی ۲۲ء	۳۰۶
آنے والے)	جولائی ۵۲ء	۵۴ ۵۲	زد لمنہ گفتنے نہ ز توشہ یہ نسخے		
بنگالی زبان پر فارسی کا اثر	جولائی ۲۳ء	۷۵	ولے این قدر بدانم لذت کشید نسخے	مارچ ۲۴ء	۷۹
فارسی ادب پر ایک تاریخی نظر	اکتوبر ۴۷ء	۳۲-۴۱	" " "		
فارسی ادب کا تدریجی عروج و زوال	اکتوبر ۵۲ء	۱۶-۲۴	" " "	جنوری ۲۹ء	۱۴۴
مبالغہ طنز و مزاح			شاعرانہ تعلّی		
(فارسی شاعری میں)	اپریل ۶۲ء	۱۷-۲۲	زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم		
فارسی کے طنزیہ لطائف	اکتوبر ۴۷ء	۴۴-۴۸	زخندہ ات چہ نوا بردہ ام کہ گریانم	جولائی ۶۰ء	۹۷
خیام کی رباعیاں (افادات آقائی محمد علی			عرضہ مدہ کنوں بہ او طرح فسون ناز را		
فروغی)	اکتوبر ۵۰ء	۴۴ ۴۸	اے کہ خراب ساختی از نگہت نیاز را	مارچ ۲۲ء	۷۲
بدر چاچ کے استعارے	ستمبر ۶۱ء	۹۵ ۹۶	فارسی غزل بعنوان رشحات نیاز		
ہندوؤں کا ذوق فارسی	دسمبر ۳۷ء	۲۷-۴۵	ماہر داریم دائم ساز عشرت خانہا		
نظیری کی فارسی تصانیف	جنوری ۶۰ء	۵۴-۵۶	از حضور رحمت دل می چکد ویرانہا	اگست ۲۲ء	۷۱
نقشہائے رنگ رنگ، پیشکش بہ حضور			" " " "		
غالب ناشناسیہائے سید امداد امام اثر	اگست ۳۱ء	۱-۲۸	" " "		
			اے کہ با چشمان مستت ساحری فن آمدی		
فارسی غزل			فرصتت بادا کہ دل را ہوش انگن آمدی	جنوری ۲۹ء	۱۲۰
			نگرم بہ برگ سنگ ... آذری		
اے کہ با چشمان مستت ساحری فن آمدی					
فرصتت بادا کہ دل را ہوش انگن آمدی	مئی ۲۲ء	۲۵	کہ نہادہ این قدر آگہی بہ مذاق شیوۂ کافری	دسمبر ۲۲ء	۹
فارسی غزل بعنوان رشحات نیاز			" " "		
بیراہے کہ می آئی تپش افزودہ می آئی			" " "	جنوری ۲۹ء	۳۲
نقاب از روئے برق انگن مگر بلشتہ دمی آئی	ستمبر ۲۲ء	۴۱	شعر (غزلوں کے نقطۂ نظر سے)	فروری ۲۲ء	۹ ۱۹
تو ای واعظا و ہوشے و کنار امن کوشے			" " "	جنوری ۴۶ء	۱۰۴ ۱۱۰
من و لغزشے وسیل نم چشم میفروشے	اپریل ۲۳ء	۲۹	عرب شعرا کا اثر جمہور پر	جنوری، فروری ۴۸ء	۲۲۲-۲۲۶

تاریخ عالم سیاحت و جغرافیہ اور تاریخ

آیندہ جنگ اور فضائی قوت دُولِ عالم کی ہوائی		
طاقت پر تقابلی تبصرہ	مئی ۳۹ء	۶۰ - ۶۶
دول عالم کی بری، بحری اور میکانکی قوت	جون ۳۹ء	۴۲ - ۵۰
آیندہ جنگ میں کون کس کا ساتھ دے گا	جولائی ۳۹ء	۴۵ - ۴۸
فرانس اور جرمنی کے خطوط مدافعت	اکتوبر ۳۹ء	۷۲ - ۷۴
اٹلی کی غیر جانبداری اور روس کی طرفداری		
کا راز	دسمبر ۳۹ء	۴۴ - ۴۹
جنگ کا ہولناک خراج نوع انسانی سے	نومبر ۳۹ء	۲۸ - ۳۵
جنگ کے دہشت انگیز مصارف ــــ		
(ایک حربی ماہر جنگ کے اندازے سے)	ستمبر ۴۲ء	۳۲ - ۳۴
داستان جنگ یکم ستمبر ۳۹ء سے ۳۱ جولائی		
۴۱ء تک۔	اگست ۴۱ء	۲ - ۹
" " "		۴۹ - ۷۴
برطانیہ اس جنگ میں کتنا خرچ کر رہا ہے	اگست ۴۱ء	۱۲ - ۱۳
نازی لطایف	مئی ۳۹ء	۷۱ - ۷۲
جرمنی کو ناکہ بندی سے شکست نہیں ہو سکتی	مئی ۴۰ء	۵۴ - ۵۶
جدید جرمنی کی رجعت عہد اسپارٹا کی طرف	نومبر ۳۱ء	۷۸ - ۸۰
فرانس کی اعاظم پرستی (نپولین کی		
حیات بعد الممات)	اپریل ۲۲ء	۳ - ۹
فرانس کی کمزوری جرمنی کے مقابلہ میں	مارچ ۲۳ء	۲۳۷ - ۲۴۴
مسولینی کیوں ناکام رہا	اگست ۴۱ء	۳۹ - ۴۲
اسپین کا مستقبل حال کی روشنی میں	ستمبر ۴۱ء	۴۵ - ۴۶
حکومت زار کا حیرت ناک انقلاب	مئی ۲۲ء	۳ - ۱۴
زار سے اسٹالین تک	جون ۴۲ء	۲۹ - ۳۱
انقلاب روس اور بالشویک حکومت	اگست ۱۷ء	۳ - ۱۰
روسی نظام حکومت پر ایک تاریخی		
واقتصادی تبصرہ	جولائی ۲۰ء	۲۹ - ۳۵
باشندگان قاف کی خودداری اور شجاعت اور		
مسلمانوں کی اولین جمہوریت کا قیام	ستمبر ۲۲ء	۳ - ۷

باشندگان قاف کی خودداری و شجاعت		
(مسلمانوں کی اولین جمہوریت کا قیام)	جنوری فروری ۶۱ء	۱۸۰ - ۱۸۳
فردوس ارضی (روس)	دسمبر ۳۱ء	۵۰ - ۵۳
سوویٹ حکومت کی ملکی و ذہنی ترقیاں	دسمبر ۵۳ء	۳۳ - ۳۶
ایک دشمن محبت سلطنت (روس)	دسمبر ۳۲ء	۶۳ - ۶۵
روس کا شاندار مستقبل	مئی ۳۹ء	۹ ۱۱
روس کی خاموش قوت	جولائی ۴۱ء	۲۳ ۲۶
کیا روس جنگ کے لئے تیار ہے؟	اگست ۴۸ء	۲۱ - ۲۳
روسی اثرات رومانیہ میں	جون ۴۵ء	۴۵ - ۴۶
بلقان پر روس کے آیندہ اثرات	جولائی ۴۴ء	۲۷ - ۲۹
روس کی کمزوریاں		
(خود روسی اخبارات کی نظر سے)	ستمبر ۴۸ء	۳۴ - ۳۵
دنیائے سیاست کا ایک زبردست معمہ		
(کیا روس جرمنی کے خلاف اعلان جنگ		
کرے گا)	مارچ ۴۱ء	۵۳ ۵۵
لینن گراڈ کا محاصرہ اور عزائم انسانی		
کی حیرت ناک داستان	مئی ۴۳ء	۱۷ - ۱۹
ماسکو کی خونیں تاریخ	اپریل ۴۲ء	۷ ۸
جمہوریت سوئٹزرلینڈ	جون ۴۴ء	۳ ۸
چین و جاپان کی جنگ سے ہم کو کیا		
سیکھنا چاہیئے۔	اگست ۳۹ء	۲۴ ۲۷
موجودہ جنگ اور جاپان	مارچ ۴۰ء	۴۱ - ۴۴
جاپان کے خوفناک ارادے	مئی ۴۲ء	۱۱ - ۱۳
عہد بنی امیہ کا مالیاتی اور ثقافتی نظام	مارچ ۵۵ء	۵ ۸
عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں		
کا اثر و اقتدار	دسمبر ۵۵ء	۴۴ ۴۸
عہد عباسیہ کی معاشرت اور صنعت و تجارت	اپریل ۵۵ء	۵ ۱۰
دنیا کی مسلم حکومتوں کا سرسری جائزہ		
(مسلمانوں کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ہے)	ستمبر ۵۶ء	۵۰ - ۵۱

اسلامی ہند (تاریخ)	جنوری ۳۸ء	۱ – ۱۲۶	تاج برطانیہ کا درخشندہ ترین الماس		
"	فروری ۳۸ء	۱۲۷ – ۱۳۸	(ہندوستان) اور سیاسیات عالم کے		
"	مارچ ۳۸ء	۱۳۹ ۱۵۰	افق پر اس کے اثرات تالش،	دسمبر ۲۳ء	۴۰۳ ۴۱۰
"	اپریل ۳۸ء	۱۵۱ - ۱۶۲	سیاسیات عالم میں ہندوستان		
"	مئی ۳۸ء	۱۶۳ ۱۷۴	کی اہمیت	ستمبر ۲۵ء	۳ ۱۱
"	جون ۳۸ء	۱۷۵ ۱۸۶	جنگ کے زمانے میں ہندوستان		
"	جولائی ۳۸ء	۱۸۷ ۱۹۸	کا مالی انتظام	اگست ۴۱ء	۲۶ - ۲۸
"	اگست ۳۸ء	۱۹۹ ۲۱۰	ہندوستان سویٹ نقطۂ نظر سے	مئی ۳۸ء	۲۵ ۳۲
"	ستمبر ۳۸ء	۲۱۱ ۲۲۶	وفاق - ریاستیں اور حکومت بالادست	جون ۳۸ء	۳۴ - ۴۱
"	اکتوبر ۳۸ء	۲۲۷ - ۲۴۲	ریاستوں کی آزادی وفاق کے نقطہ		
"	نومبر ۳۸ء	۲۴۳ ۲۵۸	نظر سے	جولائی ۳۸ء	۴۸ ۵۴
"	دسمبر ۳۸ء	۲۵۹ - ۲۷۳	ریاستوں کے مطالبات آزادی	اگست ۳۸ء	۳۲ - ۳۶
ہندوستان کے کامیاب مسلمان فرمانرواؤں			شہریار دکن کا ایک فرمان		
کے خصوصیات	جنوری، فروری ۴۸ء	۵۸ ۱۱۸	قرآن پاک کی روشنی میں	ستمبر ۲۹ء	۶۵ ۶۸
تاریخ سندھ کے اہم واقعات	جنوری، فروری ۴۸ء	۱۲ - ۱۴	وادیٔ کشمیر کی تاریخ پر سرسری تبصرہ	مارچ ۵۳ء	۱۷ – ۲۱
سندھ میں مسلمانوں کی سب سے پہلی حکومت	جنوری، فروری ۴۸ء	۱۵ - ۳۴	حالات بعد از جنگ	ستمبر ۴۳ء	۱۷ – ۲۳
سندھ کے مسلم فرمانرواؤں کا حسن انتظام			عجم کے کارنامے اسلام کے عہد		
اور ان کی رواداریاں	جنوری، فروری ۴۸ء	۳۵ - ۴۰	زرّیں میں۔	جنوری، فروری ۴۸ء	۱۳۱ - ۱۳۹
بیل کا جائے وقوع	مارچ ۲۵ء	۷۹ ۸۰	جمال پاشا کی نوٹ بک کا ورق		
غزنوی عہد پر تبصرہ	جنوری، فروری ۴۸ء	۴۱ - ۵۷	(ترکی جرمنی اتحاد)	مارچ ۲۳ء	۱۴۳ - ۱۶۹
محمود غزنوی کے خلاف بعض الزامات			جنگ سے پہلے ترکی سیاست کی کشمکش	جون ۲۲ء	۳ - ۱۰
کی تردید	اکتوبر ۵۷ء	۴۱ - ۴۴	ترکی اور موجودہ جنگ	اپریل ۴۲ء	۲۲ - ۲۴
عہد مغلیہ کا عسکری اور مالی نظام	مارچ ۳۷ء	۶۳ ۷۱	ترکی امریکہ کی سامراجی گرفت میں		
ہندوستان میں ایک نئے کلچر کی تخلیق -			(تاس ایجنسی)	مئی ۴۸ء	۲۶ - ۲۷
عہد اکبر کی ایک شادی (جہانگیر اور جودھا بائی)	مئی ۲۲ء	۲۵ - ۲۶	فلسطین اور تحریک صیہونیت	اپریل ۴۸ء	۳۰ ۳۳
شاہجہاں اور اورنگ زیب کا ضبط اوقات	جولائی ۲۲ء	۶۵ - ۷۱	نہر سویز کا تاریخی و سیاسی پس منظر	ستمبر ۵۶ء	۳۱ ۳۳
"	جنوری، فروری ۴۸ء	۱۴۰ - ۱۴۵	نزاع برطانیہ و مصر (تاریخی پس منظر)	مارچ ۵۲ء	۵ - ۶
لی کی علمی و ادبی مرکزیت	اگست ۵۶ء	۳۶ - ۳۹	ابوالہول کی بیداری		
			(انقلاب مصر)	مارچ ۵۳ء	۴۴ ۴۶

انقلاب امریکہ پر ایک اجمالی نظر اگست ۲۲ء ۳ - ۱۷
" جنوری ۲۹ء ۱۰۵ - ۱۱۵
نہضت قومی کے حیرتناک مناظر
(امریکہ میں) فروری ۲۳ء ۸۳ - ۹۱
" جون ۲۳ء ۸۳ - ۴۱۳
" جولائی ۲۳ء ۳ ۹
بیداریوں کے افسانے اور قوت عمل کے
مناظر جمیل ستمبر ۲۴ء ۶۱ - ۶۵
امریکہ کا سستر باغ ستمبر ۴۹ء ۳۶ - ۳۷

سوانح

بیسویں صدی کا سب سے بڑا ساحر اور
شعبدہ باز ــــ ہوڈنی۔ مارچ ۴۱ء ۴۷ - ۵۰
تیر کات کا بادشاہ ــــ ہوڈنی اپریل ۴۱ء ۴۴ - ۴۶
ایک شعبدہ گر سا سنیاس (منت گومری لو) مئی ۴۶ء ۳۶ - ۳۸
لامذہبیات ــــ دنیائے عیسویت کا ایک
پرعظمت وجلال باغی ــــ والیٹر مارچ ۳۷ء ۳۹ - ۵۷
کرشن جی دسمبر ۲۳ء ۴۵۲ - ۴۵۷
" اپریل ۵۷ء ۳۴ - ۳۶
ہندوستان کا ایک مذہبی قائد اور اس کی
قوت عمل یعنی دیال باغ اور بانی دیال
باغ کی کہانی اکتوبر ۳۶ء ۴۹ - ۵۱
کیا مانی واقعی مصور تھا؟ فروری ۲۲ء ۳۴ - ۳۸
میکدۂ اسلام اور اڈیٹر سہیل یمن کی ہکی ہکی
باتیں (جناب امیر کی شراب نوشی) جون ۳۴ء ۵۷ - ۶۱
لفظ حسین کے ساتھ امامت کی نسبت
احترام اور عزت کا غلط معیار ہے فروری ۲۹ء ۷۹ - ۸۰
شاہ ولی اللہ ۔ ستر ہویں صدی کا ایک مذہبی اخلاقی ہو
سیاسی مجاہد (اقتباس از ہسٹری آف فریڈم موومنٹ) مئی ۵۸ء ۷ - ۱۶
سید احمد شہید بریلوی
(ہسٹری آف فریڈم موومنٹ) اگست ۵۸ء ۲۷ - ۳۱
بابی تحریک کی روح رواں
قرۃ العین اکتوبر ۴۹ء ۳۱ - ۳۳
قلوپطرہ جنوری ۲۹ء ۵۱ - ۵۵
فرمانروایان اسلام ۔ ولادت نبوی
۹ ربیع الاول عام فیل (۲۰ اپریل ۵۷۱ء)
سے دور حاضر تک مسلم حکومتوں کے مد وجزر
کی مختصر داستان ۔ جنوری، فروری ۴۸ء ۳ - ۱۵۶
عہد مغلیہ میں شاہزادیوں کی تعلیم
(زیب النساء) مارچ ۵۴ء ۲۵ - ۳۲
زیب النساء جون ۲۲ء ۳۴ - ۴۵
رستم نپولین کا غلام فروری ۲۵ء ۱۴ - ۲۴
نواب عماد الملک بلگرامی جنوری ۲۶ء ۲۰ ۲۶
ایک دن مسولینی کے ساتھ جون ۲۹ء ۱۹ - ۲۳
مسولینی کے قتل کی داستان (ریڈیو) ستمبر ۴۷ء ۴۶ ۵۰
لینن اور اسٹالین کا فرق نومبر ۴۸ء ۳۴
بڑا چور ــــ بڑا حکمراں (اسٹالین کی
زندگی کا ایک واقعہ) ستمبر ۳۶ء ۲۸ ۲۹
مولانا آزاد اپنے خطوط کے آئینہ میں مارچ ۶۰ء ۵ ۶
مصطفٰی رشید پاشا (۱۲۱۵ھ ــــ
۱۲۷۴ھ) اپریل ۲۳ء ۲۵۲ - ۲۵۷
مصطفٰی کمال جون ۳۵ء ۵۳ - ۶۰
مصطفٰی کمال کی ابتدائی زندگی اپریل ۳۵ء ۲۳ ۲۸
مصطفٰی کمال کی زندگی کے دلچسپ اوراق نومبر ۳۴ء ۳۷ - ۴۸
" " " دسمبر ۳۴ء ۴۷ ۵۱
" " " مارچ ۳۵ء ۲۵ ۳۲
" " " فروری ۳۵ء ۲۴ ۳۰
مصطفٰی کمال اور جنگ عظیم جولائی ۳۵ء ۳۴ - ۴۳

متفرقات

استفسارات

فلسفہ

مذہب

اسلام

رشید و استخلاف	مئی ۴۲ء	۳۲ - ۳۵	الجزیرہ غیر منقطعہ	اکتوبر ۵۶ء	۴۰ - ۴۱
قرآن اور اس کا جغرافیہ	دسمبر ۵۲ء	۶۰ - ۶۲	عبادت، مذہب، کیمیر، فرعون	مئی ۵۸ء	۵۶ - ۶۰
قرآن اور اس کا غلط جغرافیہ	جنوری ۴۶ء	۸۵ - ۸۹	قرآنی پردہ	اکتوبر ۲۹ء	۷۹ - ۸۲
آدم اور شجرِ ممنوعہ	اپریل ۳۶ء	۶۹ - ۷۷	تقلید و اجتہاد	اکتوبر ۳۴ء	۳۷ - ۳۸
آلِ لوط — حالات	ستمبر ۶۲ء	۲۴ - ۲۶	نماز	جولائی ۳۳ء	۵۵ - ۵۶
ہاروت و ماروت، زہرہ اور اسمِ اعظم	نومبر ۳۳ء	۷۱ - ۷۶	نماز اور اس کی غایت	دسمبر ۲۸ء	۸۸ - ۹۲
اصحابِ کہف	فروری ۳۳ء	۷۴ - ۷۹	نماز پنجگانہ ہے یا سہ گانہ	اکتوبر ۲۹ء	۷۸ - ۷۹
یاجوج ماجوج اور ذوالقرنین	فروری ۲۶ء	۷۰ - ۸۰	صلوٰۃ الوسطیٰ	مئی ۲۵ء	۸۲ - ۸۷
یاجوج و ماجوج، ذوالقرنین اور سدِ سکندر	اگست ۳۲ء	۷۲ - ۷۷	نماز کی موجودہ صورت	اگست ۲۹ء	۷۹ - ۸۱
طوفانِ نوح	جنوری ۲۵ء	۶۵ - ۷۷	نماز میں قرآن مجید کا ترجمہ	اکتوبر ۳۳ء	۶۷ - ۶۸
جناب سلیمان (حالات)	مارچ ۳۱ء	۶۲ - ۶۹	صبیات حج	جنوری ۴۲ء	۷۳
حسنِ یوسفی	فروری ۲۸ء	۸۶ - ۹۰	کیا ہندوستان میں زکوٰۃ ادا کیا جانا واجب ہے	اکتوبر ۳۶ء	۷۰ - ۷۲
وہی یوسف وہی افسانۂ حسن	مارچ ۲۸ء	۷۷ - ۸۷	جہاد اور جزیہ	جون ۶۱ء	۳۲ - ۳۶
یونس علیہ السلام	نومبر ۲۸ء	۸۰ - ۹۱	تاریخِ اسلام کا ایک بدنام لفظ "جہاد"	اپریل ۶۲ء	۳۸ - ۳۹
آتشِ نمرود	جنوری ۴۳ء	۶۸ - ۷۲	کیا اسلام کی حدود شرعی وحشیانہ ہیں؟	ستمبر ۶۱ء	۲۱ - ۲۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	ستمبر ۲۶ء	۶۵ - ۸۲	اسلام اور حدِ زنا	مارچ ۶۱ء	۱۵ - ۲۷
" "	دسمبر ۲۳ء	۸۵ - ۸۸	قتلِ مرتد	دسمبر ۳۷ء	۵۹ - ۶۲
مسیح علم اور تاریخ کی روشنی میں	فروری ۳۱ء	۸۱ - ۸۳	" "	دسمبر ۵۹ء	۴۰ - ۴۴
" "	مارچ ۳۱ء	۸۴ - ۸۸	کیا شریعتِ اسلام میں تغیر و تبدل ممکن ہے؟	نومبر ۳۷ء	۶۱ - ۶۳
مسیح علم و تحقیق کی روشنی میں	اپریل ۳۱ء	۸۵ - ۹۳	پردہ اور اسلام	اپریل ۶۲ء	۳۵ - ۳۸
" "	مئی ۳۱ء	۷۷ - ۸۱	مزامیر کی حقیقت — سماع بالمزامیر	فروری ۳۳ء	۶۳ - ۶۴
واقعۂ اصحابِ فیل	دسمبر ۵۴ء	۴۴ - ۴۵	رویتِ ہلال	مارچ ۵۱ء	۴۴ - ۴۵
قصہ اصحابِ فیل اور اُن کی ہلاکت کا سبب	مئی ۶۰ء	۴۸ - ۵۱	رویتِ ہلال اور پاکستان	مئی ۶۱ء	۳۷ - ۳۸
کیا واقعۂ شق القمر قابلِ یقین ہے؟			ایک تاجر شراب اور پیشہ ور عورت کی		
کیا نبوت واقعی ختم ہو گئی؟	جولائی ۳۲ء	۵۷ - ۵۸	کمائی کا فرق	جولائی ۳۳ء	۵۶ - ۵۷
خضر علیہ السلام	جولائی ۲۶ء	۸۱ - ۸۶	مذہبِ حنفی سے کیا مراد ہے؟	اگست ۳۵ء	۷۳
حدیث پر تاریخی اور فنی گفتگو	ستمبر ۳۳ء	۵۸ - ۶۶	اہلِ قرآن اور اہلِ حدیث	نومبر ۴۵ء	۴۱ - ۴۴
کتبِ احادیث و تفاسیر کی جمع و ترتیب	جون ۷۲ء	۴۸ - ۴۹	ایک عجیب اعتقاد (کیا منکرِ کفالت اللہ		
معیاری و غیر معیاری احادیث	نومبر ۳۸ء	۵۲ - ۵۳	دائرۂ اسلام کے اندر ہے؟)	اکتوبر ۳۴ء	۷۳ - ۷۴

علوم اجتماعیہ

سود (اقتصاد)	اپریل ۴۰ء	۷۰-۷۲	یورپ کی وسیع ترین زبان	اگست ۲۳ء	۱۴۹-۱۵۰
عہد قدیم میں حکومت کی صورت اور دستور			بعض ادبی اور لغوی استفسارات	اگست ۵۹ء	۱۳-۱۴
میں مسلمانوں کا حصہ	جولائی ۳۳ء	۷۳-۷۴	امریکہ کو "انکل سام" کیوں کہتے ہیں؟	اکتوبر ۲۵ء	۷۷-۷۸
حکومت مصر (موجودہ نظام)	نومبر ۲۲ء	۶۶-۶۷	جان بل (کیا ہے)	فروری ۲۴ء	۷۱-۷۲
یکی چری (ینگ چیری کی اصلیت)	جون ۲۵ء	۸۴	لفظ FYORD کا مطلب	مئی ۲۷ء	۹۰
نامہ بر کبوتر	اگست ۲۳ء	۱۴۸-۱۴۹	انگریزی لفظ RHYTHM اور		
صلیب احمر (ہلال احمر اور کیونکر ہوئی)	ستمبر ۲۲ء	۸۸-۸۹	RHIME کا ترجمہ	اکتوبر ۳۰ء	۸۶-۸۷
فری میسن کیا ہے؟	اگست ۲۵ء	۸۶-۸۷	چند اصطلاحات کا ترجمہ	دسمبر ۲۲ء	۱۴۴-۱۴۵
بچوں کی ابتدائی تعلیم کا سب سے بہتر طریقہ	دسمبر ۳۱ء	۸۸-۹۳	" " " "	ستمبر ۲۴ء	۶۸-۶۹
طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت	اکتوبر ۲۴ء	۷۱-۷۲	" " "	اپریل ۲۵ء	۸۴-۸۶
طبقۂ نسواں اور تعلیم	اپریل ۲۵ء	۷۶-۸۳	انگریزی اصطلاحات اور تصوف کا ترجمہ (اردو)	جنوری ۲۹ء	۱۴۸-۱۵۳
پردہ اور تعلیم نسواں	مئی ۲۴ء	۶۹-۷۰	جرمنی زبان یا جرمانی زبان	اکتوبر ۲۳ء	۳۰۷
خواتین ترکی اور تعلیم	اکتوبر ۲۳ء	۲۹-۳۱	آدم (اصلیت)	دسمبر ۶۰ء	۲۴-۲۵
عرب میں گودنے کا رواج	مارچ ۱۵ء	۷۸-۷۹	لفظ "باقی" کی تحقیق	مئی ۲۲ء	۳۱-۳۲
اپریل فول	مئی ۲۶ء	۸۹	باورے بین کے لئے اردو یا فارسی		
مغربی مصنفین اور مشرقی عورت	جولائی ۲۶ء	۶۵-۶۸	بین ترکیب	مارچ ۱۵ء	۴۵-۴۶
الف لیلہ اور سندباد نامہ	مئی ۳۵ء	۴۷-۵۰	کانگریس اور مسئلہ زبان	دسمبر ۳۷ء	۶۴-۶۵
کلیلہ و دمنہ (ترکی اور روسی زبان میں)			سیاہی ـــ روشنائی	نومبر ۵۵ء	۵۰
تکمی گئی؟	اکتوبر ۳۲ء	۶۵-۶۷	شیخ (کسے کہتے ہیں)	جون ۴۴ء	۴۴
رامائن اور مہابھارت	فروری ۲۵ء	۶۱-۶۵	بعض الفاظ کے معنی	اگست ۲۵ء	۸۱
الف لیلہ (کا مصنف کون ہے؟)	ستمبر ۲۵ء	۸۱-۸۲	چند الفاظ کی تحقیق	دسمبر ۲۳ء	۴۷۲-۴۷۳
زلزلہ اور ید اثمالی	اکتوبر ۳۵ء	۵۹-۶۱	چند الفاظ کے معنی	اپریل ۲۴ء	۶۰
علم الاعداد کی تاریخی حقیقت			ادبیات (محل استعمال)	دسمبر ۲۸ء	۶۸
(نقوش - تعویذ)	جون ۲۳ء	۴۷۶-۴۷۷	برس - گنجلش - سرورق - موسیقار (معنی)	اکتوبر ۵۹ء	۴۶
جادو ـ ٹونا ٹوٹکا ـ گنڈا ـ تعویذ وغیرہ	اکتوبر ۵۳ء	۴۸-۵۱	خواجہ (کسے کہتے ہیں)	اکتوبر ۲۶ء	۸۹
دیوار قہقہہ اور دیوار چین	اکتوبر ۲۴ء	۷۱ -	الفاظ ... و تکلیف کا محل استعمال	جولائی ۳۰ء	۸۴-۸۶
سیمرغ ـ عنقا ـ ہما	نومبر ۶۱ء	۴۷	لفظ علامہ کی تحقیق	دسمبر ۶۰ء	۲۷
تحقیق لغوی			نکتہ نظر یا نقطۂ نظر	جولائی ۶۰ء	۹۴-۹۵
حضرت آدم کونسی زبان استعمال کرتے تھے؟	اپریل ۲۲ء	۲۱۴-۲۱۶	مرتد اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ	جولائی ۶۰ء	۹۳-۹۴

ریاضی و ہیئت

علوم عملیہ

طبقۂ نسواں اور غزل گوئی	نومبر ۲۳ء	۳۹۳-۳۹۴	حافظ کے دو شعر (تشریح)		
ترقی پسند لٹریچر	مارچ ۳۷ء	۲۶-۲۷	بیاکہ قصر امل سخت سست بنیاد است		
عورت اور ادب لطیف	اپریل ۳۸ء	۸۹-۹۱	بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است		
نظم معرّیٰ اور آزاد شاعری	ستمبر ۴۳ء	۳۱-۳۶	پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نہ رفت		
حالی، نذیر احمد، شبلی، آزاد میں سب سے			آفریں بر نظر پاک خطا پوش بود	اکتوبر ۴۸ء	۸۳-۸۴
بڑا انشا پرداز کون ہے؟	جون ۱۱ء	۵۴	عرفی اور شاہزادہ سلیم (کی محبت کا واقعہ)	نومبر ۲۵ء	۷۴-۷۹
فارسی شعراء کے قدیم تذکرے	نومبر ۶۱ء	۴۵-۴۷	کیا دیوان مخفی زیب النساء کا ہے	اکتوبر ۶۲ء	۴۳-۴۴
فارسی زبان اور طنزیات	دسمبر ۳۵ء	۷۶-۸۰	کیا یہ زیب النساء کے شعر ہیں۔		
فارسی زبان میں مثنوی کا کب رواج ہوا	اکتوبر ۳۲ء	۶۱-۶۴	نہ چوں فرہاد بود کوہ کنی پیشۂ ما		
فردوسی کا ایک شعر ؎			کوہ ما سینۂ ما ناخن ما تیشۂ ما	اگست ۲۵ء	- ۸۵
کفِ شاہ محمود عالی تبار			مرزا عبدالقادر بیدل	مارچ ۲۵ء	۷۳-۷۶
نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار (تشریح)	مارچ ۴۲ء	۴۵	بیدل کے اشعار (تشریح)	مارچ ۲۶ء	۸۳-۸۹
فردوسی کا ایک شعر ؎			بیدل کے چند اشعار (تشریح)	فروری ۳۴ء	۷۱-۷۳
بہ کردار چشم گوزناں دو چشمش			غالب و بیدل	مارچ ۳۰ء	۸۶-۹۱
ہمہ سحر و شوخی ہمہ رنگ و غش	ستمبر ۶۲ء	۵۴	غالب کے بعض فارسی اشعار (تشریح)	ستمبر ۵۹ء	۴۶-۴۸
مثنوی مولانا روم کا ایک شعر			غالب کی مثنوی نگاری	اکتوبر ۲۷ء	۷۵-۸۴
سزاوارست این جہان بے مدار			غالب کا شعر ؎		
ما پدر بو بکر ہم در وے خوار و زار (تشریح)	جون ۲۵ء	۸۹-۹۰	زہیچ پردہ محمل نگو زباد صبا برم		
مثنوی کا ایک شعر ؎			کہ می خاید بذوق فتنہ شاوردان مشکو را		
کور کورانہ مرو در کربلا			بے خطر از خودی برآ لب بہ انا الصنم کشا		
تا نیفتی چوں حسین اندر بلا	فروری ۲۶ء	۸۰	شیوہ گرو دار نیست در کنش کنشت را	نومبر ۶۰ء	۳۶
" " "			شاہ نعمت اللہ کی پیش گوئی	نومبر ۶۳ء	۴۷-۴۹
" "	اپریل ۲۶ء	۹۰-۹۵	(یہ) اقبال کا شعر نہیں ہے ؎		
حافظ اور ابن یمین	جون ۲۷ء	۹۲-۹۳	مُغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند		
حافظ کا ایک شعر ؎			ستارہ بشکنند آفتاب می سازند	اکتوبر ۵۹ء	۴۵
ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست			بعض فارسی اشعار کا مطلب	مارچ ۳۶ء	۷۵-۷۶
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست			کس کا قطعہ ہے ؎		
(تشریح)	نومبر ۶۲ء	۴۹-۵۰	آنکس کہ بداند و بداند کہ نداند		
			اسپ طرب خویش با فلاک جہاند	جون ۲۶ء	۸۴ ۸۸

عنوان	تاریخ اشاعت	صفحات
فارسی شعر		
پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی		
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی	جولائی ۴۲ء	۵۶-۵۹
کس کا شعر ہے		
درد دل گفتم تغافل کرد خواری را بہ بیں		
گریہ کردم خندہ زد بے اعتباری را بہ بیں	فروری ۴۱ء	۷۲
کس کا شعر ہے ؟		
سعادت و ہمہ اشرقت بہ شعاع طلعتک اعتلا		
زچہ روالست بہ حکم نزلی بزن کہ بلے بلے	اگست ۲۵ء	۸۱ - ۸۲
کس زبان کی شاعری ہے		
جوانگشت بدر مرا بروح کہ شو مرا		
یک شو بیا بردم تا ببینم چتو مرا		
(سپہ واری زبان)	اکتوبر ۲۹ء	۸۲ - ۸۴
ہندوستان سے شائع ہونے والا عربی رسالہ	جون ۲۳ء	۴۷
اہل عرب اور تغزل	اپریل ۳۸ء	۶۲ - ۶۴
عربی کے ایرانی اور افغانی شعرا	نومبر ۴۲ء	۲۹ - ۳۲
ہندی اور عربی شاعری	فروری ۲۶ء	۸۱ - ۸۳
عربی میں تقسیم علوم	اپریل ۲۵ء	۸۷ - ۸۸
ابو العلا کے حالات اور شاعری پر تبصرہ	دسمبر ۲۲ء	۱۳۹ - ۱۴۱
ابو العلا المعری	اگست ۲۵ء	۸۶
ابو العتاہیہ کے متعلق چند سوالات	ستمبر ۲۴ء	۶۹ - ۷۰
متنبی کی شاعری	مئی ۴۴ء	۴۲ - ۴۳
معین الزمان طرابلسی کا مرتبہ شاعری	مارچ ۲۴ء	۶۲ - ۶۸

جغرافیہ اور تاریخ

عنوان	تاریخ اشاعت	صفحات
بحر مردہ	جولائی ۲۳ء	۷۵
آذری اور اسفرائینی	نومبر ۶۱ء	۴۴ - ۴۵
بطالسہ اور عمالقہ کون قومیں تھیں اور کہاں آباد تھیں۔	اکتوبر ۶۱ء	۴۰ - ۴۱

عنوان	تاریخ اشاعت	صفحات
پرسی پولس کس شہر کا نام ہے ؟	اکتوبر ۶۲ء	۴۳
گزشتہ جنگ عظیم (۱۴ء - ۱۸ء)	نومبر ۳۸ء	۶۰ - ۶۲
موجودہ جنگ کا نتیجہ	فروری ۴۰ء	۶۴ - ۶۸
انقلاب فرانس	جولائی ۳۸ء	۶۰ - ۶۱
" "	اگست ۴۴ء	۵۱ - ۵۲
مونٹے کارلو	جنوری ۲۶ء	۸۰ - ۸۱
بالشویک حکومت کی رعایا نوازیاں	جون ۳۲ء	۶۷ - ۷۱
جعفر و عباسہ کا نکاح — زوال برامکہ	اپریل ۳۷ء	۷۳ - ۷۶
معاشقہ جعفر و عباسہ	اکتوبر ۶۲ء	۴۱ - ۴۲
ہمّنا پور — (محل وقوع)	جون ۲۵ء	۸۸
تاریخ اسلامی ہند کے اصلی ماخذ	نومبر ۳۰ء	۷۴ - ۸۳
سندھ میں عربی حکومت کا نشو و زوال		
عہد بابر سے قبل تاریخ ہند کا ماخذ اور		
معلم قنداہا کی تعیین	ستمبر ۳۰ء	۷۹ - ۸۵
حملۂ بابر سے قبل تاریخ ہند کا ماخذ	اکتوبر ۳۰ء	۸۱ - ۸۴
محمود و ایاز	مئی ۴۹ء	۴۳ - ۴۴
محمود و ایاز کی محبت کا راز	مارچ ۶۲ء	۴۲ - ۴۵
نوروز اور عہد مغلیہ	جون ۶۲ء	۴۷
اکبر کا دعوائے نبوت اس کا دین الٰہی	جولائی ۶۰ء	۹۵ - ۹۷
ہندوستان — موجودہ حالت اور		
گزشتہ تاریخ	ستمبر ۳۸ء	۵۵ - ۵۷
کشمیر (مختصر تاریخی حالات)	فروری ۳۲ء	۶۷ - ۷۰
عبد الوحید خاں اور مولانا آزاد		
(آزاد کی کتاب پر عبد الوحید خاں کے اعتراضات)	مئی ۶۱ء	۳۳ - ۳۴
ایران اور شیعی حکومت	جون ۳۹ء	۵۵ - ۵۷
ایران کا صفوی خاندان اور قاچاری حکومت	جون ۴۴ء	۷۴ - ۷۵
شرق اردن کی حکومت	جولائی ۳۲ء	۵۹ - ۶۰
قبرص — اقریطش سے متعلق تاریخ اسلام	اپریل ۳۷ء	۷۶ - ۷۸
خلفاء عباسیہ مصر	فروری ۲۵ء	۷۳

امریکہ اور گزشتہ جنگ عظیم	ستمبر ۲۷ء	۸۹-۹۰	تاناشاہ (کیوں کہتے ہیں)	جون ۲۵ء	۸۳
سوانح			رضا شاہ پہلوی کی داستان ترقی	ستمبر ۳۶ء	۶۸-۶۹
			رضا شاہ پہلوی اور حکومت ایران	فروری ۳۹ء	۷۱-۷۲
ابن رشد و شیخ الرئیس (مختصر حالات)	نومبر ۲۵ء	۷۱-۷۳	امیر دوست محمد خان (مختصر حالات)	اکتوبر ۲۵ء	۸۲-۸۳
لقمان (سورہ لقمان والے بزرگ کے حالات)	مارچ ۳۱ء	۵۹-۶۳	ہٹلر، مسولینی اور استالین کے نذائع		
سامری کون تھا؟	دسمبر ۲۳ء	۴۷۰-۴۸۱	آمدنی	اکتوبر ۲۹ء	۷-۷۱
سامری کون تھا اور سحر سامری کی حقیقت	دسمبر ۲۸ء	۹۳-۹۶	مہاراجا اور دے پور اور خاندانِ مغلیہ سے		
سامری کون تھا؟	اگست ۵۵ء	۵۱	رشتۂ ازدواج چتوڑ اور رامپور سے		
سلمان فارسی (مستند حالات)	فروری ۳۹ء	۶۵-۶۶	سادات حسینی کا نبی نسب	جون ۶۲ء	۴۶-۴۷
سرمد شہید	دسمبر ۵۲ء	۸۹-۱۰۱	قارون اور اس کی دولت	مئی ۲۸ء	۸۴-۸۶
سرمد شہید	دسمبر ۵۶ء	۵۰-۵۳	ابوالفضل کی قبر کہاں ہے؟	نومبر ۲۵ء	۷۴
منصور حلاج (حالات)	جولائی ۲۴ء	۷۶-۷۷	سید علاء، شاہجہاں کے عہد کے		
منصور حلاج اور فرقانی فرعون	جولائی ۲۵ء	۸۶-۸۷	صدر الصدور کا نسب نامہ	فروری ۲۵ء	۷۱-۷۲
شاہ دولہ کے چوہے	جون ۴۲ء	۴۴	عبداللہ پاشا - حالات	دسمبر ۲۲ء	۱۴۱-۱۴۲
شیخ بدیع الملک شیخ بایزید (کون تھے)	ستمبر ۱۵ء	۸۲-۸۳	شمرو بیگم (حالات)	نومبر ۲۵ء	۷۴
حاجی شریعت اللہ (اور ان کا مسلک)	ستمبر ۳۳ء	۶۶-۶۹	مانی و بہزاد	دسمبر ۴۵ء	۵۲-۵۴
علی محمد باب	جنوری ۲۵ء	۷۰	بہزاد (حالات)	جولائی ۳۸ء	۵۹-۶۰
کبیر تاریخی نقطۂ نظر سے	ستمبر ۴۴ء	۳۷-۳۸	بہزاد (تعارف)	دسمبر ۶۲ء	۵۷-۵۸
توت عنخ آمون	اگست ۲۶ء	۸۹-۹۰	تان سین کا مذہب	اپریل ۶۱ء	۱۰۳-۱۰۴
ملکہ جین (ٹیزی بسی)	دسمبر ۲۵ء	۷۵-۷۷	ملا دو پیازہ کی قبر (کہاں ہے)	اگست ۲۵ء	۸۳-۸۴
کیکاؤس - کیخسرو (تاریخی حالات)	اگست ۲۵ء	۸۲-۸۳	علامہ ابن تیمیہ (سوانح)	مارچ ۳۵ء	۷۰-۷۲
نظامی کا دادا کون تھا	اکتوبر ۶۲ء	۴۴	ڈانٹے اور اسلام	جون ۳۶ء	۶۳-۶۷
ظالم نیرو	اکتوبر ۳۱ء	۸۴-۸۶	حافظ شیرازی اور تیمور کی ملاقات	اپریل ۲۷ء	۶۸-۷۰
شجر الدر (مختصر حالات)	نومبر ۲۸ء	۸۳-۸۴	متنبی کی وجہ تسمیہ	جنوری ۲۴ء	۷۲-۷۳
سعد بن وقاص نے کہاں اور کس سال میں			اوزون فردوسی (ترک شاعر)	جون ۲۵ء	۸۳
انتقال فرمایا اور کہاں مدفون ہوئے۔	اگست ۲۳ء	۱۵	مجنوں (قیس عامری کے حالات)	مارچ ۳۲ء	۶۳-۶۴
ہلاکو (مختصر حالات)	دسمبر ۳۷ء	۶۶	البیرونی بیرونی (حالات)	اکتوبر ۳۰ء	۸۴-۸۶
الپ ارسلان (حالات)	مئی ۲۷ء	۶۶-۶۷	جرجی زیدان (حالات)	اپریل ۳۹ء	۷۰-۷۱
شاہجہاں اور شطرنج کا قصہ	جولائی ۳۲ء	۵۸-۵۹	میرا مذہب	مئی ۲۹ء	۹۰-۹۴

باب المراسلہ والمناظرہ

مالہ وما علیہ

جگر مراد آبادی کی غزل سے			اقبال احمد سہیل کی غزل سے		
روبروئے دوست ہنگامِ سلام آہی گیا			عجب نیرنگِ فطرت ہے سرشتِ نوعِ انساں بھی		
رخصت اے دیر و حرم دل کا مقام آہی گیا	مارچ ۴۵ء	۴۴-۴۵	یہی خود اہرمن بھی ہے یہی تصویرِ یزداں بھی	اگست ۵۰ء	۵۹-۶۰
جگر مراد آبادی کی ایک غزل			سیماب کی ایک نظم "غزال سے"		
شعر و نغمہ رنگ و نکہت جام صہبا ہو گیا			آ بتاؤں تجھ کو رازِ ارتقائے زندگی		
زندگی سے حسن نکلا حسن رسوا ہو گیا	جون ۴۴ء	۳۶-۳۷	اک تگاپوئے مسلسل اک جہت اور ایک دم	نومبر ۴۹ء	۵۱-۵۲
جگر مراد آبادی کی ایک غزل سے			سیماب اکبر آبادی کی غزل سے		
عشق کی بربادیوں کو رائگاں سمجھا تھا میں			راز آشنائی کا راز آشنا جانے		
بستیاں نکلیں جنہیں ویرانیاں سمجھا تھا میں	مئی ۴۹ء	۵۲-۵۳	دل سے جو نہ ہو آگاہ دل کی بات کیا جانے	نومبر ۴۳ء	۳۹-۴۰
جگر کی ایک غزل سے			سیماب کی ایک غزل سے		
کس کا خیال ہے دلِ مضطر لئے ہوئے			ہے عجیب فطرتِ آدمی، نہیں جانتیں اس کو کسی طرح		
آنسو ہیں رنگ و بوئے گلِ تر لئے ہوئے	مارچ ۴۷ء	۴۸-۴۹	کبھی مدعا سے گریز پا، کبھی مدعا کی تلاش ہے	ستمبر ۴۴ء	۵۴-۵۵
جگر مراد آبادی کی غزل سے			فراق گورکھپوری کی ایک غزل سے		
کیا کشمکشِ حسنِ بے پناہ میں ہے			جسے لوگ بتاتے ہیں زیرِ زمیں جسے کہتے ہیں عرشِ بریں پہ ہے		
جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے	ستمبر ۴۴ء	۴۴-۴۶	وہ جہنم بھی دنیا ہی میں ہے، وہ جنت بھی تو زمیں پہ ہے	مارچ ۴۷ء	۵۰-۵۱
جگر مراد آبادی کی غزل سے			ماہر القادری کی ایک غزل سے		
کیا مقامات ہیں ان سوختہ سامانوں کے			اس طرف بھی نظر اے دیدۂ صاحب نظراں		
خضر خود بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے	مئی ۴۵ء	۴۷-۵۰	ہم نے ذروں سے تراشے ہیں ستاروں کے جہاں	اپریل ۴۸ء	۴۹-۵۱
جگر کی ایک غزل سے			ماہر القادری کی ایک غزل سے		
ہر وہ حلقہ جو تری کاکلِ شبگیر میں ہے			جو چیز ہے سرگرمِ سفر ہو کے رہے گی		
گوشۂ امن بلاخانۂ زنجیر میں ہے	ستمبر ۴۷ء	۴۳-۴۴	ہر راہ تری راہگذار ہو کے رہے گی	اپریل ۴۵ء	۷-۸
جگر مراد آبادی کی ایک غزل سے			ماہر القادری کی ایک غزل سے		
ہم نے دنیا ہی میں دنیا کی حقیقت دیکھی			حسن شوخی بن گئے، جانِ نزاکت ہو گئے		
یہیں دوزخ نظر آئی یہیں جنت دیکھی	اپریل ۴۶ء	۵۰-۵۱	تم جواں ہو کر قیامت ہی قیامت ہو گئے	ستمبر ۴۸ء	۵۳-۵۴
جگر کی ایک غزل سے			ماہر القادری کی ایک غزل سے		
راز ہم پر ہوا افشا کسی کی خاص اک نظر سے پہلے			دلِ امیدوار کا عالم		
کہ تھی ہماری ہی کم نگاہی ہمیں تھے کچھ بے خبر سے پہلے	جولائی ۵۳ء	۳۷-۳۹	کچھ خزاں کچھ بہار کا عالم	اگست ۴۷ء	۴۹-۵۱

ماہر القادری کی غزل ؎
شگفتہ گل کو ہوا میسر نہ لالۂ دلنواز میں ہے
نشاط ہستی کا وہ تبسم جو نرگس نیم باز میں ہے ستمبر ۴۵ء ۵۳-۵۲
ماہر القادری کی غزل ؎
عشق نہ تھا تو کچھ نہ تھا محفل کائنات میں
عشق نے جان ڈال دی عالم بے ثبات میں مئی ۴۸ء ۵۸
ماہر القادری کی غزل
نظریں نئی نئی ہوں اشارے نئے نئے
دل ڈھونڈتا ہے روز سہارے نئے نئے اگست ۴۵ء ۴۸-۴۶
محوی لکھنوی کی غزل ؎
مے کش نواز ساقی بہلا نہ گفتگو میں
بس آج تو پلا دے جو کچھ بھی ہو سبو میں دسمبر ۴۴ء ۴۹-۴۸
ابو العلا ناطق لکھنوی کی غزل ؎
کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس کا درد ہے
میں سراپا دل ہوں میرا دل سراپا درد ہے مئی ۵۰ء ۵۸-۵۷
نخشب جارچوی کی غزل ؎
اہل ظاہر تیرا جلوہ کس نظر سے دیکھتے
دیکھنا بھی تھا تو چشم معتبر سے دیکھتے دسمبر ۴۴ء ۵۱-۵۰
وحشت کلکتوی کی غزل ؎
یہ رابطہ ظاہر داری کا کیوں مجھ کو دکھایا جاتا ہے
وہ مجھ سے نہیں ہے پوشیدہ، جو مجھ سے چھپایا جاتا ہے جون ۴۶ء ۵۴-۵۲
سیماب، آرزو، اثر، وحشت، نوح، مانی
نوش، اور ماہر کی ہم طرح غزلیں، طرح ؎
انھیں اندھیروں سے بزم گیتی کو ایک دن روشنی ملے گی نومبر ۵۰ء ۵۱-۴۳
علی اختر کی نظم بعنوان "تنقید" ؎
مجھے خیال کہ ہے رات کی جبیں تاریک
مجھے یقین کہ یہ بھی ہے موج گردش رنگ مئی ۵۶ء ۵۰-۵۶

جوش کی ایک نظم "آگ" ؎
آگ، جولانی، حرارت، مسکراہٹ، روشنی
آگ، ہستی، سرخوشی، مستی، جوانی، روشنی جولائی ۴۶ء ۴۸ - ۵۰
جوش ملیح آبادی کا مسدس بعنوان دختران
نوا کا کورس ؎
اپنے جلووں کو نگاہوں سے اگر ہم نہ چھپائیں
ذوق نظارۂ بیباک سے آنکھیں نہ چرائیں جولائی ۴۲ء ۳۹ - ۴۱
جوش ملیح آبادی کی ایک نظم ؎
"سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب" ؎
ایک افسوں بدوش ظلمت میں
ایک گہرے سکوت کا عالم مئی ۴۴ء ۴۴ - ۴۸
جوش ملیح آبادی کی نظم "سینۂ عدم میں
وجود کا پیچ و تاب" ؎
ایک افسوں بدوش ظلمت میں
ایک گہرے سکوت کا عالم اکتوبر ۴۴ء ۵۰ - ۵۲
جوش ملیح آبادی کی چھ رباعیاں مارچ ۴۷ء ۵۱ -
سیماب کی ایک نظم "افکار پریشاں" کا
ایک شعر ؎
ماند کر سکتی ہیں تاروں کو شعاعیں مہر کی
اکثریت، اقلیت کو ہضم کر سکتی نہیں اگست ۴۷ء ۵۱
سیماب کی نظم "علم و خبر"، ایک شعر ؎
ہر قطرۂ خوں میرا تحلیل ہوا لیکن
تصویر محبت میں اک رنگ تو بھر آیا ستمبر ۴۷ء ۴۵
سیماب اکبر آبادی ایک نظم "صبح بنارس"
طلوع آفتاب صبح ہے گنگا کے ساحل سے
جس جس طرح کوئی جاگتا ہو جاگ جہل سے جولائی ۴۴ء ۳۶ - ۳۹
علی سردار جعفری کی نظم "انفرادیت" ؎
آ رہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار اگست ۴۴ء ۴۲

عنوان	تاریخ	صفحات
ماہر القادری کی ایک نظم 'ان کی خوشی کی' — کتنی صبحوں کا ترنم، کتنی شاموں کا سکوت / کتنے نازک ترکتائے، کتنے سنجیدہ ثبوت	جون ۴۷ء	۵۴-۵۶
ماہر القادری کی نظم 'انقلاب زندہ باد'	اکتوبر ۴۴ء	۵۲-۵۳
ماہر القادری کی ایک نظم 'برسات کی ایک رات' — آیا تھا مرے گھر میں جو وہ جانِ گلستاں / اب تک ہے مرے گھر میں بہارِ گل و ریحاں	دسمبر ۴۴ء	۴۷-۴۸
ماہر القادری کی ایک نظم 'جوانی میں نوجوانی پر نوحہ خوانی' — زمین سے آسماں تک شادمانی / ارے توبہ وہ دورِ جوانی	اگست ۴۴ء	۴۲-۴۴
ماہر القادری کی ایک نظم 'فکر و پیام' کا ایک شعر — گھٹائیں چشم عنایت ادھر نہ فرمائیں / نہیں ہیں باغ یہ انگور کے، یہ ہے فالیز	ستمبر ۴۷ء	۴۵
ماہر القادری کی بعض رباعیاں	نومبر ۴۶ء	۵۸-۶۱

باب الانتقاد

عنوان	تاریخ	صفحات
مستحصلات الجعفر	مارچ ۶۲ء	۴۶-۴۷
تاریخ صحف سماوی مولفہ نواب علی	نومبر ۴۰ء	۵۵-۵۹
عبدالماجد دریابادی کا مختصر رسالہ روحانی دنیا (تبصرہ)	اگست ۴۰ء	۴۲-۴۷
اسد اللہ قریشی کی کتاب حضرت مسیح کشمیر میں	جون ۶۱ء	۳۸-۴۰
ہمارے علمائے کرام کی ذہنیت / فضائے دیوبند سے ایک عجیب و غریب آواز (بہشتی زیور اور بہشتی گوہر پر خیالات)	دسمبر ۴۷ء	۷۰-۷۲
سیرۃ النبی اور دارالمصنفین	دسمبر ۳۳ء	۶۵-۶۸
عثمان، علی و معاویہ تاریخ کی روشنی میں (بسلسلۂ تبصرہ خلافت معاویہ و یزید)	دسمبر ۵۹ء	۴۸-۵۳
خلافتِ معاویہ و یزید	اکتوبر ۵۹ء	۲۸-۴۳
ماجد و لین کیا ہے؟	ستمبر ۴۵ء	۴۶-۴۸
مطالعہ — ایک ہفتہ وار جریدہ	جون ۳۲ء	۴۷-۴۸
نقوش کا ادب عالیہ نمبر اور اس کا حصہ نظم	مئی ۶۰ء	۴۲-۴۷
" " "	جولائی ۶۰ء	۸۸-۹۲
ساہتیہ اکاڈمی کی ایک کتاب — اردو شاعری کا انتخاب	ستمبر ۶۱ء	۴۹-۶۰
موجِ کوثر و تسنیم (رادھا کی ایک غزل گو خاتون کے کلام پر تبصرہ)	جون ۳۱ء	۸۵-۸۷
" " "	جولائی ۳۱ء	۰-۹۰
مرقع چغتائی یعنی دیوانِ غالب کا مصور ایڈیشن	اکتوبر ۲۹ء	۵۳-۶۰
اصغر گونڈوی کا جدید مجموعہ کلام (سرودِ زندگی)	مارچ ۳۶ء	۴۸-۵۹
" " "	اپریل ۳۶ء	۵۹-۶۸
" " "	مئی ۳۶ء	۱۵-۲۴
" " "	جون ۳۶ء	۳۳-۳۵
اصغر کے سو شعر	فروری ۳۴ء	۵۹-۶۷
سیماب اکبرآبادی کا مجموعہ نظم کارِ امروز	اپریل ۳۵ء	۴۸-۶۰
" " "	مئی ۳۵ء	۴۱-۵۴
" " "	جون ۳۵ء	۶۱-۶۶
جگر کے سو شعر	مارچ ۳۴ء	۵۸-۶۳
تنقید پیام روح، غیر شاعرانہ نقطۂ نظر سے (حامد اللہ افسر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ)	مئی ۲۹ء	۶۲-۶۸
نشاطِ رفتہ — ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مجموعہ کلام	مارچ ۵۳ء	۳۸-۴۷

نیاز کے تبصرے

عارف نیازی

فروری ۱۹۲۲ء سے فروری ۱۹۶۳ء تک حضرت نیاز نے جن کتابوں یا رسائل پر تبصرے کئے ہیں ان کی تعداد بعض رسایل و جرائد کو چھوڑ دینے کے بعد ۱۸۴۴ ہوتی ہے، یہ وہ تبصرے ہیں جو حضرت نیاز نے خود تحریر کئے ہیں۔ اس سے ایک مقصود یہ بھی ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ پچھلے ۴۱ سال کے اندر کتنی کتابوں کا تعارف نگار کے ذریعہ سے کرایا گیا۔ تبصروں کی نوعیت سمجھنے کے لئے بعض تبصروں کی نقل بھی یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

ترجمان القرآن (جون ۱۹۳۳ء) ماہوار رسالہ ہے جو ۶ ماہ قبل مولوی ابو محمد صاحب مصلح کی ادارت میں حیدر آباد سے جاری ہوا تھا اور اب مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی اڈیٹری میں شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی مطالب قرآنی اور تعلیمات فرقانی کو ان کی صحیح و حقیقی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن جیسا کہ خود فاضل ایڈیٹر نے ظاہر کیا ہے "عہد حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں" ——— عہد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی و قدامت پرستی کا تھا کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا، لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور انکشافات حاضرہ نے "عمل و خیال" کی بالکل نئی طرح ڈال کر "حریت فکر و ضمیر" کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے، کوئی مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا بھی طرز عمل یہی تھا اور وہ بھی وہی سوچتے سمجھتے تھے جو اب بتایا جاتا ہے۔

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بتایا جاتا ہے۔ اگر پہلے ایک رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاتی تھی تو اب "علوم مقناطیسیہ" انہیں معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہیں ——— پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر "عرش و کرسی" والے خدا کو پکار سکتا تھا لیکن آج جبکہ آسمان ہی کوئی چیز نہیں رہا ان کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ الغرض اب زمانہ "یومنون بالغیب" کا نہیں رہا، بلکہ "یومنون بالتجربۃ والشہود" کا ہے اور اس لئے ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں۔ جبکہ خود نفس "مذہبیت" کا خیال بھی اپنی جگہ چنداں قابل قبول نہیں۔

اس وقت تک جتنے مذہبی رسائل مسلمانوں کے نکلے ہیں ان سب کی شان یہی رہی ہے کہ مخاطب کو مسلمان سمجھ کر خطاب کیا گیا ہے اور میرے نزدیک یہ پہلی کمزوری ہے جو کسی مذہب والے کی طرف سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ضرورت ایسے رسایل کی ہے جن میں مسلم و غیر مسلم دونوں سے خطاب کیا جائے اور جتنے خدشات و شبہات ایک شخص کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کو

سامنے رکھ کر دلائل کو استوار بنایا جائے ـــــــ محض یہ کہہ دینا کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے، یا احادیث میں یوں بتایا گیا ہے، یا ہمارے فقہا و علما یہ کہہ گئے ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک مسلمان کی زبان بند کر کے طوعاً یا کرہاً اس کا سر انقیاد جھکا سکتے ہیں، لیکن جس چیز کو صحیح یقین کہتے ہیں وہ ایک مذہب ایمان والے مسلمان کے دل میں بھی روشن نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ ایک غیر مسلم یا کافر و ملحد جو آپ کی کسی کتاب سے مرعوب ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اس لئے اگر یہ رسالہ بھی صرف مسلمانوں کے لئے جاری کیا گیا ہے اور غیر مسلم اس سے نور ہدایت حاصل نہیں کر سکتا تو بیکار ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ خود ایڈیٹر کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر ان کے لئے مناظرہ کا باب کھولنا ضروری ہوگا (درانحالیکہ وہ اپنے اشتہار میں اس سے علٰحدہ رہنے کا اظہار کر رہے ہیں)

چاہیئے تو یہ تھا کہ مولوی ابو الاعلیٰ صاحب ذاتی و انفرادی احساس و یقین کی بنا پر خواہ کچھ ہوتے، لیکن رسالہ نکالتے ایک غیر مسلم کی حیثیت سے اور پھر اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر وہ اسلام کی صداقت کو ثابت کرتے، لیکن وہ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کی ترتیب ہی میں وہ کچھ ایسی بات پیدا کر دیں جو ایک غیر مسلم کو اس کے مطالعہ کی طرف مائل کر سکے ـــــــ میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ خواہ مخواہ کلام مجید کی آیتیں یا دوسری عربی کتابوں کی عبارتیں نقل کر کے پہلے ہی سے ایک غیر مسلم کے دل میں وحشت پیدا کر دی جائے اور وہ نگاہ ڈالتے ہی رسالہ کو بند کر کے رکھ دے۔ اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ ظاہری حیثیت اور انشاء و تحریر کے لحاظ سے بھی اس کو "اغیار" کے مطالعہ کے قابل بنایا جائے۔ اگر وہ فی الحقیقت اسلام کی صحیح خدمت انجام دینا ہے۔

قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقاد پیش کئے گئے ہیں اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے۔ حصہ اول کے متعلق نہ زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی، کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں۔ البتہ حصہ دوم اور حصہ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہیئے، کیونکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات عادلیہ نے انہیں دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قایم کر کے تمام اُن آیات قرآنی کا استقصاء کرنا چاہیئے جو عقاید و قصص سے متعلق ہیں اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا متعین کر کے ان اعتراضات کو رفع کرنا چاہیئے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ صرف پند و موعظت کو شعار بنا لیا تو پھر یہ رسالہ صرف بچوں، عورتوں اور جاہلوں ہی کے پڑھنے کی چیز رہ جائے گا اور علمی، تحقیقی دنیا میں اسے کوئی نہ پوچھے گا۔

مولوی ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کا جاننے والا صرف میں ہی تھا اور اس لئے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ باوجود قدامت پسند ہونے کے وہ بہت سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں، خدا نے "فکر سلیم" کی توفیق بھی انہیں دی ہے اور اگر ضرورت و ماحول کے اقتضاء نے انہیں مجبور نہ کر دیا تو ہمیں امید رکھنا چاہیئے کہ وہ ترجمان القرآن کو صرف پرانے خیالات کے مولویوں کا پرچہ نہ بننے دیں گے، بلکہ جدید روشن خیال والوں کے لئے بھی اس کو مفید بنانے کی کوشش کریں گے ـــ

محرم کا رسالہ جو ہمیں موصول ہوا ہے اس کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق ہم کوئی رائے قایم کرنا مناسب نہیں سمجھتے، کیونکہ یہ نئے اڈیٹر کی پہلی فکر کا نتیجہ ہے۔ آئندہ کے لئے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی و الہام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے

سمجھنے پر کلام اللہ کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے اور پھر مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت ولامذہبیت کا ہے۔ میں جو لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام الٰہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کرتے ہیں، اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کرونگا اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہوگئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ " ناچار مسلمان شو" کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، اس کا ایک بڑا سبب " عقیدۂ معاد " بھی ہے۔

۲۔ متعہ اور اسلام نومبر ۱۹۳۳ء

امامیہ مشن لکھنؤ کا دسواں تبلیغی رسالہ ہے، جس میں فاضل مؤلف سید علی نقی صاحب نے جواز متعہ، نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کرنا چاہا ہے۔ مولانا موصوف نہایت صاف و شگفتہ لکھنے والے لوگوں میں سے ہیں اور کسی جگہ تہذیب و متانت سے نہیں ہٹتے، اس لئے نفسیاتی طور پر ان کی تحریر میں بھی اثر ہوتا ہے اور اوران کے دلائل میں بھی ایک خاص قوت مضمر ہوتی ہے۔

متعہ کا مسئلہ نہایت مشہور اختلافی مسئلہ ہے اور منجملہ ان مسائل کے ہے جو سنی، شیعہ کے درمیان نمایاں طور پر خط فاصل کھینچنے والے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ متعہ، ابتدائے عہد اسلام میں رائج تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ علماء اہل سنت اس وقت تک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ اس کا رواج کب ممنوع قرار دیا گیا، لیکن میری رائے میں یہ مسئلہ بھی معاشری مسائل سے تعلق رکھتا ہے اور ضرورت زمانہ کے لحاظ سے اس میں بھی تبدیلی ہونا چاہیئے۔ یعنی اگر اس وقت کی حالت اس کی مقتضی ہے کہ اسے جائز رکھنا چاہیئے تو بیشک اس کو جائز رہنا چاہیئے خواہ وہ کسی وقت ممنوع ہی کیوں نہ قرار دیا گیا ہو اور اگر حالات کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کے رواج کو بند کر دیا جائے تو اسے قطعاً ناجائز قرار دینا چاہیئے خواہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا موصوف نے ابتدا میں فطرت انسانی کے لحاظ سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کر کے متعہ کے جواز کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن بہتر ہوتا اگر فاضل مصنف اسی کے ساتھ سوسائٹی کے نظام اور اس کے مصالح پر بھی غور فرما لیتے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی زندگی میں بعض اوقات بعض گتھیاں ایسی بھی پڑ جاتی ہیں، جو صرف متعہ کے ذریعہ سے سلجھائی جا سکتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت مسلمہ ہے کہ قانون یا شریعت کی تنظیم فطرت انسانی کے روشن پہلو کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے اور " امکانات تاریک " کی رعایت کبھی نہیں کی جاتی ورنہ " اصلاح " کا کوئی مفہوم باقی نہ رہے۔

عہد سعادت میں متعہ رائج تھا یا نہیں، بعد کو وہ ممنوع قرار دیا گیا یا نہیں یہ بحث فضول ہے، لیکن یہ ضرور قابل غور ہے کہ عہد حاضر میں جبکہ آزادی تمام جائز حدود سے گزرنا چاہتی ہے، متعہ کا جواز کہیں " ادارہ فحاشی " کی صورت تو اختیار نہ کرے گا اور سوسائٹی اس کو برداشت کر سکتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایران میں جہاں صدیوں سے متعہ کا رواج چلا آ رہا تھا رضا شاہ پہلوی نے اس کو بالکل بند کر دیا، کیونکہ اس وقت جبکہ عورتوں کا پردہ اٹھتا جا رہا ہے، متعہ کا جواز جو آفتیں ڈھا سکتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور اس کو صرف اس دلیل پر کبھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ برے کام کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔ جس حد تک منقولی دلائل کا تعلق ہے، مولانا یقیناً اسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں جس حد تک ایک مخالف مولوی کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ روایات احادیث کے دفتر بے پایاں سے ہر شخص اپنے اپنے مطلب کی باتیں نکال سکتا ہے اور اسی لئے میں اس طریق استدلال کو کبھی پسند نہیں کرتا۔

مارچ ۲۲ء

تاریخ جہاں آرا بیگم ضیاء الدین احمد برنی

جولائی ۲۲ء

ادب نگارستان فارس (آزاد)

نظم آئینۂ حرم (ز۔خ۔ش)

فسانہ پدم بتیسی (پریم چند)

فسانہ چترا (ٹیگور)

نظم راہ و رسم منزل ہا (سالک بٹالوی)

ناول ثالث بالخیر (ترجمہ ترکی ناول) سجاد حیدر

فسانہ چمپا (سالک بٹالوی کے افسانے)

سفید خون (نارائن پرشاد)

ناول بازارِ حسن (پریم چند)

ناول شیخ حسن (ممتاز حسن)

فسانہ قطرات اشک (راشد الخیری)

فسانہ شاہین و دراج (راشد الخیری)

فسانہ خونابۂ عشق (فیروز الدین مراد۔ ترجمہ کانن ڈایل

ادب خیالستان (سجاد حیدر یلدرم)

افسانہ منجلے (افسانہ۔ نقیب پریس

ستمبر ۲۲ء (صفحہ ۸۰)

تذکرہ ذکریٰ ابی العلاء (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)

تذکرہ امین الریحانی (الہلال مصری)

نظم حزنِ اختر (مثنوی واجد علی شاہ)

تاریخ اسلام کا اثر یورپ پر (اختر جوناگڈھی)

اکتوبر ۲۲ء (۷۶ - ۸۰)

۷۹ نظم روح نظیر محمور اکبرآبادی

ادب۔ ازہار العرب عربی ابو عبداللہ

سیاست۔ آزاد ہندی ترجمہ (سہیل نگینوی)

تذکرہ۔ ٹالسٹائی ترجمہ (بدر منیر)

سیاست اتحادِ اسلام (اطولی مسلمان)

سیاست میزان (سیٹھ چاند بھائی)

ناول تاجر البندقیہ (عربی

ناول۔ کیتھرائن ثانی (〃)

فلسفہ فلسفۃ الحیاۃ (〃)

نجوم علم التنجیم (〃)

ادب الاسلوب المفید (〃)

ادب کلمات و اشارات (〃)

۸۰ ادب المساوات (〃)

نومبر ۲۲ء (ص ۷۹)

سیرۃ سیرۃ الرسول محمد اسلم جیراجپوری)

تاریخ سیر ایران (آزاد)

سیرۃ کلمات طیبات (شرف الدین)

تاریخ ماہ کامل (کامل جوناگڈھی)

دسمبر ۲۲ء ۱۴۶ - ۱۵۱

تاریخ خلافت موحدین (نعیم الرحمان)

تذکرہ۔ حیات خسرو (شبلی)

ادب مکاتیب اکبر (عزیز لکھنوی)

سیاحت مکتوبات فرنگ (عبدالغفور بسمل)

فروری ۱۹۲۳ء (۱۵۶-۱۶۰)

ڈرامہ　ڈرامہ اکبر　محمد حسین آزاد
مذہب　خلافت الٰہیہ　عبدالماجد بدایونی
نظم　کلام جوہر　مولانا محمد علی
مذہب　تاریخ القرآن　اسلم جیراجپوری
نظم　دیوان حسرت کا انگریزی ترجمہ　رحم علی ہاشمی
ناول　دغا - ناول　انصاری گسمنڈوی
تذکرہ　جہانگیر و نور جہاں　بینی پرشاد
ناول　چندن　سدرشن

مئی ۱۹۲۳ء ۳۹۶-۳۹۹

تنقید . التنقید فی ولادت المسیح　(امام الدین گجراتی)
نظم　ارمغان کلام　کلام جیراجپوری
نظم　نیرنگ اعظم　(غزلیات نواب لوہارو)
ادب　نیرنگ خیال حصہ دوم　محمد حسین آزاد
سیاحت　سفرنامہ اسیر مالٹا　(محمود الحسن دیوبندی)
تاریخ　تاریخ خلافت حصہ دوم　(عبدالماجد بدایونی)
مذہب　فلاح دارین　(")

جون ۱۹۲۳ء ۷۹

سیاحت　سیر و سفر　(مہاراجہ کشن پرشاد)
سیاحت　سفر شاد نگر　(")

اگست ۱۹۲۳ء ۱۵۶-۱۵۹

تاریخ　اخبار الاندلس　خلیل الرحمان
اخلاق　رفیق النساء　(خادم حسین)
تاریخ　اسوۂ صحابیات　عبدالسلام ندوی
مذہب　الوراثت فی الاسلام　(اسلم جیراجپوری)

تاریخ　مشرقی ترکستان　ترجمہ (محمود اعظم فہمی)
نظم　درس عمل　منظومات محوی

دسمبر ۱۹۲۳ء ۸۰-۸۴

تذکرہ　سیرۃ مصطفیٰ کمال پاشا　آغا رفیق بلند شہری
ناول　ماہِ نو　ترجمہ ٹگور، افسر میرٹھی
تاریخ　تاریخ الامت حصہ ۴　اسلم جیراجپوری

فروری ۱۹۲۴ء ۷۸-۷۹

سیاست　جدید دنیائے اسلام　ترجمہ جمیل الدین بدایونی
ادب　افادات مہدی　مضامین مہدی
نظم　شرح دیوان غالب　عبدالولی

مئی ۱۹۲۴ء ۷۶-۸۰

تذکرہ　ابن رشد　محمد یونس انصاری
نظم　دیوان شاد　شاد عظیم آبادی
تنقید　کاس الکرام　(ولی اللہ ایٹ آبادی)
ڈرامہ　قوم پرست　ڈرامہ۔ سدرشن
فسانہ　کنج عافیت　فسانہ۔ سدرشن
تمدن　علم مجلسی　عزیز دہلوی
ڈرامہ　ہمارا گھر　ڈرامہ عبداللطیف

جولائی ۱۹۲۴ء ۷۹

تاریخ　تاریخ عرب موسیو سیدیو ترجمہ عبدالغفور خاں
ادب　گوہر بن نامہ　(احسن اللہ خاں ثاقب)
نظم　اسرار ہستی　(رضا حسین گویا)

اکتوبر ۱۹۲۴ء ۷۴-۸۰

ادب　مضامین شرر　(شرر)

سیاست سیاسیات محمد اجمل خاں

تاریخ تاریخ مغرب ترجمہ جمیل الرحمان

ادب مکاتیب (محسن الملک، وقار الملک) محمد امین زبیری

ناول باغبان ترجمہ (ٹیگور) حامد حسن قادری

اخلاق خطوط سرسید مرتبہ راس مسعود

مذہب تذکرہ عنایت اللہ خاں مشرقی

مذہب خریطہ (")

تاریخ مرقع بابریہ ترجمہ (مشتاق علی خاں)

دسمبر ۱۹۲۴ء ۸۹ - ۹۰

تاریخ :- تاریخ الامت حصہ ۵ اسلم جیراجپوری

جنوری ۱۹۲۵ء ۸۵ - ۸۷

نظم خیابانِ عرفاں (رباعیات محمد حسن بلگرامی)

مذہب فتنۂ خلقِ قرآن ترجمہ (امام خاں نوشہروی)

طب آئینۂ امراض حوامل (ڈاکٹر عطا محمد)

نظم بانگِ صداقت (نظم نظیر لودھانوی)

تذکرہ سیرتِ غوث الاعظم (زاہد القادری)

مذہب مشکوۃ الانوار (")

تذکرہ اسوۃ النبی (")

مذہب معارف القرآن (")

مذہب کلام المبین (")

ناول بہرام کی رہائی (ظفر عمر)

فروری ۱۹۲۵ء ۸۵

لغت نور اللغات (نور الحسن)

نظم صیدیہ (مثنوی - وزیر علی صبا)

مارچ ۱۹۲۵ء ۸۵ - ۸۹

مذہب کشاف المہدی (سیٹھ یعقوب حسن)

ڈرامہ ست ساگر۔ تاریخ ڈرامہ (نور الٰہی محمد عمر)

تاریخ تاریخ افاغنہ (پروفیسر عبد المجید)

ادب گلابی اردو (ملا النوری)

مرثیہ معراج الکلام (مرثیہ اوج لکھنوی)

نظم تجنۃ الاسلام (اکبر شاہ خاں)

نظم نمکدان فصاحت (میر ولی اللہ)

اگست ۱۹۲۵ء ۹۵ - ۹۶

ناول حلقۂ مسموم ناول (ترجمہ نصیر احمد عثمانی)

تاریخ ہندو مذہب میں قربانی (معین الدین)

نظم اثرستان (دیوان اثر لکھنوی)

دسمبر ۱۹۲۵ء ۸۹ - ۹۴

تاریخ سیر الانصار حصہ ۲ (سعید انصاری)

تذکرہ شعر الہند (عبد السلام ندوی)

ناول خوارزم شاہ ترجمہ سید سجاد حیدر

سوانح شاد عظیم آبادی (سوانح)

تاریخ گفتگوئی تاریخ الاسماء (ابرار حسین فتحپوری)

مارچ ۱۹۲۶ء ۹۰ - ۹۳

نظم روحِ نشاط (دیوان اصغر گونڈوی)

نظم بادۂ ناب (رباعیات فارسی میر ولی اللہ)

سوانح گلشنِ حیات (سوانح شاد عظیم آبادی)

فلسفہ قیل و قال فلسفہ (محمد فاروق)

تنقید نقادی کے نکتے (محمد علی ردولوی)

قریۂ ویران ترجمہ انگریزی (راحت حسین)

ڈراما پردۂ غفلت ڈراما عابد حسین

جون سنہ ۲۶ء ۷۷ - ۸۰

تاریخ تاریخ السلف تذکرہ خواجہ معین الدین چشتی (عبدالباری)
فلسفہ فلسفیانہ مضامین (عبدالماجد دریا بادی)
تاریخ انقلاب فرانس ترجمہ عربی (عبدالرزاق ملیح آبادی)
نظم قصاید مومن (ضیاء احمد بدایونی)
طب قرابادین مفید عام (حکیم محمد شریف)
نظم باغ فردوس دیوان (ولایت علی)
تذکرہ مناقب رزاقیہ (صبغتہ اللہ شہید)
اخلاق ملفوظ رزاقی (عبدالباری فرنگی محل)
ہیئت ہیئت جدید (منہاج الدین)
علم فرہنگ اصطلاحات علمیہ (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد)

ستمبر سنہ ۲۶ء ۸۲ - ۹۰

تذکرہ خصایص مرتضوی (شاعر لکھنوی)
ادب ادب العرب (زبید احمد)
ادب آداب شاعری (عالی رفاعی)
مذہب الکلام فی ازالۃ الاوہام (حکیم محمد ابراہیم)
نظم نقش ارژنگ دیوان (جلال الدین)
تذکرہ شعر الہند حصہ دوم (عبدالسلام ندوی)
نظم فغان آرزو دیوان (آرزو لکھنوی)
ادب مرآۃ الشعر (عبدالرحمان)
تاریخ آئینہ حقیقت نما (اکبر شاہ خاں)

نومبر سنہ ۲۶ء ص ۹۶

نظم صبح وطن دیوان (چکبست لکھنوی)

جنوری سنہ ۲۷ء

فلسفہ نفسیات ترغیب (عبدالماجد دریابادی)
ادب خطوط شبلی (شبلی)
تذکرہ یاد ایام (عبدالحی)
نظم اصلاح سخن (شوق سندیلوی)
افسانہ احمد خاں وغیرہ فارسی افسانہ (آقا کربانی)
تاریخ البیت المعمور (سید علی نقی)
نظم آئین درود (فرجا کوتالوی)
نظم مثنوی سحر شکنتلا (سحر ہنگامی)
نظم سید گل دیوان (شاعر لکھنوی)
مذہب غذائے روح ترجمہ بھاگوت گیتا (برجھو دیال)
نظم دوشیزہ حصہ اول مجموعہ کلام (موہن سنگھ دیوانہ)

اکتوبر سنہ ۲۷ء ۸۵ - ۹۲

تذکرہ نٹشے (مظفر الدین)
تاریخ دنیائے افسانہ (عبدالقادر سروری)
فلسفہ تاریخ فلسفہ اسلام (عابد حسین)
سیاست بیداری ہند (ترجمہ مضامین گاندھی جی)
ادب عروس ادب (ہوش بلگرامی)
نظم پریم درپن (مہاراجہ شاد)
نظم شرح خاقانی (شادان)
افسانہ سیر گل افسانے (جلیل قدوائی)
ادب مرقع ادب (صفدر مرزاپوری)

نومبر سنہ ۲۸ء ۸۹ - ۹۶

تاریخ طبقات الامم (ترجمہ کتاب ابو القاسم اندلسی) (اختر جوناگڈھی)
تاریخ قسطنطنیہ میں ترکوں کی واپسی ترجمہ کتاب الگزنڈر پاول (نجم الغنی)

مذہب اولی الالباب سے خطاب (سید سعید الدین)
سیرت سیرۃ النبی جلد ۳ پر تنقیدی نظر (محمد ثمر)
" فخر کائنات (مسعود الرحمان)
مذہب اسلامی مساوات (حفیظ اللہ)
ڈرامہ فارسی وکلائے مرافعہ (ترجمہ ترکی) محمد مسلم
فسانہ محبت ترجمہ ٹالسٹائی (عبدالرزاق ملیح آبادی)
" ملتازار ترجمہ اناتول فرانس (")
" ابن سراج ترجمہ از عربی (بدرالدین احمد)
نظم جواہر کلیات نظیر (مختار۔ ہاشمی۔ ذہین)
تاریخ مادرِ ہند ترجمہ از انگریزی مدر انڈیا (خالد)
تذکرہ ابن یمین (عبدالسلام ندوی)
تنقید روح تنقید حصہ دوم (غلام محی الدین قادری)
ادب نظم و نثر۔ لطیفیات مضامین (لطیفی لدھیانوی)
نظم تصویرِ افکار مجموعہ کلام (کیفی حیدر آبادی)
مذہب حقیقت التناسخ (عبدالوہاب)
نظم کلیات حسرت (حسرت موہانی)
ادب متروکات سخن (")
" انتخاب سخن۔ جرأت (")
درسیات انشائے جدید فارسی (اثر رامپوری)
ادب و تنقید ارباب نثر اردو (سید محمد قادری)
تاریخ۔ پارسی علوم و اسلام (محمد مسلم)
حفظانِ صحت۔ محاسن ورزش (فضل حق)

مئی سنہ ۲۹ء ۸۵ - ۸۹

تذکرہ۔ حیات جلیل بلگرامی (مقبول احمد صمدنی)
نظم۔ دیوان شوق (شوق قدوائی)
تاریخ۔ ہندوستان کے معاشرتی حالات (عبداللہ یوسف علی)
فسانہ۔ ڈالی کا جوگ (ناصر میرٹھی)
ادب۔ نگار رموزی (" رموزی)

لغت تصحیح اللغات (رفیع احمد)
جنسیات۔ صلاح کار (محمد علی رودلوی)
تذکرہ تذکرۃ الخواتین (عبدالباری آسی)
نظم۔ دیوان درد (")
تاریخ۔ تاریخ تاج محل (معین الدین)
زراعت۔ فن زراعت مالوہ (ضیاء الدین حیدر)
اخلاق۔ عمل تسخیر (ظہور احمد)
طب۔ دق و سل (محمد عمر)
تاریخ۔ اسلام و غیر مسلم (حفیظ اللہ)
ڈرامہ۔ قوم پرست طالب علم (عبدالغفار)
زراعت۔ گائے بیل (محمد نصیر)
ادب۔ تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ۔ محمد عسکری)

اپریل سنہ ۳۰ء ۸۱ - ۸۷

ادب۔ اردو شہ پارے (محی الدین قادری)
سیرۃ۔ مختصر تاریخ اسلام حصہ ا (خلیل الرحمٰن)
ادب۔ اردو زبان اور ادب (ضامن علی)
ادب۔ کردار اور افسانہ (عبدالقادر سروری)
نظم۔ تابشِ خیال مجموعہ کلام (افسر امروہوی)
درسیات۔ نصاب مرغوب عربی (قمر علی)
درسیات۔ المعلم نصاب عربی (قمر علی)
" مصباح الابصار عربی (قمر علی)
نظم۔ درخت خرد (قمر علی)
فقہ۔ القضاء فی الاسلام (عبدالسلام ندوی)
تاریخ۔ قول حق (اکبر شاہ خاں)
ادب۔ غلط العوام (منیر لکھنوی)
ادب۔ محاورات نسواں (")
ادب۔ بازاری زبان (")
تاریخ اسلامی کارنامے (حفیظ اللہ)

ڈرامہ ۔ پیامِ محبت (رام سروپ کوشل)
ادب ۔ ادب اعجاز ۔ چاند ۔ انکشافات
معلومات ۔ خاتونِ مشرق (رسایل)

جولائی ۱۹۳۰ء ۷۶ ۔ ۸۰

ادب ۔ افادات سلیم (وحید الدین سلیم)
ادب ۔ عرب کی شادی (")
نظم ۔ دیوان تاباں (عبدالحیٔ تاباں)
افسانے ۔ دلگداز افسانے (کوثر چاندپوری)
ادب ۔ معانی و بیان (محمد رفیع)
تذکرہ ۔ تذکرہ ریختی (تمکین کاظمی)
آثار ۔ مآثر دکن (علی اصغر بلگرامی)
معاشیات ۔ معاشیات (حبیب الرحمان)
تاریخ ۔ تاریخ الامت حصہ (اسلم جیراجپوری)
تذکرہ ۔ فارسی بلگرام (علی اصغر بلگرامی)
تذکرہ فارسی ۔ گلشن گفتار (حمید اورنگ آبادی)
نظم فارسی ۔ دیوان مجذوب (محمد مجذوب تبریزی)
لغت فارسی ۔ جواہر اللغات (بیشیشر دیال)
ڈراما ۔ زنگاری بیگم ۔ ترجمہ فرانسیسی (اثر لکھنوی)
نظم ۔ نقش ونگار مجموعہ کلام (جلیل احمد قدوائی)

ستمبر ۱۹۳۰ء ۹۴ ۔ ۹۵

ادب ۔ موجِ تبسم مضامین (شوکت تھانوی)
تاریخ ۔ شوپنہار ترجمہ (مجنوں گورکھپوری)

نومبر ۱۹۳۰ء ۸۸ ۔ ۸۹

سیاسیات ۔ تلاشِ حق گاندھی ترجمہ (ڈاکٹر عابد حسین)
ادب ۔ مضامین فرحت (فرحت اللہ بیگ)
افسانے ۔ قدیم افسانے (عبدالقادر سروری)

تنقید ۔ حافظ شیراز (سید یونس)
سیاسیات ۔ بغاوت عرب اور لارنس (چراغ حسن حسرت)
مذہب ۔ انجیل و قرآن کا مطالعہ (محمد عبداللہ)
سیاحت ۔ روزنامچۂ مقدس (اڈیٹر نیر اعظم)
فسانہ ۔ دنیا کی حور (کوثر چاندپوری)
نظم ۔ پیمانۂ محبت (ہمدم)
اخلاق ۔ باب الانعام (انعام الرحمان)
" ۔ تعلیم الرحمان (")
مذہب ۔ الجہاد فی الاسلام (ابوالاعلیٰ مودودی)
ڈراما ۔ ضحاک (اختر شیرانی)

فروری ۱۹۳۱ء ۷۳ ۔ ۸۰

لسانیات ۔ ہندوستان فونیٹکس (محی الدین قادری)
تاریخ ۔ علاؤالدین خلجی (سلطان حمید)
تاریخ ۔ دولت غزنویہ (محمود الرحمان)
تاریخ ۔ نیرنگ زمانہ (علی حسن)
تاریخ ۔ تاریخ ریاست حیدرآباد (نجم الدین)
تاریخ ۔ تاریخ مغربی یورپ ترجمہ انگریزی (محمد یحییٰ)
تاریخ ۔ سیرۃ نبوی و مستشرقین ترجمہ (عبدالعلیم)
نظم ۔ انتخاب سودا (ثاقب کانپوری)
مناظرہ ۔ اصل الاصول (پیام اسلام)
اخلاق ۔ ہندو اخلاقیات (ترجمہ) (غلام ربانی)
افسانے ۔ پرانا خواب اور دو افسانے ترجمہ ترکی (سید سجاد حیدر یلدرم)
ادب ۔ پطرس کے مضامین (پطرس)
مذہب ۔ گائے اور قربانی (اکبر شاہ خاں)
مذہب ۔ وید کی قدامت (")
تفسیر ۔ عبادت کی غایت (ابوالفضل)
اخلاق ۔ رنج و راحت (سردار خاں)
تاریخ ۔ اسلامی روایات انگریزی (حفیظ اللہ)

مذہب ۔ تعلیم اسلام (معین الدین)
مذہب ۔ محاسن اسلام (عبدالقادر بیگ)
تفسیر نورالحق (نورالحق)

اگست سنہ ۳۱ء

تاریخ ۔ مسلمانان اندلس (اکبر شاہ خاں)
" ۔ نواب امیر خاں (")
ادب ۔ قواعد مضمون نویسی (مظفرالدین)
تاریخ ۔ جنگ رنگون (اکبر شاہ خاں)
فلسفہ ۔ مبادی نفسیات (عبدالحمید)
تاریخ ۔ محمود گاواں (ظہیرالدین)
افسانہ ۔ انگریزی افسانے (مکتبہ ابراہیمیہ)
ڈرامہ ۔ حلم اسود (اشتیاق حسین)
خطوط نویسی ۔ مخزن ادب (عبدالشہید)
افسانہ ۔ لبس کا روکھ ترجمہ (فدا علی)
تاریخ ۔ البدر (عبدالواسع)
نظم ۔ دیوان حفیظ (حفیظ جونپوری)
نظم ۔ دیوان آسی (عبدالعلیم)
تاریخ ۔ ہندوستان کی بہادر عورتیں (ایوان اشاعت)
ادب ۔ بحر تبسم (شوکت تھانوی)

اکتوبر سنہ ۳۱ء ۸۹ - ۹۰

نظم ۔ روح جذبات (اکبر حیدری)
نظم ۔ مثنوی ناسخ (ناسخ)

فروری سنہ ۳۲ء ۴۱ - ۴۷

نظم ۔ تجلیات فرخ (فرخ بنارسی)
افسانہ ۔ آنکھ کا نور اور افسانے (افسر میرٹھی)
سیرت ۔ مولود ہمایوں (محمد موسیٰ خاں)

نظم ۔ جام صہبائی (اثر صہبائی)
تاریخ ۔ اقبالنامہ جہانگیری (عبدالمالک)
سوانح ۔ احقاق حق (محمد ادریس خاں)
تاریخ ۔ بیرم خاں (علی کوثر چاندپوری)
نظم ۔ فروغ بیان مجموعہ کلام (شاد صابری)
ڈرامہ ۔ گناہ کی دیوار (اشتیاق حسین)
ڈرامہ ۔ ہمزاد (")
" ۔ کھیتی (محمد مجیب)
نظم ۔ قصائد صحیفہ ولا (عزیز لکھنوی)

جولائی سنہ ۳۲ء ۶۲ - ۶۴

نظم (فارسی) انتخاب دیوان شمس تبریز (عبدالمالک آروی)
ادب ۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات (نصیرالدین ہاشمی)
فلسفہ ۔ آزادی۔ ترجمہ انگریزی (سعید انصاری)
تصوف ۔ آئینہ معرفت (اعجاز حسین)
تاریخ ۔ سیرۃ النبی و مستشرقین ترجمہ (عبدالحلیم)
تاریخ ۔ دنیا کے بسنے والے (بشیر حسین زیدی)
نظم ۔ انتخاب کلام حسرت (جلیل قدوائی)
نظم ۔ شاعر کی راتیں (جوش ملیح آبادی)
تاریخ ۔ انگورہ (عبدالرب)
دستکاری ۔ عصمتی کشیدہ (رسالہ عصمت)
دستکاری ۔ عصمتی کروشیا (رسالہ عصمت)
دستکاری ۔ موتیوں کا کام (رسالہ عصمت)
تصوف ۔ صبغۃ اللہ (غلام محمد احمد)
نظم ۔ نغمۂ دل مجموعۂ کلام (دل شاہجہانپوری)

مارچ سنہ ۳۳ء ۵۴ - ۶۵

ادب نثر ۔ طلسم زندگی (میاں بشیر احمد)
نظم ۔ نقوش مانی (مانی جائسی)

تنقید ۔ جدید اردو شاعری (عبدالقادر سروری)

تاریخ ۔ ترکی جمہوریہ (ضمیر احمد)

نباتیات ۔ مبادی نباتات (جگموہن لال)

معاشیات ۔ مبادی علم المعیشت (آغا محمد اشرف)

مالیات ۔ مالیاتِ عامہ اور افلاس ترجمہ (محمد حسین)

افسانہ ۔ نیرنگ (ایس آر۔ خاتون)

افسانہ ۔ کیمیاگر اور افسانے (محمد مجیب)

ڈرامہ ۔ شریر لڑکا (سید عابد حسین)

ڈرامہ ۔ صید زبوں (اشتیاق حسین قریشی)

تذکرہ ۔ نبیوں کے قصّے (عبدالحیٔ فاروقی)

تذکرہ ۔ خادمات خلق (سیدہ خاتون)

ادب ۔ ورڈسورتھ کی شاعری (میر حسن)

تذکرہ فارسی ۔ چہار مقالہ نظامی (محمد رفیع)

اخلاق ۔ تاج آفرینش ترجمہ عربی (عبدالحمید)

مذہب ۔ آیات بینات (محمد الدین)

سیرت ۔ سرکارِ دو عالم (محمد حسین)

تاریخ ۔ خلفاء اربعہ (عبدالحیٔ)

ڈرامہ ۔ بچوں کا انصاف (عبدالغفار)

نظم ۔ حقیقت علمی شاعری (نصیر الدین حسین)

مذہب ۔ قاتلانِ حسین کا مذہب (سید علی نقی)

مذہب ۔ وجود محبت (سید علی نقی)

مذہب ۔ ہمارا دین (نواب علی رضوی)

〃 ۔ فلسفۂ رمضان (احمد)

جون سنہ ۳۳ء ۷۲ - ۷۶

مذہب ۔ ترجمان القرآن رسالہ (ابوالاعلیٰ مودودی)

ادب ۔ خمستان رسالہ (عدم)

افسانہ ۔ محشرستان (محشر عابدی)

افسانہ ۔ نوجوان ورتھر ترجمہ (ریاض الحسن)

افسانہ ۔ تجدید عمل رسالہ (مجازی)

جولائی سنہ ۳۳ء ۶۶ - ۶۸

تاریخ ۔ مغل اور اردو (نصیر حسین خاں خیال)

ڈرامہ ۔ تعلیم زدہ بیوی (فضل حق قریشی)

ڈرامہ ۔ نجمہ نوری (انصار ناصری)

فسانہ ۔ چندرا موہنی (انصار ناصری)

فسانہ ۔ اخوان الشیاطین (افضال حسین)

طب ۔ اعادۂ شباب (اشرف الحق)

اگست سنہ ۳۳ء ۶۹ - ۷۷

تاریخ ۔ رہنمائے مقدمات مقدسہ (محمد اشرف خاں)

ادب ۔ سیلاب تبسم (شوکت تھانوی)

ادب ۔ کلیات طغرائی مجموعہ کلام (طغرائی امرتسری)

اخلاق ۔ تہذیب عمل (محمد باقر)

فلم ۔ میک اپ (عباس دہلوی)

نومبر سنہ ۳۳ء ۶۵ - ۶۸

فارسی ادب ۔ سخنوران ایران (محمد اسحاق)

تنقید ۔ نقد الادب (افسر میرٹھی)

مذہب ۔ متعہ اور اسلام (سید علی نقی)

مذہب ۔ تجارت اور اسلام (سید علی نقی)

اپریل سنہ ۳۴ء ۷۱ - ۷۷

سفرنامہ ۔ پردیس کی باتیں (حسین احمد بیگ)

تذکرہ و نظم ۔ گاندھی نامہ (محمد رفیق)

نظم ۔ نغمۂ روح (اختر انصاری)

نظم ۔ شورستان و گلبانگ (فہمی ترمذی)

ڈرامہ ۔ نقشِ آخر (اشتیاق حسین)

تاریخ : اسلامی کہانیاں (محوی لکھنوی)
نظم - بچوں کی نظمیں (سعید انصاری)
مذہب - نفسیات مذہب (دہاج الدین)
تذکرہ - جمال الدین افغانی (قاضی عبدالغفار)
افسانہ - افسانہائے عشق (حامد علی خاں)
افسانہ - لاش اور دوسرے افسانے (حجاب اسماعیل)
افسانہ - میری ناتمام محبت (")
لطائف - نوادر (مرزا محمد عسکری)
افسانہ - سرگزشت اسیر ترجمہ وکٹر ہیوگو (سعادت حسن)
نظم - صدائے مشرق مجموعہ کلام (فاروق کرتپوری)
ادب - حسن کار (محمد صادق)
ادب - دو آتشہ (دیوان چند)
نظم - پیغام فطرت (جاذب دہلوی)
مذہب - علی اور کعبہ (آغا مہدی)
اخلاق - غریبوں امیروں کی دنیا (محسن امرتسری)

جولائی ۱۹۳۴ء ۷۴ - ۷۳

طب - مخزن المفردات ہومیوپیتھی (کاشی رام)
" - نسخہ جات ہومیوپیتھی (")
سیاسیات - جرمنی کی بیداری (امیر الحسن)
تاریخ طبیعی - سمندر کا عجائب خانہ - (محمد عسکری)

ستمبر ۱۹۳۴ء ۷۰ - ۶۷

ادب - تاریخ مرثیہ گوئی (حامد حسن قادری)
لسانیات - ہندوستانی لسانیات - (محی الدین قادری)
سیرت - محمد رسول اللہ (محمد ابراہیم)
مذہب - باب د بہا (امامیہ مشن)
نظم - چراغ ایمن مجموعہ کلام (فکری سلطان پوری)
اخلاق - مساوات اسلامیہ (شبیر محمد قادری)

ادب - موتی (سید یوسف بخاری)
طب - قانون مباشرت (مُبین احمد)
ادب - محبت کے پھول ترجمہ ٹیگور (فرید مچھلی شہری)

دسمبر ۱۹۳۴ء ۷۲ - ۶۵

افسانہ - ایک افسانے اور چار خاکے (اختر شیرانی)
نظم - درد زندگی (احسان دانش)
تنقید - غالب شکن (یاس عظیم آبادی)
نظم - طلوع (ضیاء فتحپوری)
مذہب - بارش اور طوفان (شاکر جبلپوری)
افسانہ - سمن پوش اور دوسرے افسانے (مجنوں گورکھپوری)
تذکرہ - اردو کا پہلا ناول نگار (اویس احمد)
لغت - جامع اللغات (محمد رفیع)
تاریخ - یوسف ہندی (محسن بن بشیر)
تنقید - تنقیدات عبدالحق (عبدالحق)
سیرت - سید الانبیاء - ترجمہ (محمد اعظم خاں)
نظم - باز کے سو شعر (تراب علی خاں)
ادب - خواب پریشاں - ترجمہ شیکسپیر (امیر احمد)
ڈرامہ - روح سیاست (نور الٰہی - محمد عمر)
تنقید - امجد کی شاعری (نصیر الدین)
ڈرامہ - وفا کی دیوی (کیفی چریاکوٹی)
طب - غدودوں کے جوہر (اشرف الحق)
تاریخ - پارسیز (محمد طاہر رضوی)

فروری ۱۹۳۵ء ۷۸ - ۷۳

تاریخ - زوال غازی (عزیز ہندی)
ڈرامہ - نرگس جمال ترجمہ (شاہد دہلوی)
ڈرامہ - پروین و ثریا ترجمہ (شاہد - قریشی)
ادب - اردو میں ڈرامہ نگاری (بادشاہ حسین)

مذہب ۔ بھگوت گیتا (محمد اجمل خاں)
خطاطی ۔ علم الحروف (محمود علی یار)
ڈرامہ ۔ قربانی (کشن پرشاد کول)
تاریخ ۔ دلی کا آخری دیدار (وزیر حسن)
ڈرامہ ۔ آغاز ہستی ترجمہ (مجنوں گورکھپوری)
ڈرامہ ۔ ہوش کے ناخن ترجمہ (میر حسن)
افسانہ ۔ معاشقۂ نپولین ترجمہ (تمکین کاظمی)

اپریل ۳۵ء ۶۸ - ۶۹

افسانہ ۔ دلچسپ افسانے (کوثر چاندپوری)
جنسیات ۔ مقصود حیات (حافظ غازیپوری)
تاریخ ۔ لال قلعہ کی جھلک (ناصر نذیر فراق)
تاریخ ۔ راسپوتین (عبدالرزاق)

مئی ۳۵ء ۶۶ - ۶۹

تاریخ ۔ فاتح مصر (امام الدین رامنگری)
سیاسیات ۔ دھدر حیدرآباد انگریزی (عابد حسین)
مذہب ۔ قرآن النور (نذیر امین سلمی)
تاریخ ۔ امہات الامہ (نذیر احمد)
نظم ۔ دیوان معروف (عبدالحامد)
نظم ۔ سرود زندگی (اصغر گونڈوی)

جون ۳۵ء ۷۶ - ۷۷

نظم ۔ نغمۂ کوہسار (بزم ادب شملہ)
طب ۔ مسیح الاطفال (قسیم الدین)
نظم ۔ حامد کے ۱۰۰ شعر (حامد علی خاں)
تاریخ ۔ مسلمانوں کی صنعت ترجمہ (جمیل الرحمان)
تاریخ ۔ انقلاب فرانس (باری)
مذہب ۔ قادیانی مذہب (الیاس)

اگست ۳۵ء ۷۴ - ۷۷

تفسیر ۔ تفسیر قرآن (علی بخش)
افسانہ ۔ منتخب افسانے (عبدالرزاق)
شکار ۔ شکار (قطب یار جنگ)
نظم ۔ دیوان مومن مع شرح (ضیاء احمد)
اخلاق ۔ روح الاسلام (عبیداللہ خاں)
نظم ۔ سلسبیل (آلِ احمد سرور)

نومبر ۳۵ء ۷۲ - ۷۶

ناول ۔ نجم السحر ترجمہ (عنایت اللہ)
تاریخ ۔ بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)
افسانہ ۔ سحر بنگال (طاہرہ دیوی)
نظم ۔ آہنگ رزم (وقار انبالوی)
اخلاق ۔ نوائے تلخ (اشفاق)
تاریخ ۔ عربوں کی جہاز رانی (سید سلیمان ندوی)
مذہب ۔ یادگار اظہر (دلدار حسین)
افسانہ ۔ مصری افسانے ترجمہ (زین العابدین)
تاریخ ۔ ترکی پر مغرب و مشرق کی کشمکش ترجمہ (عابد حسین)
تذکرہ ۔ دو خدائی خدمتگار ترجمہ (محمود علی)
ڈرامہ ۔ انجام (محمد مجیب)
نظم ۔ خوشۂ پروین (افضل الدین)

فروری ۳۶ء ۷۵ - ۷۶

تذکرہ ۔ مصطفیٰ کمال پاشا (اشفاق حسین)
جمالیات ۔ فلسفۂ جمال (ریاض الحسن)
تاریخ ۔ باپ کا خط بیٹی کے نام ترجمہ (کتابستان)
افسانہ ۔ انشائے لطیف (ل۔ احمد)

اپریل ۱۹۳۶ء ۷۲ - ۸۰

تنقید ۔ صحیفۂ ادب (طارق)
نظم ۔ انبساط روح (عبدالغفور)
تاریخ ۔ مختصر تاریخ ادب اردو (اعجاز حسین)
نظم ۔ حریت حسین (فطرت واسطی)
مذہبی ۔ الہامی افسانے (مرتضیٰ احمد)
ادب ۔ نکہت رائیگاں (لطیفی)
تاریخ ۔ ذکر شبلی (نصیر الدین)
تاریخ ۔ موازنۂ صلیب و ہلال ([illegible])
افسانے ۔ عروس ادب (زناربند دہلوی)
مذہب ۔ گنجینۂ معرفت ترجمہ (انصر [illegible])
ادب ۔ مکتوبات امجد (محمد حمید رآبادی)
تاریخ ۔ محمد مصطفیٰ (زہرا بیگم)
تاریخ ادب ۔ مثنویات (امیر احمد)
مذہب ۔ مطالعۂ حدیث (مقبول احمد)
مذہب ۔ تنقید الاحادیث (طالب صفوی)

جون ۱۹۳۶ء ۷۱ - ۷۷

تفسیر ۔ بیان للناس (حمید الدین)
نظم فارسی ۔ مذہب و عقل (تمنا عمادی)
نظم فارسی ۔ معاش و معاد (تمنا عمادی)
نظم ۔ نقش دوام (عدم)
مذہب ۔ داستان زوال (امیر احمد علوی)
تاریخ ۔ جاپان ۔ ترجمہ (محمود علی)
زراعت ۔ کسان ۔ ترجمہ (مختار سنگھ)
ڈرامہ ۔ نفرت کا زہر (اشتیاق حسین)
نظم ۔ تسخیر یاس (یاس ٹونکی)
تذکرہ ۔ مرقع سخن (قادری زور)

جولائی ۱۹۳۶ء ۷۳ - ۷۷

نظم ۔ کلام جوہر (محمد علی)
نظم ۔ بانگ جرس (شفیق جونپوری)
نظم ۔ خمکدۂ سرور (سرور جہاں آبادی)
نظم ۔ مرثیۂ اندلس (حفیظ نعیمی)
ادب ۔ مضامین فلک پیما (عبدالعزیز)
نظم ۔ شاخ نبات (طالب)
مذہب ۔ اسلام کی حکیمانہ زندگی (علی نقی)

اگست ۱۹۳۶ء ۷۴ - ...

تنقید ۔ اردو لٹریچر (فضل الدین اثر)
نظم ۔ جہان آرزو (آرزو لکھنوی)
نظم ۔ انتخاب کلام میر (محمد احسن)
تاریخ ۔ انقلاب روس (کشن پرشاد کول)

ستمبر ۱۹۳۶ء ۷۶ - ۱۸

فلسفہ ۔ قنوطیت (ولی الدین)
نظم ۔ دل صد پارہ (طالب صفوی)

اکتوبر ۱۹۳۶ء ۷۵ - ۸۰

تاریخ ۔ معارکۂ کربلا (علی نقی)
مذہب ۔ اثبات عزاداری (علی نقی)
مذہب ۔ اسلام اور اچھوت (اکبر شاہ خاں)
تاریخ ۔ تاریخ اسلام کا ابتدائی دور (برکت اللہ)
قواعد ۔ جدید آمد نامہ (عبدالجلیل)
تاریخ ۔ رحلت خلفاء راشدین (عبدالرزاق)

دسمبر ۳۶ء ۶۳ - ۶۷

تاریخ ۔ تمدن عتیق (عبدالواحد)
نظم ۔ شب چراغ (صادق ضیاء)
ادب ۔ اس نے کہا ۔ ترجمہ (عبدالغفار)
تذکرہ ۔ میری کہانی (نہرو) (عابد حسین)
نظم ۔ جواہر سخن (کتابستان)
ڈرامہ ۔ پیلی باس ترجمہ (تمنائی)
فلسفہ ۔ فلسفۂ برگساں (میر حسن الدین)

جون ۳۷ء ۶۰ - ۶۷

مذہب ۔ خلافت و امامت (امامیہ مشن)
ادب ۔ زندگی (رازوزی)
تذکرہ منظوم ۔ آفتاب رسالت (عبدالحمید)
ناول ۔ داستان ترجمہ (گمنام)
افسانہ ۔ نورس (افسر میرٹھی)
تذکرہ ۔ داغ (غلام دستگیر)
تنقید ۔ افسانہ (مجنوں گورکھپوری)
ناول ۔ ظلِ ہما ۔ ترجمہ (اطہر حسین)
تعلیم و تمدن ۔ لیونارڈو گرٹرڈ ترجمہ (غلام حسن)
جغرافیہ ۔ سلاطین و قائدین اسلام (یوسف احمد)
نظم ۔ آیات وجدانی (یگانہ چنگیزی)
سیاحت ۔ کشمیر (عبدالمجید)
موسیقی ۔ انکشاف موسیقی (چاند)

افسانہ ۔ طلسمات (عابد علی)

نومبر ۳۷ء ۶۵ - ۶۷

ادب ۔ نغمات (ل ۔ احمد)

تعلیم و تمدن ۔ لپستا لوزی ترجمہ (عبدالحمید)
عمرانیات ۔ معاہدہ عمرانی ترجمہ (محمود حسین)
نظم ۔ فکر و نشاط (جوش ملیح آبادی)
طب ۔ اسلامی طب (معین الدین)
تنقید ۔ مقالات حالی (حالی)
تذکرہ ۔ مشاہیر ہند (بادشاہ حسین)
تنقید ۔ سودا (شیخ چاند)
مذہب ۔ مولویت و اسلام (نبی احمد)
تاریخ ۔ شہدائے کربلا (علی نقی)
نظم ۔ شاد عظیم آبادی کے ۱۰۰ شعر (حمید)
تذکرہ ۔ علامہ سیتا پوری (اکرام علی)
تاریخ گوئی ۔ جامع التاریخ (اظہر الہ آبادی)

دسمبر ۳۷ء ۶۰ - ۶۷

نظم ۔ نغمۂ فردوس (خوشی محمد ناظر)
ادب ۔ مضامین رشید (رشید احمد)
تاریخ ۔ صحیفۂ چین (انوری فرید آبادی)
افسانہ ۔ واردات (پریم چند)

مئی ۳۸ء ۶۰ - ۶۴

نظم فارسی ۔ صحیفہ (مہتر چترال)
مذہب ۔ نہج البلاغہ (علی نقی)
سیرت ۔ خاتم النبیین (ابراہیم عمادی)
تفسیر ۔ تفسیر سورہ کافرون (حمید الدین)
نظم ۔ نورِ مشرق (ضیاء فتح آبادی)
نظم ۔ یادگار محشر (عبید اللہ)
عروض ۔ رمز العروض (عبدالحمید)

جولائی ۳۸ء ۶۲ ۶۵

لغت ۔ فرہنگ عامرہ (عبداللہ خاں)
نظم ۔ فانوس خیال (توفیق)
سیاست ۔ ہندوستان کا نیا دورِ حکومت (کشن پرشاد کول)
مذہب ۔ تمدین کا پیغام (علی نقی)
مذہب ۔ شہدائے کربلا (علی نقی)
سیرت ۔ ماہِ عرب (محمد ہادی)
نظم فارسی ۔ شارستاں (محوی بدایونی)
مذہب ۔ قرآن پاک (عبدالواحد)

ستمبر ۳۸ء ۵۸ - ۶۲

نظم ۔ ریاض رضواں (ریاض خیرآبادی)
ادب ۔ مکاتیب مہدی (مہدی حسن)
تنقید ۔ اقبال کی شاعری (عبدالمالک)
تذکرہ ۔ ذکرِ غالب (مالک رام)
تذکرہ ۔ سمد چین (مالک رام)
ناول ۔ بنی اسرائیل کا چاند ۔ ترجمہ (حیرت)
ناول ۔ بیوہ (پریم چند)
تاریخ ۔ دہلی ۲۰۰ برس کی تاریخ (سید حسن)
ادب ۔ ضرب الامثال (عبدالمجید)
تمدن ۔ ایران تمدن (ریاض احمد)
تاریخ ۔ سلسلۂ داستان گو (غلام دستگیر)

مارچ ۳۹ء ۶۹ - ۷۷

تذکرہ ۔ نذرِ دلی (مکتبہ ابراہیمیہ)
نظم ۔ آہنگ (مجاز)
تذکرہ ۔ سخنورانِ دکن (تسکین عابدی)
تاریخ ۔ مسلمانوں کا ایثار (عبدالوحید خاں)

تاریخ ۔ خضر منزل (عبدالشکور خاں)
ڈرامہ ۔ ایک المیہ (اختر ارینوی)
افسانہ ۔ لندن کی ایک رات (سجاد ظہیر)
نظم ۔ ناگنی (جاذب)
تاریخ ۔ تاریخ الٰہ آباد (صمدنی)
تذکرہ ۔ ہٹلر اعظم (حیندر شیکھ)
سیاست ۔ ریاستوں کی سیاست (برنی)
مذہب و معاشرت ۔ ید بیضا (نجم الدین جعفری)
تنقید ۔ اقبال کا پیام (ڈاکٹر خالد)
افسانہ ۔ طلسم حیات (ماہر القادری)
نظم ۔ جوئبار (ظفر ادیب)
تنقید ۔ پاگل ترجمہ (بشیر نیازی)
سیاحت ۔ بالشیتوں کی دنیا ترجمہ (فخر الدین)
نظم ۔ ترجمان الغیب (احتشام الدین)
ڈرامہ ۔ ریڈیو ڈرامے (فضل حق قریشی)
سیاست ۔ مضامین محمد علی (محمد علی)
سیاست ۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت (زین العابدین)
مذہب ۔ اسلامی عقاید (علی نقی)

جولائی ۳۹ء ۶۸ - ۷۵

افسانہ ۔ من کی دنیا (رشید قریشی)
ڈرامہ ۔ تمثیلی مشاعرہ (دتاتریہ کیفی)
نظم ۔ راز و نیاز (اشعر دہلوی)
انشاء ۔ انشاء سلمیٰ (ولی احمد خاں)
قواعد عربی ۔ مفتاح العربیہ (سجاد میرٹھی)
نظم ۔ کلیات سحری (سحری)
سیاست ۔ سیاسیات (محمد عاقل)
تمدن ۔ اجتماعی زندگی (محمد عاقل)
افسانہ ۔ میری کہانی (سید علی)

افسانہ ۔ محبت کا فسانہ　(ل۔ احمد)
اخلاق ۔ من کی بیتا　(لطیف النسا)
نظم ۔ رباعیات　(عرش فاروقی)
ادب ۔ لالہ رخ　(ل۔ احمد)
تذکرہ ۔ اے ترک　(محمد مرزا)
ادب ۔ پھول والوں کی سیر　(فرحت اللہ بیگ)
تاریخ ۔ ہندوستان کی صنعت و تجارت　(منت اللہ)

ستمبر ۳۹ء　۷۴ ۔ ۷۹

ادب ۔ جوہر تخلیق ۔ ترجمہ　(محمد علی)
مکاتیب ۔ روح غالب　(قادری زور)
نفسیات ۔ خواب کی دنیا　(عبدالمالک)
مکاتیب ۔ روح حیات　(اختر قریشی)
ادب ۔ زندگی کے پھول　(ل۔ احمد)
ادب ۔ حیات و کلیات اسماعیل　(اسماعیل میرٹھی)
انشاء ۔ سنہرا حلقہ　(ناظر کاکوروی)
تنقید ۔ متاع اقبال　(عبدالواحد)
نظم ۔ قصاید نجم　(نجم آفندی)
مکاتیب ۔ نادر خطوط غالب　(شاکر)
ادب نظم ۔ جواہر سخن　(ہندوستانی اکاڈمی)
تنقید ۔ قتیل و غالب　(انوری ۔ فرید آبادی)
آثار ۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ　(غلام یزدانی)
ناول ۔ گئودان　(پریم چند)
تاریخ ۔ دنیا کی کہانی　(محمد مجیب)

دسمبر ۳۹ء　۷۱ ۔ ۷۷

نظم ۔ بہاراں　(اثر لکھنوی)
نظم ۔ کائنات دل　(منور لکھنوی)
لطائف ۔ آب حیات کے لطائف　(آغا محمد اشرف)

نظم ۔ ارمغان باز　(تراب علی)
سیرت ۔ رحمۃ للعالمین　(محمد سلیمان)
تاریخ ۔ ناموران اسلام　(محمد حسین)
تاریخ ۔ مغلوں کا مدوجزر　(محمد شفیع)
ڈرامہ ۔ کایا پلٹ　(عبدالغفار)
کہانی ۔ دو بھائی　(محمد مجیب)
تنقید ۔ بدشنی　(احتشام الدین)
ڈرامہ ۔ ابوالہمر ۔ ترجمہ　(مجنوں گورکھپوری)
تاریخ ۔ سلطان احمد شاہ بہمنی　(ظہیر الدین)
فسانہ ۔ اندھی دنیا　(اختر انصاری)

مارچ ۴۰ء　۷۴ ۔ ۷۷

نظم ۔ نوائے کارگر　آتش خاموش چراغاں　(احسان دانش)
مقالات تاریخ ۔ نقوش سلیمانی　(سلیمان ندوی)
نظم ۔ گل نغمہ　(عظیم الدین احمد)
نظم ۔ یادگار جگر　(جگر گورکھپوری)
تنقید ۔ داستان عجم　(نصیر حسین خاں خیال)
نظم ۔ شاعر کی دنیا　(عظیم الدین)
مقالات ۔ یوروپ کے تاثرات　(ڈاکٹر حمید)
تذکرہ ۔ ہند کا عہد بدھ صوفی　(سید نواب علی)
نظم ۔ عصر نو　(صادق ضیاء)
تاریخ ۔ تاریخ جنوبی ہند　(محمود خاں)
تنقید ۔ مطالعہ حافظ　(احتشام الدین)
سائنس ۔ سائنس کے کرشمے　(سب رس کتاب گھر)
نظم ۔ ارمغان جذب　(دھوندر راؤ)
ادب ۔ مغربی تصانیف کے تراجم　(میر حسن)
مکاتیب ۔ مکتوبات شاد عظیم آبادی　(ڈاکٹر زور)
افسانے ۔ محبت کی چھاؤں　(ظفر الحسن)

مئی سنہ ۱۹۴۳ء ۶۵ - ۶۳

تذکرہ ۔ کلام الملوک (سعادت علی)
مثنوی ۔ سیف الملوک بدیع الجمال (سعادت علی)
مثنوی ۔ پھول بن (سروری)
مثنوی ۔ قصۂ بے نظیر۔ صنعتی (عبدالقادر سروری)
مثنوی ۔ طوطی نامہ ۔ غواصی (سعادت علی)
تنقید و تذکرہ ۔ مثنوی کا ارتقا (عبدالقادر سروری)
نظم ۔ مرقع سخن (جامعۂ عثمانیہ)
تاریخ ۔ گولکنڈہ (عبدالمجید)
تذکرہ ۔ تذکرۂ وقار (محمد امین زبیری)
تذکرہ ۔ حیاتِ سلطانی (" ")
نظم ۔ دیوانِ ایتیق (ایتیق)
ناول ۔ بغداد کا جوہری (اشرف صبوحی)
تاریخ ۔ مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی ۔ (محمد مرزا)
فسانہ ۔ باسی پھول (عباس حسین)
تذکرہ ۔ ہندو ادیب (ناظر کاکوروی)
تذکرہ ۔ محمود غزنوی (محمد حبیب)
تاریخ ۔ حسین ابن علی (نکہت)
فسانہ ۔ پس پردہ (پنیدر بھوشن)
ناول ۔ خبطی (محمد علی واحدی)
نظم ۔ جوئبار (ظفر ملتانی)
نظم ۔ آزاد کی نظمیں (حلقۂ ادب لکھنؤ)
فسانہ ۔ محبت کے افسانے (رشدی)
نظم ۔ برق و باراں (برق کرمانی)
نظم ۔ شمیم سخن (شبیہ الحسن)

اگست سنہ ۱۹۴۳ء ۶۵ - ۷۰

تنقید ۔ ادب و زندگی (مجنوں گورکھپوری)
تاریخ ۔ تاریخ ادب اردو (زور)
تذکرہ ۔ محمد حسین آزاد (جہاں بانو بیگم)
قواعد عربی ۔ قواعد عربی (اللہ)
نظم ۔ جلوہ زار (اظہر الٰہ آبادی)
طب ۔ تذکرۃ الہند (حکیم رضا علی)
تذکرہ ۔ مقدمۂ زندگانی محمد۔ ترجمہ (امت مسلمہ امرتسر)
تاریخ گوئی ۔ رہنمائے تاریخ اردو (عبدالقادر)
نظم ۔ صبح نشاط (نظیر لودھیانوی)
نظم ۔ سحر حلال (درویش میرٹھی)
تذکرہ ۔ اردو کا پہلا شاعر (اولیس احمد)
ڈرامہ ۔ خواب بیداری ۔ ترجمہ (یوسف حسین)
نفسیات ۔ طلسم عمل ترجمہ (مجتبیٰ حسین)
ڈرامہ ۔ خوددار خاتون ۔ ترجمہ (محمد مرزا)
ڈرامہ ۔ لتا (کشن پرشاد کول)
نظم ۔ پیام کیف (احسان احمد)
نظم ۔ گلستانِ شرف (شرف)
سیاسیات ۔ مضامین محمد علی (محمد سرور)
سیاسیات ۔ نازی ازم (عبدالرحیم شبلی)

اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء ۶۶ - ۷۰

نظم ۔ نظم اردو (ناطق لکھنوی)
سیاست ۔ انگلستان کا طریق حکومت (مکتبہ جامعہ)
ادب ۔ خنداں (رشید احمد صدیقی)
نظم ۔ بادۂ نو (احسان دانش)
ڈرامہ ۔ خیال آفریں دماغ (عرش تیموری)
مصر ۔ مصر کی رقاصہ ترجمہ (پطرس)
نظم ۔ باغ دلکش (مسعود علیگ)
نظم ۔ گل نغمہ (صفا حیدرآبادی)
تاریخ ۔ تذکرۃ الانصار (شمس الحق)

تنقید ۔ اقبال کی شاعری (عبدالمالک)

تنقید ۔ الہامات شاد (عبدالمالک)

نظم ۔ شہاب کی تخیل (افسر صدیقی)

فسانہ ۔ نئی پود (ازہر قدوائی)

دسمبر سنہ ۴۰ء

نظم ۔ کلیم عجم (سیماب اکبرآبادی)

فن شعر ۔ دستورالاصلاح (")

تنقید ۔ اردو شاعری پر ایک نظر (کلیم الدین احمد)

ادب ۔ اردو کہاوتیں (عبدالرافع)

تاریخ ۔ کارل مارکس (مکتبہ اردو لاہور)

تاریخ ۔ اسٹالین ترجمہ (اشرف خاں)

تاریخ ۔ افتتاح الاندلس ۔ ترجمہ (جمیل الرحمان)

تنقید ۔ قرآن و اقبال (ابو محمد مصلح)

تاریخ ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ (زور)

تاریخ ۔ مقدمہ تاریخ دکن (عبدالمجید)

نظم ۔ نمود زندگی (علی منظور)

ڈراما ۔ کاغذ کی ناؤ (میکش)

ڈرامہ ۔ سلک گوہر (جلال الدین)

خطاطی ۔ اردو رسم خط (سجاد مرزا)

مارچ سنہ ۴۱ء ۵۶ - ۵۸

تاریخ ۔ اردو شاعری کی مختصر تاریخ (محمد جمیل)

نظم ۔ گلبانگ حیات (امین حزیں)

افسانہ ۔ نازوادا (اختر انصاری)

سیاسیات ۔ مبادی سیاسیات (ہارون خاں)

نظم ۔ باقیات بجنوری (ڈاکٹر بجنوری)

تنقید ۔ جدید جغرافیہ پنجاب (سندباد)

ادب ۔ زباندانی (فضل الٰہی)

ڈرامہ ۔ شاہجہاں (رفیق خاور)

اپریل سنہ ۴۱ء ۵۳ - ۵۶

نظم ۔ عجائب زار (منطق لکھنوی)

نظم ۔ نقش ناکام (کرر رامپوری)

افسانہ ۔ گناہ کا خوف (محمد علی رودولوی)

سیاحت ۔ مسافر کی ڈائری (خواجہ احمد عباس)

تذکرہ ۔ یاران میکدہ (عبدالشکور)

تنقید ۔ ہم اور وہ (خواجہ محمد شفیع)

نظم ۔ پس پردہ (اختر بریلوی)

تنقید ۔ مومن و غالب (معجز سہوانی)

ادب ۔ شعر و شاعری (مہدی جالبنی)

نظم ۔ میری دنیا (عقیل جعفری)

جون سنہ ۴۱ء ۵۸

فسانہ ۔ سوگوار شباب (مجنوں گورکھپوری)

فسانہ ۔ تازیانے (الطاف مشہدی)

جولائی سنہ ۴۱ء ۵۹ - ۶۰

سیرت ۔ محمد عربی (باری)

تاریخ ۔ کمپنی کی حکومت (باری)

تاریخ ۔ دوسری جنگ عظیم (محمد مرزا)

تنقید ۔ ایضاح سخن (تمنا عمادی)

تاریخ ۔ عراق کی تاریخ (اطہر حسین)

ستمبر سنہ ۴۱ء ۵۴ - ۵۸

نظم ۔ کلیات میر (آسی)

نظم ۔ کلیات قطب شاہ (سب رس)

نظم ۔ کلیات سراج (سب رس)

ادب ۔ خطوط غالب (مہیش پرشاد)
مذہب ۔ ترتیب نزولِ قرآن (محمد اجمل خاں)
نظم ۔ سازو آہنگ (سیماب اکبرآبادی)
ناول ۔ کملا ترجمہ (مہدی علی خاں)
افسانہ ۔ دنیائے آرزو (مرزا ادیب)
نظم ۔ محشرِ خیال (سجاد انصاری)
نظم ۔ گل و مل (علی عباس)
نصاب ۔ پھولوں کی ڈالی (مجذوب)
افسانہ ۔ شہر خموشاں (محمود مورخ)
افسانہ ۔ ذکر و فکر (مقصود زاہدی)
نظم فارسی ۔ ہفت اورنگ (اقبال حسین)
ڈرامہ ۔ نقشِ اول (صالحہ عابد حسین)
نظم ۔ صد برگ گل (عشرت گیاوی)

نومبر ۴۱ء ۵۴-۵۸

سیاسیات ۔ قومیت وبین الاقوامیت (مکتبۂ جامعہ)
سیاسیات ۔ ممالک اسلامیہ کی سیاست (")
سیاست ۔ نا تسیت (رزاقی)
سیاست ۔ بحرالکاہل کی سیاست (مکتبۂ جامعہ)
سیاست ۔ خطوط محمد علی (")
نظم ۔ مرقع فطرت (پریم ناتھ)
نظم ۔ شرحِ درد (محمد شفیع)
تاریخ ۔ یادِ رفتگاں (عبدالمجید)
ڈرامہ ۔ بت تراش (اشتیاق قریشی)
نظم ۔ میر محمد مومن (سب رس)
تنقید ۔ ادبی تاثرات (زور)
نظم ۔ انوار (علی اختر)
دائرۃ المعارف ۔ کتاب العلم (ایسٹرن پبلشنگ)
انتقاد ۔ جزیرۂ سخنوراں (غلام عباس)

افسانہ ۔ زہریلی مکھی (محمود مورخ)
نظم ۔ حدیث ناتمام (دلیش راج)
نظم ۔ میرے نغمے (سلام مچھلی شہری)
نظم ۔ جواہرات (حفیظ جونپوری)
نظم ۔ سوز و گداز (وجاہت اللہ)
افسانہ ۔ زندہ جیں ترجمہ (تمنائی)

مارچ ۴۲ء ۲۳-۲۶

نظم ۔ فردوسِ تخیل (زاہدہ خاتون)
افسانہ ۔ منٹو کے افسانے (منٹو)
نثر و نظم ۔ نئے زاویے (ترقی پسند جماعت)
نظم ۔ ماوراء (ن۔م۔راشد)
ناول ۔ روٹھی رانی (پریم چند)
تعلیم ۔ ایک معلم کی زندگی (عبدالغفار)
نظم ۔ نغمۂ زندگی (فضلی)
تاریخ ۔ داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری)
سیاحت ۔ محمد علی کا سفر یورپ (محمد سرور)
تاریخ ۔ آج کا مصر (محمد حسن)
نظم ۔ حرفِ ناتمام (برق دہلوی)
ادب ۔ مقامِ محمود (عبدالمالک)
ڈرامہ ۔ قابیل ترجمہ (مجنوں گورکھپوری)
ادب ۔ ناکام (محمد شفیع)
نظم ۔ خرمنِ عشق (شفیق جونپوری)

مئی ۴۲ء ۳۵-۳۶

فن شعر ۔ فن شاعری ۔ ترجمہ (عزیز احمد)
تمدن ۔ علم الاقوام ترجمہ (عابد حسین)
حفظان صحت ۔ ہماری غذا ترجمہ (رفعت)
ادب ۔ انشاء داغ (احسن مارہروی)

تاریخ طبیعی ۔ حیوانی دنیا کے عجائب (ترجمہ) (عبدالبصیر)

نظم ۔ دیوان جوشش (عبدالودود)

سیرت ۔ محمد ترجمہ (ملیح آبادی)

افسانہ ۔ ترکی افسانے ترجمہ (")

نظم ۔ نورس (مسعود اختر جمالی)

تذکرہ ۔ گارساں دتاسی (زور)

جون ۴۲ء ۴۰

ادب ۔ دردانہ (محمودہ رضویہ)

نظم ۔ دھڑکنیں (ندیم)

افسانے ۔ شیخ و برہمن (اعظم کریوی)

مذہب ۔ شان خدا (عاقل رحمانی)

سیرت ۔ محمد رسول اللہ ترجمہ (")

مذہب ۔ جواہر العلوم ترجمہ (عبدالرحیم)

فسانہ ۔ راہگذر (عاشق بٹالوی)

اگست ۴۲ء ۴۰

تاریخ ادب ۔ نئے ادبی رجحانات (اعجاز حسین)

نظم ۔ متین کے سو شعر (سعدی جعفری)

اکتوبر ۴۲ء ۳۸

مذہب ۔ قرآن و نظام شمسی (محمد اسماعیل)

مذہب ۔ انسان اور تورات (")

نظم ۔ لالہ زار (محمودہ رضویہ)

تاریخ ۔ تاریخ ادب ہندی (ظہیر الدین)

نظم ۔ چراغ لالہ (صائب عاصمی)

دسمبر ۴۲ء ۳۸ ـ ۴۰

ادب و تنقید ۔ مضامین مالک (عبدالمالک)

ہیئت ۔ سیر کائنات ترجمہ (حفیظ احمد)

تاریخ ۔ جگ بیتی (نہرو)

تنقید ۔ افکار نو (جمیل احمد)

فسانہ ۔ پتنگے (محمد امین)

فسانہ ۔ ان داتا (مرزا ادیب)

اخلاق ۔ مجنوں کے خطوط (عطاء الرحمان)

نظم ۔ کلام حرماں خیرآبادی (حرماں)

نظم ۔ شاعر کے ۱۰۰ شعر (شاعر قزلباش)

مارچ ۴۳ء ۲۸ ـ ۳۰

سیاست ۔ تاریخ افکار و سیاست اسلامی (عبدالوحید خاں)

مکاتیب ۔ شاد و اقبال (اسب رس)

مذہبی افسانے ۔ نامۂ تہدید (محمودہ رضویہ)

سوانح ۔ من کیستم (مرزا عسکری)

نسائیات ۔ انگبین (عطاء اللہ پالوی)

تنقید ۔ نقد و نظر (حامد حسن قادری)

افسانے ۔ نصیر الدین حیدر (مجتبیٰ حسن)

فسانے ۔ دامن باغباں (سعید احمد)

ناول ۔ دودھ کی قیمت (پریم چند)

ناول ۔ نجمہ (نذر سجاد حیدر)

افسانہ ۔ رات کا بھولا (عبدالقادر سروری)

تاریخ ۔ آریائی زبانیں (سدھیشور)

تاریخ ۔ خون شہیداں (ممتاز حسین)

مئی ۴۳ء ۲۹ ـ ۳۰

ادب نثر ۔ اشارات (جوش ملیح آبادی)

نظم ۔ حالب کے ۱۰۰ شعر (حالب مرادآبادی)

تنقید ۔ تنقیدی اشارے (پروفیسر سرور)

تاریخ ۔ حج زینب ۔ ترجمہ (محسن)

افسانے ۔ شمع انجمن (صادق الخیری)
نظم ۔ سلاسل (جاں نثار اختر)
افسانہ ۔ بن باسی دیوی ترجمہ (اشرف صبوحی)

جون سنہ ۴۳ء ۲۱ - ۳۳

افسانہ ۔ بیرم کی چوڑیاں (اعظم کریوی)
افسانہ ۔ پرچھائیاں (افسر میرٹھی)
تنقید ۔ یاران میکدہ (عبدالشکور)
فلسفہ ۔ یقین و عمل ترجمہ (ادارۂ اشاعت حیدرآباد)
نظم ۔ محسوسات ماہر (ماہر القادری)
نظم ۔ نغمات ماہر (")
ادب ۔ کہکشاں (محمودہ رضویہ)
نظم ۔ کلیات حسرت موہانی (حسرت)
نظم ۔ انتخاب غالب (غالب)
نظم ۔ ریاض فردوس (عبدالمجید مضطر)

ستمبر سنہ ۴۳ء ۲۷ - ۲۹

تاریخ ۔ البرامکہ (عبدالرزاق)
نظم ۔ رنگ بست (اثر لکھنوی)
افسانے ۔ کشمکش (فخر - ایم - اے)
نظم ۔ مضطر خیرآبادی کے اشعار (مضطر)

مارچ سنہ ۴۴ء ۴۹ - ۵۲

مذہب ۔ مذہب و تمدن (ابوالحسن ندوی)
تاریخ ۔ اسٹالن ترجمہ (آصف علی)
تعلیم ۔ ہم کیسے پڑھائیں (مکتبۂ جامعہ)
تعلیم ۔ تعلیمی خطبات (ذاکر حسین خاں)
ڈرامہ ۔ مٹھائی کی ٹوکری (اشتیاق حسین)
ڈرامہ ۔ بند لفافہ (")

ڈرامہ ۔ کٹھ پتلیاں (اشتیاق حسین)
ڈرامہ ۔ ملاء اعلیٰ (")
تذکرہ ۔ انشا (رحمت اللہ بیگ)
افسانہ ۔ لہریں (شفیق الرحمان)
افسانہ ۔ زندگی کے نئے زاویے (رئیس احمد)
سیاست ۔ مقالات محمد علی (")
سیاست ۔ ادب و انقلاب (اختر حسین رائے پوری)
سیاست ۔ سیاست جاپان (اشاعت اردو)
سیاست ۔ اقبال کے خطوط ترجمہ (مشتاق احمد)
فلسفہ ۔ اقبال کا تصور زمان و مکان (رضی الدین)
نظم ۔ رنگ محل (ساغر نظامی)
فلسفہ ۔ طبیعیاتی کائنات (سید محمد علی خاں)
نظم ۔ ماہ لقا (عزیز احمد)
نباتیات ۔ پودوں کی کہانی (محمد سعید الدین)
تذکرہ ۔ تذکرہ اردو مخطوطات (پروفیسر [illegible])
تذکرہ ۔ دور جدید کے ہندو شعراء (عبدالشکور)
افسانہ ۔ زندہ روس (دانش محل)
تمدن ۔ ہندوستانی تمدن (الیشور ٹوپا)
افسانہ ۔ سچ کا جادو (الحضرمی)
تاریخ ۔ ناصر جنگ شہید (رہبر فاروقی)
مزاحیہ تنقید ۔ مداوا (فرقت)
بیاگرفی ۔ اعمال نامہ (سید رضا علی)
ادب ۔ آبشار (محمودہ رضویہ)

اپریل سنہ ۴۴ء ۴۸ - ۵۱

تاریخ ۔ قومی تعلیم (ظفر حسین خاں)
تذکرہ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی (محمد سرور)
نظم ۔ خارستان (آغا شاعر)
مذہبی نظم ۔ اخلاص مشرق (شفیق جونپوری)

تذکرہ ۔ یادگار شعراء (طفیل احمد)
فلسفہ ۔ مشاہیر کے رومان (عبدالرحیم شبلی)
مذہب ۔ تطہیر انقلاب (صالح حسین)
افسانہ ۔ پنکھڑیاں (محمد رحیم)
افسانہ ۔ باغی لڑکی (شفیق بانو)
ناول ۔ پتھر سے ہیرا (سعید احمد)
افسانہ ۔ چاند سورج کی چوری (محمد رحیم)
نظم ۔ گلگوں (ربط ظہری)
تذکرہ ۔ اردو کا بڑا شاعر (صارم)
مذہب ۔ قرآن و اقبال (ابو محمد مصلح)
افسانہ ۔ کیسر کیاری (احمد ندیم قاسمی)
افسانہ ۔ تراس (نور الحسن)
نظم ۔ روشنیاں (احسان دانش)
مزاحی ادب ۔ گدھوں میں بیداری (ابو شمیم)
نظم ۔ سرخ سویرا (مخدوم محی الدین)

مئی ۴۴ء ۵۲ ۔ ۵۵

افسانہ ۔ خانقاہ (ام ۔ اسلم)
افسانہ ۔ کنول (اعظم کریوی)
افسانہ ۔ سادہ و رنگین افسانے (ظفر قریشی)
ڈرامہ ۔ کارخانہ (فضل الرحمان)
سیاست ۔ مشرق بعید (شاہد حسین)
سیاست ۔ پارلیمانی طرز حکومت (منظور الحسن)
تذکرہ ۔ مشاہیر کی بیویاں (طاہر ۔ رفعت)
تذکرہ ۔ مشاہیر کے رومان (عبدالرحیم شبلی)
ڈرامہ ۔ یہ کس کا خون ہے (علی سردار جعفری)
عروض ۔ عطر عروض (احسان)
افسانہ ۔ ہست و بود (محمودہ رضویہ)
افسانہ ۔ سہاگن (اسلم)

افسانہ ۔ دھنک (صادق الخیری)
ڈائری ۔ لندن سے آداب عرض (آغا اشرف)
معلومات ۔ بچوں کا لندن (")
نظم ۔ رمز کے ۱۰۰ شعر (رمزی)
تعلیم ۔ ذہنی امتحانات (ظفر حسین خاں)

جون ۴۴ء ۵۰ ۔ ۵۵

تاریخ زبان ۔ کیفیہ (دتاتریہ کیفی)
تذکرہ ۔ چند تبصرے (عبدالحق)
تذکرہ ۔ ادبیات فارسی اور ہندو (سید عبداللہ)
نظم ۔ دیوار، بہرام (مسلم ضیائی)
تنقید ۔ فردوسی پر چار مقالے (محمود شیرانی)
تنقید ۔ تنقید شعر العجم (")
تاریخ ۔ کتاب الہند (اصغر علی)
سیاست ۔ مکالمات افلاطون (عابد حسین)
تذکرہ ۔ مشاہیر روم و یونان (ہاشمی فرید آبادی)
افسانہ ۔ الف لیلہ ۔ ترجمہ (منصور احمد)
تاریخ ۔ مانڈو (غلام یزدانی)
افسانہ ۔ ہماری گلی (احمد علی)
تاریخ ۔ سوویٹ روس (کلیم اللہ)
تاریخ ۔ یہ دلی ہے (یوسف بخاری)
افسانہ ۔ تلخ و شیریں (صلاح الدین قریشی)
افسانہ ۔ گردش (مجنوں گورکھپوری)
تاریخ ۔ امت کی باتیں (راشد الخیری)
تذکرہ ۔ حسرت موہانی (عبدالشکور)
نظم ۔ طوبیٰ (شفیق جونپوری)
تاریخ ۔ کارل مارکس ۔ ترجمہ (اشرف عالم)
ناول ۔ جہاں آرا (ظفر قریشی)
نظم ۔ جھنکار (کیفی اعظمی)

نظم ۔ زنداں (یوسف ظفر)
مضامین ۔ نگارستان (ظفر علی خاں)
تاریخ ۔ ابن خلدون کی عظمت (نکہت)

ستمبر ۱۹۴۴ء ۱۳ - ۵۶

تاریخ ۔ دکن کی سیاسی تاریخ (ابوالاعلیٰ)
تاریخ ۔ ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں (محمود خاں)
نظم ۔ اذکار (فکر بدایونی)
نظم ۔ شعاع نور (قدوس اکبر آبادی)
مذہب ۔ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ (عبیداللہ سندھی)
تاریخ ۔ اشارہ (کمانی)
تاریخ ۔ عہد حاضر کے بڑے لوگ (محمد مرزا)
سیاست ۔ سوشلزم (سبط حسن)
سیاست ۔ نجات کا راستہ (راجہ گوپال اچاری)
تذکرہ ۔ سوویٹ عورتیں (رضیہ ظہیر)
نظم ۔ لہو ترنگ (سکندر علی وجد)

دسمبر ۱۹۴۴ء ۵۲-۵۶

ناول ۔ تلخیاں (رشید اختر)
ناول ۔ اپنا بچہ (قیسی رامپوری)
افسانہ ۔ دل کے آنسو (رئیس احمد جعفری)
افسانہ ۔ نغمہ کی موت (کرشن چندر)
نظم ۔ مشعل راہ (تخشب)
نظم ۔ آبشار (فیض)
تمدن ۔ اصول تمدن (نواب علی)
تاریخ ۔ جرم و سزا (باری)
علم و ادب ۔ حرف و حکایت (عبدالرحیم شبلی)
افسانہ ۔ لاوا (مرزا ادیب)
تاریخ ۔ شمع فروزاں ترجمہ (صادق الخیری)

نظم ۔ سرگزشت عالم (سب رس)
نظم ۔ طوبیٰ (شفیق)
افسانہ ۔ قید خانہ (احمد علی)
تاریخ ۔ یورپ جنگ سے پہلے (ہارون خاں)

مارچ ۱۹۴۵ء ۵۵-۶۳

تنقید ۔ تنقیدی جائزے (احتشام حسین)
صحافت ۔ فن صحافت (انجمن ترقی اردو)
تنقید ۔ لکھنؤ کا دبستان (ابواللیث)
ناول ۔ سنگ لیلیٰ (فضل حق قریشی)
ادب ۔ میر صاحب (عادل رشید)
افسانہ ۔ ٹوٹے ہوئے دل (رام پرتاپ)
نفسیات ۔ بچوں کی نفسیات (اسیر محمد)
نظم ۔ ذکر جمیل (ماہر القادری)
تنقید ۔ آثار اقبال (اشاعت اردو)
تنقید ۔ روسی ادب (محمد مجیب)
نظم ۔ کیفیات (موہن سنگھ دیوانہ)
معاشیات ۔ ہندوستان کی آبادی (انور اقبال)
مذہب ۔ اسلام اور سود (")
نظم ۔ نئی دنیا (موہن سنگھ دیوانہ)
نظم ۔ دیوان تاباں (عبدالحق)
نظم ۔ انتخاب جدید (سرور)
تذکرہ ۔ گل عجائب (تمنا)
تذکرہ ۔ سیدہ بیٹی (رازق الخیری)
نظم ۔ لالۂ خود رو (برجیس)
افسانہ ۔ نمود و راز (محمودہ رضویہ)
سیرت ۔ شمس بازغہ (")
ناول ۔ زہراب ۔ ترجمہ (محمود احمد)
افسانہ ۔ زرد چہرے (ابراہیم جلیس)

افسانہ ۔ روسی ظرافت (مسلم ضیائی)

جون ۱۹۴۵ء ۵۹ - ۶۲

تنقید ۔ نیا ادب میری نظر میں (آغا سرخوش)
تاریخ ۔ زینب کربلا (آغا اشہر)
ناول ۔ ناہید (آغا شاعر)
ناول ۔ شیریں (قیسی رامپوری)
نظم ۔ دھوپ چھاؤں (فضل الرحمان)
سیاست ۔ قائدین کے خطوط (عبدالرحمان)
تنقید ۔ حکمت اقبال (غلام دستگیر)
تاریخ ۔ تانیت (شاہد حسین)
نظم ۔ یادگار برق (مہاراج بہادر)
نظم ۔ تجلیات (مہر عثمانی)

جولائی ۱۹۴۵ء ۶۲ - ۷۵

تاریخ ۔ میر افغانستان (راس مسعود سید سلیمان)
فسانہ ۔ آج کل کے رومان (فضل حق قریشی)
سیاست ۔ اسلام کے سیاسی تصورات (نفیس اکاڈمی)
تاریخ ۔ چاند بی بی (اردو اکاڈمی)
فلسفہ ۔ داستان دانش (عبدالحکیم)
۔ اصطلاحات پیشہ وراں (ظفر الرحمان)
معاشیات ۔ ہندوستان کا نظام زر (انوار اقبال)

اکتوبر ۱۹۴۵ء ۵۲ - ۵۴

ڈرامہ ۔ عالم برزخ (بشیر سندی)
نظم ۔ موت و حیات (شاطر)
نظم ۔ روح کائنات (فراق)
تنقید ۔ اردو کی عشقیہ شاعری (")
افسانہ ۔ اجالے سے پہلے (مدھوسدن)

نظم ۔ میخانۂ ریاض (تسنیم)
تذکرہ ۔ یوروپین شعراء (رام بابو)
سیاحت ۔ دنیائے شہرزاد (محمود رضویہ)

نومبر ۱۹۴۵ء ۵۹ - ۶۰

افسانہ ۔ پہلو (عدیل)
نظم ۔ عورت اور سماج (صابر عاصمی)
تنقید ۔ شبلی اور اردو ادب (اعظمی)
فسانہ ۔ افسانۂ زریں ۔ ترجمہ (اسماء)
فلسفہ ۔ اسرار حیات (الیشور ٹوپا)

مئی ۱۹۴۶ء ۵۳ - ۶۲

نظم ۔ خاکستر (بہار کوٹی)
ناول ۔ برہمہ (قیسی رامپوری)
ناول ۔ رونق (")
ناول ۔ پھندا (")
نظم ۔ روح صہبائی (اثر صہبائی)
فسانہ ۔ راجکماری چمپا (مہدی علی خاں)
فسانہ ۔ بولوں کا قلعہ (")
فسانہ ۔ دنیا ہماری (پردیسی)
فسانہ ۔ ہمالیہ کی گود (ساگر چند)
ڈرامہ ۔ پنجم مدھم (محمد عمر)
مذہب ۔ نغمۂ جاوید ۔ ترجمہ (اثر لکھنوی)
تذکرہ ۔ جمال الدین افغانی (نفیس اکاڈمی)
طنزیہ فسانے ۔ تکونا دیس (ابراہیم جلیس)
" " ۔ ہم کروڑ بھکاری (")
تنقید ۔ تصورات اقبال (شاغل فخری)
ناول ۔ ایک حمام میں (محمد شفیع)
مزاحیہ افسانے ۔ مجھے خرید لو (شوکت تھانوی)

سیاست : معاہدۂ ہند و برطانیہ (سر سلطان احمد)
نظم : شب تاب (حجاز)
مزاحیہ افسانہ : مابدولت (شوکت تھانوی)
افسانے : سرخ افسانے ترجمہ (اسرار احمد)
ڈرامہ : گھروندے (عرش تیموری)
نظم : ہمارے حسین (طالب)
ناول : ارمان (آغا شاعر)
تذکرہ : مولانا آزاد (بزمی)
افسانہ : ننگا پانو (شبیر محمد)
تاریخ : موسیٰ (شہاب الدین)
سیاست : بادشاہ - ترجمہ (محمود حسین)
افسانہ : بکھرے موتی (عطاء الرحمان)
تذکرہ : ملک محمد جائسی (کاتب مصطفیٰ)
نظم : جام بیخودی (عباس علی خاں)
نظم : سمن زار (شاکر)
نظم : نیا راگ (زکیہ سلطانہ)
نظم : دام خیال (ضیاء الاسلام)
نظم : بزم سخنوراں (مجتبیٰ حسن)
ناول : نقش و نقاش (سلطان حیدر جوش)
تنقید : تبصرہ حیات شبلی (محمد امین زبیری)
سیاست : ہندوستانی زبان (امام اکبر آبادی)

جولائی ۴۶ء ۵۸ - ۶۰

نظم : پرواز (علی سردار جعفری)
نظم : رگ سنگ (علی جواد زیدی)
تنقید : ن۔م۔ راشد (حیات اللہ)
تنقید : موت سے پہلے (احمد علی)
افسانہ : چھالے (قدوس صہبائی)
نظم : ڈگر (الطاف مشہدی)

نظم : ہتوڑے (شفیق قادری)
افسانہ : مجھے بھول نہ جانا (موہن غوری)
تنقید : تنقیدات (ابو اسلام صدیقی)
ڈرامہ : میرا نام ہے تعلیم (نعیم صدیقی)

اگست ۴۶ء ۶۳ - ۶۴

افسانہ : ایک کاروباری (اختر اورینوی)
افسانہ : بدلیاں (سحاب قزلباش)
نظم : پریم رس (ابرار حسین)
سیاست : روح روشن (طفیل احمد)

ستمبر ۴۶ء ۶۰ - ۶۳

افسانہ : ستارے (سیدہ اختر)
ناول : زینت (قیسی رامپوری)
افسانہ : شیطان ترجمہ (اشعر دہلوی)
نظم : شہید ناموس (شاد ملیح آبادی)
افسانہ منظوم : مرگ پروانہ (سیدہ اختر)
انشائیات : ذرات (محمودہ رضویہ)
سیاست : ایران کی بیداری (علی اشرف)
سیاست : انقلابی (اندھیر سنگھ)
ناول : ہچکولے (رئیس احمد جعفری)
سیاست : اشتراکی سماج - ترجمہ (کلیم اللہ)
سیاست : مارکسزم ترجمہ (")
تمدن : برہنگی (ناظر)
ناول : قمر (محمد شفیع)
نظم : نکہت گل (وفا براہی)
ناول : شیطان (قیسی رامپوری)

اکتوبر ۱۹۴۶ء ۶۰ - ۶۴

نظم ۔ ۱۹۴۵ء کی بہترین نظمیں (ارباب ذوق لاہور)

ڈرامہ ۔ سات کھیل (راجندر سنگھ بیدی)

تمدن ۔ سماج کا ارتقاء (سنگم پبلشرز)

نظم ۔ سازِ نو (رضوی)

نظم ۔ لاجونتی (شانتی سروپ)

مذہب ۔ قرآن اور سیرت سازی (ولی الدین)

تمدن ۔ اسلامی تقاریب (ادارہ اشاعت اسلامیہ)

نظم ۔ سفینہ (شفیق جونپوری)

تنقید ۔ اقبال کی شاعری (اکبر علی)

نظم ۔ حدیثِ دیگراں (مختار)

ڈرامہ ۔ سلطانہ رضیہ (خورشید لکھنوی)

دسمبر ۱۹۴۶ء ۶۹ - ۷۲

افسانے ۔ طشت از بام (وجاہت علی)

تنقید ۔ رموزِ اقبال (ولی الدین)

تاریخ ۔ مشرقِ بعید (محمد اسحاق)

نظم ۔ روحِ تبسم (ظریف)

نفسیات ۔ شخصیت (شبیر محمد)

نظم ۔ کاخِ بلند (عبدالکریم ثمر)

ڈرامہ ۔ دکھیا سنسار (عشرت رحمانی)

نظم ۔ غنچۂ نورس (اختر نعمانی)

مذہب ۔ حقانی اسلام (محمد سرور)

سیاست ۔ نظامِ نو (مظہر الدین)

سیاست ۔ ہندوستان اور اقلیت (عبدالباری)

مارچ ۱۹۴۷ء ۵۷ - ۶۰

سیاست ۔ سیاسی نظریئے ترجمہ (انوار الحسن)

تنقید ۔ افادی ادب (اختر انصاری)

مذہب ۔ شاہ ولی اللہ (محسی)

تذکرہ ۔ ذاکر صاحب (رشید احمد صدیقی)

تمدن ۔ بات چیت (صالحہ عابد حسین)

سیاست ۔ روس انقلاب کے بعد (محمد مسعود جوہر)

سیاست ۔ اسلامی سیاست (نعیم صدیقی)

مذہب ۔ میثاق الانبیاء (عبدالغنی)

ڈرامہ ۔ الوکھا سنسار (عشرت رحمانی)

سیاست ۔ اشتراکی روس ۔ ترجمہ (کلیم اللہ)

مئی ۱۹۴۷ء ۵۹ - ۶۱

افسانہ ۔ زندگی کے جائزے (بزمی)

نظم ۔ جامِ نو (تاباں قادری)

ناول ۔ باغی (رئیس احمد جعفری)

افسانہ ۔ آوارہ گرد کے خطوط (رحمٰن مظفر پوری)

سیاست ۔ فلسطین اور یہود (محمود بریلوی)

ناول ۔ آخری رات (ام اسلم)

نظم ۔ سدرۃ المنتہیٰ (سیماب)

فلسفہ ۔ نفسیاتِ جمال (ابوالنظر رضوی)

افسانہ ۔ نئے خاکے (قدوس صہبائی)

مرثیہ ۔ معراجِ سخن (خبیر لکھنوی)

جولائی ۱۹۴۷ء ۵۷ - ۶۲

ناول ۔ ستاروں سے آگے (قرۃ العین حیدر)

ناول ۔ اے عشق کہیں لے چل ۔ ترجمہ (صادق الخیری)

تنقید ۔ ادب کے مادی نظریے (ظہیر کاشمیری)

سیاست ۔ مسلمان اور غیر مسلم حکومت ۔ (محمد سرور)

نظم ۔ عرفانِ عزیز (نظامی پریس)

افسانہ ۔ جلترنگ (زینت ساجدہ)

نظم ۔ قومی ترانے (عبدالوہاب)

نظم ۔ نشاط خاطر (نہال واسطی)

نظم ۔ انگریزی رباعیات باباطاہر ترجمہ (ڈی سی ۔ دتا)

ناول ۔ مچلتے آنسو ۔ ترجمہ (صادق الخیری)

تنقید ۔ تنقید کیا ہے (آل احمد سرور)

نظم ۔ رباعیات محروم (تلوک چند)

نظم ۔ مشعل (فراق گورکھپوری)

نظم ۔ طور درخشاں (احمد فریش)

تذکرہ ۔ گنجہائے گرانمایہ (رشید احمد صدیقی)

تنقید ۔ ذکر شبلی (محمد امین زبیری)

ناول ۔ شہناز ۔ ترجمہ (حبیب اشعر)

ستمبر ۴۷ء ۵۹ - ۶۲

نظم ۔ روپیہ (فراق گورکھپوری)

مذہب ۔ اسلام اور سود (انور اقبال)

فسانہ ۔ عشق جہانگیر (محمد شفیع)

نظم ۔ شرح میر درد (")

مکاتیب ۔ بیگمات اودھ کے خطوط (انتظام اللہ)

ناول ۔ ڈھونگ (شوکت تھانوی)

فسانہ ۔ زیدی کا حشر (مجنوں گورکھپوری)

ڈرامہ ۔ مریم مجدلانی ترجمہ (")

نظم ۔ آخر شب (نعیمی اعظمی)

معاشیات ۔ اسلامی معاشیات (مناظر حسن)

تنقید ۔ فلسفہ کلام غالب (شوکت سبزواری)

افسانہ ۔ کشمکش (شفیق بانو)

اکتوبر ۴۷ء ۶۲

تاریخ ۔ انساں کا عروج ۔ ترجمہ (رضیہ سجاد ظہیر)

سیاست ۔ انقلاب روس ۔ ترجمہ (کلیم اللہ)

سیاست ۔ سرمایہ داری کا زوال ترجمہ (اطہر علی)

ڈرامہ ۔ دھانی بانکپن (عصمت چغتائی)

نظم ۔ لمعات (رضی بدایونی)

دسمبر ۴۷ء ۵۹ - ۶۲

ڈرامہ ۔ نکتہ چین ہے غم دل ترجمہ (افتخار حسین)

تاریخ ۔ عبرت انگیز لمحات ۔ ترجمہ (نفیس اکاڈیمی)

سیاست ۔ اسلامی نظریۂ اجتماع (رشید الزماں)

ادب ۔ فرہنگ غالب (عرشی رامپوری)

نظم ۔ نئی دنیا کو سلام (سردار جعفری)

فسانہ ۔ نماز (عابدی جعفر)

نظم ۔ شبستان (فراق گورکھپوری)

نظم ۔ روح کائنات (")

مارچ ۴۸ء ۶۱ - ۶۴

ناول ۔ ہم وحشی ہیں (کرشن چندر)

تذکرہ ۔ بہار کی اردو شاعری (معین الدین)

فارسی مکاتیب ۔ متفرقات غالب (سید مسعود حسن)

تاریخ و ادب ۔ ناول کی تاریخ (علی عباس حسینی)

تاریخ ۔ ملکۂ مشرق (محمودہ رضویہ)

نظم ۔ اجالے اندھیرے (ساحلی)

تنقید ۔ اثر کے تنقیدی مضامین (اثر لکھنوی)

مئی ۴۸ء ۶۳ - ۶۴

ڈرامہ ۔ سب رنگ (اختر الایمان)

افسانہ ۔ درندے (عادل رشید)

نظم ۔ نوائے دل (ہادی مچھلی شہری)

جولائی ۱۹۴۸ء ۶۰ - ۶۲

تاریخ : صحیفۂ ٹیپو سلطان (محمود بنگلوری)
نظم : اختر و اقبال (سیدہ اختر)
ادب : زہریلے آنسو ۔ ترجمہ نذرالاسلام (غلام سرور)
نفسیات : شعور و لاشعور ترجمہ (مترجم)
نظم : گاندھی نامہ (اکبر الہ آبادی)

ستمبر ۱۹۴۸ء ۶۳ - ۶۴

ادب : تحقیقات (عندلیب شادانی)
نظم : سفینہ (سہیل)
نظم : کیفیات (مزاج)

نومبر ۱۹۴۸ء ۵۱ - ۵۶

نظم : کلیات اکبر (کتابستان کراچی)
نفسیات : ہم آپ (عبدالماجد دریا بادی)
افسانہ : سیاہ حاشیے (منٹو)
افسانہ : آندی (غلام عباس)

مارچ ۱۹۴۹ء ۶۱ - ۶۴

تذکرہ : شعر و شاعری (گوپیا)
تاریخ : نامورانِ ادب (صابر قلی خاں)
نظم : صبوحی (ضیا جعفری)
مذہب : اسلامی تعلیمات (ولایت علی)
سیاسیات : سیاسیات کے اصول (نثار علی)

جون ۱۹۴۹ء ۵۳ - ۵۶

تاریخ : تلنگانہ (سیاح)
تاریخ : نیا چین ۔ ترجمہ (کلیم اللہ)

تنقید : تنقیدی نظریئے (احمد علی خاں)
نظم : سازِ نو (مجاز)
تاریخ : تصوف (وحید احمد)
تنقید : فانی (دیبی پرشاد)
نظم : تیر نیمکش (بزمی بریلوی)
نظم : سلک گوہر (انشاء اللہ خاں)
افسانہ : تم بڑی سنگدل ہو (عزیز النسا)

اگست ۱۹۴۹ء ۵۴ - ۵۶

تنقید : ادب و سماج (احتشام حسین)
افسانہ : نراس میں آس (صالحہ عابد حسین)
افسانہ : گالی (مہندر ناتھ)
افسانہ : کوکھ جلی (راجندر سنگھ بیدی)
تاریخ : تاریخ ایران (خلیل الرحمان)
نظم : ارمغان آلام (سید محمود)
تذکرہ : سلک گوہر (جاوید انصاری)
نظم : بادبان (کمال احمد)
نظم : ریاضِ دانش (فہمی برہانپوری)

ستمبر ۱۹۴۹ء ۵۳ - ۵۶

تذکرہ : مراۃ الشعر (محمد یحییٰ تنہا)
سیاست : تاریخ انقلاب عالم (بزمی)
سیاست : جب خون بہہ رہا تھا (بزمی)

اکتوبر ۱۹۴۹ء ۵۵ - ۵۶

خطوط : نادراتِ غالب (آفاق)
نظم : آبگینہ (بشیر النساء)

دسمبر ۱۹۴۹ء ۶۳ - ۶۴

تذکرہ ۔ چکبست (حیدر مہدی)

مارچ ۱۹۵۰ء ۶۰ - ۶۴

فارسی نظم ۔ بوستان حسرت (حسرت شروانی)
تاریخ ۔ وقایع عالم شاہی (پریم کشور)
لغت ۔ بیان اللسان (زین العابدین)
ناول ۔ جوڑ توڑ ۔ بقراط (شوکت تھانوی)
نظم ۔ جوئے شیر (آنند نرائن ملا)
ادب ۔ تحقیق نوادر (آمنہ خاتون)
تذکرہ ۔ غالب (دیا کشن گجور)

مئی ۱۹۵۰ء ۶۳ - ۶۴

تذکرہ ۔ آثار ابوالکلام (عبدالغفار)
نظم ۔ بیکلاں (جگناتھ آزاد)

جولائی ۱۹۵۰ء ۶۱ - ۶۴

نظم ۔ جلوۂ صد رنگ (حبیب احمد صدیقی)
تاریخ ۔ ۱۸۵۷ء کے ہیرو (انیس فاطمہ)
نظم ۔ شرح دیوان غالب (جوش ملسیانی)
تنقید ۔ مرزا شوق (خواجہ احمد فاروقی)
تنقید ۔ چھان بین (اثر لکھنوی)
مذہب ۔ نغمۂ الوہیت ۔ ترجمہ (حسن الدین)
سفرنامہ ۔ صراط الحمید (الیاس برنی)

نومبر ۱۹۵۰ء ۵۸ - ۶۴

تذکرہ ۔ مراۃ الشعر جلد دوم (محمد یحییٰ تنہا)
نظم ۔ مسدس بے نظیر (اثر رامپوری)

ڈراما ۔ سیاست نامۂ عالم (نکہت)
سیاست ۔ اشتراکیت روس (عابدی)
سیاست ۔ جمہوریت ۔ مغربی تحریکیں (عبدالوہاب)
ادب ۔ نیا ادب (کشن پرشاد کول)
تنقید ۔ شبلی کی حیات معاشقہ (وحید قریشی)
افسانہ ۔ اپنی نگریا (ممتاز شیریں)
افسانہ ۔ پچھتاوے (شفیق الرحمان)

دسمبر ۱۹۵۰ء ۶۲ - ۶۴

تذکرہ ۔ انیس و شیکسپیر (انگریزی) (غلام امام)
نظم ۔ مشام روح (ناباں قادری)
تنقید ۔ اقبال کی شاعری (عبدالمالک)
نظم ۔ جرس (وامق جونپوری)

اگست ۱۹۵۱ء ۴۴ - ۴۶

نظم ۔ دیوان فانی گورکھپوری (شمیم)
افسانہ ۔ خوابوں کے ویرانے (مسعود جاوید)
افسانہ ۔ چاندنی کے سائے (" ")
افسانہ ۔ پرانے خدا (کرشن چندر)
مذہب ۔ اسلام کے معاشی نظریئے (یوسف الدین)
نظم ۔ ممتاز کیفی (چندر بھان)
نظم ۔ اشک و آہ (جگدیش بھٹناگر)

اکتوبر ۱۹۵۱ء ۴۵ - ۴۶

نظم ۔ نالۂ ناشاد (رام پرشاد)
تنقید ۔ تحقیق و تنقید (اختر اورینوی)
تنقید ۔ تنقید جدید (" ")
نظم ۔ کلیات اکبر (بزم اکبر)
نظم ۔ شان محفل (رگھناتھ سنگھ)

نظم ۔ خاورستان (افسر سیمابی)

دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۴ - ۴۶

نظم ۔ پشتو کے گیت (فارغ بخاری)
نظم ۔ نالہ پابند نے (اختر انصاری)
نظم ۔ لسان العصر (")
تذکرہ ۔ ولی گجراتی (ظہیر الدین)
نظم ۔ نوائے بیدل (عبدالمنان)
نظم ۔ شکست و فتح (جمیل مظہری)
افسانہ ۔ چھوٹا خدا (عندلیب شادانی)
افسانہ ۔ نوش و نیش (")

اپریل ۱۹۵۲ء ۵۱ - ۵۶

تنقید ۔ اردو تنقید کا ارتقا (عبادت بریلوی)
تنقید ۔ تنقیدی زاویے (")
تذکرہ ۔ حیات اکبر (بزم اردو کراچی)
نظم ۔ ترجمان اسرار (مکتبہ کارواں)
تذکرہ ۔ قائد اعظم (چراغ حسن حسرت)
نظم ۔ نوائے سینہ تاب (جلیل قدوائی)
نظم ۔ رنگ و آہنگ (ادیب سہارنپوری)
نظم ۔ موج سلسبیل (نظیر سیوہاروی)
نظم ۔ شہر خوباں (عدم)
نظم ۔ فروزاں (جذبی)
نظم ۔ دارورسن (باقی صدیقی)
نظم ۔ فانوس (شفیق جونپوری)
تنقید ۔ ادب و نفسیات (شکیل الرحمان)
تنقید ۔ پرکھ (غلام سرور)
سیرت ۔ سیدنا محمد (محمد اجمل خاں)

مئی ۱۹۵۲ء ۵۴ - ۵۶

نظم ۔ لب و رخسار (انجم اعظمی)
مذہب ۔ میرا مذہب (محمد علی ردولوی)
اخلاق ۔ کشکول (")
نظم ۔ فانوس (افسر آزری)
اقتصادیات ۔ کچھ زر کی بات (ابو سالم)
نظم ۔ کوثر و تسنیم (الم مظفر نگری)
نظم ۔ گلبانگ حرم (حمید لکھنوی)
نظم ۔ کلیات اکبر (بزم اکبر کراچی)

اگست ۱۹۵۲ء ۵۴ - ۵۶

نفسیات ۔ نفسیات کے زاویے (شمس الحسن)
نظم ۔ رقص و دوام (صغیر احمد)
نظم ۔ قطعات و رباعیات اکبر (بزم اکبر)
تعمیر ۔ اسلامی فن تعمیر ۔ ترجمہ (رفعت)
تمدن ۔ اطلاقی سماجیات (جعفر حسن)
افسانہ ۔ چھوئی موئی (عصمت چغتائی)
تذکرہ ۔ حیات اجمل (عبدالغفار)
افسانہ ۔ گیت والگارے (دیوندر داس)
معانی و بیان ۔ روح بلاغت (اخلاق دہلوی)
نظم ۔ نوائے حیات (یحییٰ اعظمی)
ناول ۔ آدمی اور سکے (مہندر ناتھ)

ستمبر ۱۹۵۲ء ۵۴ - ۵۶

ناول ۔ میدان عمل (پریم چند)
تنقید ۔ تنقید کیا ہے (پروفیسر سرور)
تاریخ ۔ کشمیر پر حملہ (کرشنا مہتہ)
ڈرامہ ۔ حبہ خاتون (محمد مجیب)

تنقید ۔ محاسن کلام غالب (عبدالرحمان بجنوری)
تذکرہ ۔ یادگار حالی (صالحہ عابد حسین)
نظم ۔ جنوں و ہوش (جوش ملسیانی)

نومبر ۱۹۵۲ء ۵۱ ۔ ۵۲

سیاست ۔ جمہوریہ ہند (نواب علی)
نظم ۔ پہلی کرن (طرفہ قریشی)
ناول ۔ بھوک ترجمہ (محمود جالندھری)

مارچ ۱۹۵۳ء ۵۳ ۔ ۵۶

تنقید ۔ اردو غزل (یوسف حسین)
تنقید ۔ ترقی پسند ادب (سردار جعفری)
نظم ۔ سرود و خروش (جوش ملیح آبادی)
تذکرہ ۔ قاید ملت (فضل حق قریشی)
معاشیات ۔ ابتدائی معاشیات (ایچ ۔ حسین)
نظم ۔ نقش جمیل (جمیل مظہری)

اپریل ۱۹۵۳ء ۵۱ ۔ ۵۶

نظم ۔ نوائے نے (محمد سلیمان)
افسانہ ۔ ڈائن (شکیلہ اختر)
مرثیہ ۔ مراثی نسیم (مسیح الزماں)
نظم ۔ وجد (سکندر علی وجد)
افسانہ ۔ ٹوٹ گئی ڈالی (شفیق بانو)
مذہب ۔ ایک اسلام (غلام جیلانی)
تذکرہ ۔ تذکرہ شعرائے اردو (سید عبداللہ)
نظم ۔ جمال فطرت (فکری سلطان پوری)
خطابت ۔ رموز خطابت (نذیر الدین)
نظم ۔ گلگونہ (تسکین قریشی)
نظم ۔ آہنگ (مجاز)

مرثیہ ۔ مراثی شاد (شاد عظیم آبادی)
تمدن ۔ شہریت و نظام حکومت (ابراہیم عمادی)

مئی ۱۹۵۳ء ۵۵ ۔ ۵۶

افسانہ ۔ بکھری کرنیں (کشن پرشاد کول)
تنقید ۔ نقد اقبال (میکش اکبرآبادی)
کہانیاں ۔ تحفۂ احسن (احسن مارہروی)

جولائی ۱۹۵۳ء ۵۳ ۔ ۵۶

ناول ۔ سالگرہ آتی رہی (شمس)
تنقید ۔ غالب کی باتیں (شمس)
معاشیات ۔ اصطلاحات معاشیات (دلشاد)
نظم ۔ گریہ و تبسم (صفیہ شمیم)
نظم ۔ جنگ و آہنگ (عرش ملسیانی)
افسانہ ۔ گلشن (کشور)
نظم ۔ ماہ و انجم (نثار اٹاوی)
تاریخ ۔ تاریخ صحافت (امداد صابری)

اگست ۱۹۵۳ء ۵۶

نظم ۔ آفتاب تازہ (وجد)

نومبر ۱۹۵۳ء ۵۵ ۔ ۵۶

نظم ۔ نقشہائے رنگ رنگ (رادھے شا)
نظم ۔ ترانۂ وحشت (رضا علی)
نظم ۔ شعلۂ گل (احمد ندیم قاسمی)

مارچ ۱۹۵۴ء ۵۲ ۔ ۵۶

تذکرہ ۔ احوال غالب (مختار الدین احمد)
ادب ۔ انتخاب طلسم ہوشربا (محمد حسن عسکری)

تنقید ۔ تنقیدی آئینے (منیر علی)
تذکرہ ۔ شعراء اردو کے تذکرے (سید عبدالصمد)
تنقید ۔ کلاسیکی ادب (خواجہ احمد فاروقی)
افسانہ ۔ پرند (آصف مجیب)
نظم ۔ دیوان صفی (صفی لکھنوی)
ڈرامہ ۔ ہیروئن کی تلاش (محمد مجیب)
تنقید ۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ (مسعود حسن)
نظم ۔ دست صبا (فیض احمد فیض)
ناول ۔ باپ بیٹے ترجمہ (انور عظیم)
مذہب ۔ مذہبی تصورات (اختر تلہری)
مذہب ۔ علاوی تصورات (،)
نظم ۔ اجالے (انجم فوقی)
تذکرہ ۔ حسرت موہانی (عبدالشکور)
شکار ۔ آپ بیتی (حکیم الدین)

مئی ۱۹۵۴ء ۵۴ - ۵۶

تنقید ۔ تنقیدی اصول (افسر میرٹھی)
نظم ۔ جھلکیاں (عروج بدایونی)
نظم ۔ صبح زنداں (شہیر)
نظم ۔ پرواز (دانش عظیم آبادی)
تنقید ۔ روایت کی اہمیت (عبادت بریلوی)
تنقید ۔ مطالعے اور جائزے (راجندر ناتھ)
تنقید ۔ تحقیقی مطالعے (نذیر احمد)

اگست ۱۹۵۴ء ۵۴ - ۵۶

ادب ۔ نوائے وقت (نظام الدین)
ڈرامہ ۔ کشمکش (رفیع الدین)
تنقید ۔ اکبر نامہ (عبدالماجد دریابادی)
نظم ۔ شعلۂ نوا (اجتبیٰ رضوی)

ستمبر ۱۹۵۴ء ۵۵ - ۵۶

تنقید ۔ نئی فکریں (محمد عقیل)
نظم ۔ گلبانگ (شمس منیری)
نظم ۔ کشت وخیال (رضی)
نظم ۔ پیام ماوتری (جگر بریلوی)

اکتوبر ۱۹۵۴ء ۵۴ - ۵۶

تذکرہ ۔ میر تقی میر (خواجہ احمد فاروقی)
تنقید ۔ اردو میں تنقید (محمد احسن فاروقی)
تذکرہ ۔ حیات ولی (نورالحسن ہاشمی)
مکاتیب ۔ زیر لب (صفیہ اختر)

نومبر ۱۹۵۴ء ۵۵ - ۵۶

مذاکرات ۔ عروس نیل (سلطانہ فیضی)
تاریخ ۔ عہد فاطمی کا علم وادب (عاشق حسین)

دسمبر ۱۹۵۴ء ۵۳ - ۵۶

نظم ۔ بیکراں (جگن ناتھ آزاد)
تذکرہ ۔ جمال الدین افغانی (ضیاء الدین)
نظم ۔ دیروحرم (شنکر لال)
نظم ۔ کیف سرمدی (ناشاد کانپوری)
نظم ۔ جوئے رواں (افسر میرٹھی)
تذکرہ ۔ وجیہہ الدین وجدی (محمد بن عمر)

مارچ ۱۹۵۵ء ۴۷ - ۵۶

تاریخ ۔ مختصر تاریخ ہند ۔ ترجمہ (محمد یوسف)
تمدن ۔ نامعلوم النساء ۔ ترجمہ (مدراس یونیورسٹی)
تاریخ ۔ تاریخ ہند (نواب علی قریشی)

تاریخ ۔ مشرقی بنگال میں اردو (اقبال عظیم)
سیاحت ۔ ساحل و سمندر (احتشام حسین)
تنقید ۔ ادب و نظریہ (آلِ احمد سرور)
تاریخ ۔ اردو تنقید کی تاریخ (مسیح الزماں)
نظم ۔ نقوشِ مانی (مانی جائسی)
نظم ۔ نگارستان مانی (" ")
ناول ۔ شیشے کا گھر (قرۃ العین حیدر)
ناول ۔ شاید کہ بہار آئے (علی عباس حسینی)
مزاحی ادب ۔ مزید حماقتیں (شفیق الرحمان)
نظم ۔ طوفان (راجندر بہادر)
مذہب ۔ مآلِ بصیرت (عطاء اللہ پالوی)
ڈایری ۔ نادر روزنامچہ (مظہر علی)
مذہب ۔ پیغمبر اسلام غیر مسلموں کی نظر میں (ظلِ عباس)
تذکرہ ۔ مولوی ذکاء اللہ ۔ ترجمہ (ضیاء الدین احمد برنی)
زبان ۔ اپنی موج میں (" دہلوی)
نظم ۔ ثنائے حبیب (بہزاد لکھنوی)
تنقید ۔ مذہب ۔ ہماری بت پرستیاں (ہوش بلگرامی)
ڈرامہ ۔ کھبید ۔ ترجمہ (نور الحسن ہاشمی)
تذکرہ ۔ تذکرۂ شعرائے طوفان (قاضی عبدالودود)
مذہب ۔ بشریت کا مقام (مہر محمد خاں شہاب)
مذہب ۔ افکار اسلامی (عبداللطیف)
تاریخ ادب ۔ اردو کی نثری داستانیں (گیان چند)

اپریل ۵۵ء ۵۴ ـ ۵۶

مذہبی نظم ۔ اصحاب کہف (سرفراز قومی پریس)
تذکرہ ۔ ڈاکٹر زور (محمد بن عمر)
نظم ۔ جذباتِ درد (درد کاکوروی)
تذکرہ ۔ ملک ادب کے شاہزادے ۔ (اعجاز حسین)
نظم ۔ رازِ یزدانی (راز)

نظم ۔ سازینہ (احمد)
نفسیات ۔ تأمل و مشیت (ظفر حسین خاں)

مئی ۵۵ء ۵۳ ـ ۵۶

زبان ۔ لکھنؤ کی زبان (محمد باقر شمسی)
ناول ۔ گئودان (پریم چند)
مزاحی ادب ۔ کف گلفروش (فرقت)

ستمبر ۵۵ء ۵۲ ـ ۵۶

تاریخ ۔ مشاہدات (ہوش بلگرامی)
تاریخ ۔ تاریخ زبان اردو (مسعود حسین خاں)
تنقید ۔ افکار غالب (خلیفہ عبدالحکیم)
تاریخ ۔ بنگال میں اردو (وفا راشدی)
نظم ۔ سنگ میل (یعقوب عثمانی)
نظم ۔ تب و تاب (محمد یحییٰ تنہا)
نظم ۔ ترانۂ دل (دل شاہجہانپوری)
نظم ۔ جامِ فروزاں (بشیر حسین)
ناول ۔ اغوا (کوثر چاندپوری)
ناول ۔ توڑ دو زنجیریں (" ")

اکتوبر ۵۵ء ۵۴ ـ ۵۶

موسیقی ۔ کتاب نورس (نذیر احمد)
مذہب ۔ صحیفۂ ہمام (حمید اللہ)
تنقید ۔ دافع البہتان (حسن علی)
نظم ۔ انگاروں کے گیت (حسن شہیر)
تاریخ ۔ عیسیٰ و عیسائیت (عزیز احمد قریشی)
نظم ۔ انتخاب امیر مینائی (خالد مینائی)

نومبر ۱۹۵۵ء ۵۲ - ۵۶

تاریخ ادب : اردو ساہتیہ (ہندی) (احتشام)

تاریخ : الحسین - ترجمہ (محمد احمد)

تنقید : نئے پرانے چراغ (آل احمد سرور)

تنقید : قدر و نظر (اختر اریبوی)

نظم : حرف تمنا (میکش اکبرآبادی)

سیاست : سیاسیات کے اصول (ہارون خاں)

تنقید : ادبی و قومی تذکرے (کشن پرشاد کول)

نظم : نبض حیات (شفا گوالیاری)

اپریل ۱۹۵۶ء ۵۴ - ۵۶

نظم : گفتنی و ناگفتنی (شورش کاشمیری)

تذکرہ : الہارون - ترجمہ (عمر ابوالنصر)

نظم : جنوں (آل احمد سرور)

تنقید : حکمت رومی (خلیفہ عبدالحکیم)

فسانہ : آگ دیپ بجھے نا (پرکاش سنگر)

فسانہ : گیت اور چیخ (ہربنس سنگھ)

تذکرہ : حسرت کی سیاسی زندگی (عبدالقوی)

مئی ۱۹۵۶ء ۵۴ - ۵۶

تنقید : لطائف السعادت انشا (آمنہ خاتون)

مذہب : اسلامی روایات (حفیظ اللہ)

تذکرہ : ابوہریرہ (محمد باقر)

نظم : داستان روس - ترجمہ (پریم لال شفا)

تاریخ و آثار : شاہکار فاروقیہ (جاوید)

تذکرہ : حیات - ز - خ - ش (انیسہ ہارون)

مذہب : دین حق - ترجمہ (محمد باقر)

مذہب : طریق طلاق (عزیز احمد)

مذہب : بین الاقوامی مذاہب (عزیز احمد)

اگست ۱۹۵۶ء ۴۵ - ۴۸

تنقید : تذکرۂ شوق (عطاء اللہ پالوی)

تنقید : حیرت زار (عطاء الرحمان)

نظم : ساقی نامہ (")

مذہب : کتاب قیامت (محفوظ الحق)

مکاتیب : مکاتیب وحشت (وحشت کلکتوی)

تاریخ : سلاطین ہند کی علم پروری (حفیظ اللہ)

نظم : شاہنامہ ہند (گبھاوی)

لغت : اردو ہندی ڈکشنری (انجمن ترقی اردو ہند)

اکتوبر ۱۹۵۶ء ۵۴ - ۵۶

عمرانیات : جینے کی اہمیت ترجمہ (مختار صدیقی)

تاریخ السنہ : خیابان پاک (محکمۂ اطلاعات پاکستان)

زبان : اردو زبان کا ارتقا (شوکت سبزواری)

تاریخ : دین الٰہی (طالب صفوی)

نظم : افکار صدا (ذاکر حسین)

نومبر ۱۹۵۶ء ۵۴ - ۵۶

تاریخ : بہادر شاہ ظفر (رئیس احمد جعفری)

نظم : ساغر و مینا (سلام سندیلوی)

نظم : نکہت و نور (")

شرح : ترجمان غالب (شہاب الدین)

سفرنامہ : اطالیہ (عبدالحق ڈاکٹر)

مذہب : علم الحدیث (عبداللہ عمادی)

فقہ : سد باب (ابن قیم)

افسانہ : مصری افسانے - ترجمہ (عبدالرحمٰن)

نظم : خرام (مہیش چند)

مارچ ۵۷ء ۵۳ - ۵۶

نظم ۔ زرداغ دل (خالد عزیز)

نظم ۔ گل نخستیں (نازش رضوی)

تنقید ۔ فکر و فن (خلیل الرحمان اعظمی)

تاریخ ادب ۔ اردو کی کہانی (احتشام حسین)

تنقید ۔ ادب کا مقصد (نور الحسن ہاشمی)

تنقید ۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ (عبدالشکور)

تنقید ۔ اردو شاعری کی روایات (شارق میرٹھی)

نظم ۔ سرود نو (اختر)

نظم ۔ سروش ہستی (شاد عظیم آبادی)

نظم ۔ انتخاب کلام آتش (اعجاز حسین)

تنقید ۔ مضامین ڈار (محمد ابراہیم)

مذہب ۔ وحدت الوجود (عبد الرحمان)

اپریل ۵۷ء ۵۳ - ۵۶

افسانہ ۔ چوتھی بہن (صبیح الحسن)

تذکرہ ۔ مولانا شبلی (سعید انصاری)

نظم ۔ سبد گل (امام اکبر آبادی)

مذہب ۔ لمعات القرآن (محمد حنیف)

مرثیہ ۔ بدر کامل (خبیر لکھنوی)

مرثیہ ۔ جمال کربلا (جمال قریشی)

نظم ۔ مثنوی چنیسر نامہ (حسام الدین راشدی)

تذکرہ ۔ تحفۃ الطاہرین (شیخ محمد اعظم)

نظم ۔ پہیلیاں (امیر خسرو)

تذکرہ ۔ رسول کی صاحبزادیاں (اعجاز الحق)

ڈرامہ ۔ لاش (صابر)

تذکرہ ۔ ذکر حافظ (سجاد ظہیر)

جون ۵۷ء ۵۰ - ۵۶

انتخاب ۔ گلہائے پریشاں (الیاس احمد)

تذکرہ ۔ تذکرہ نسوان ہند (فصیح الدین)

تنقید ۔ موازنے (شرقی خالدی)

نظم ۔ امر کہانی (بیتاب بریلوی)

انتخاب ۔ اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ (انجمن ترقی اردو)

نظم ۔ زنداں نامہ (فیض)

تذکرہ ۔ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ (محمد عزیز)

نظم ۔ آیات قرآنی (رضا کوثری)

مکاتیب ۔ گویا دبستاں کھل گیا (محمد علی ردولوی)

سیاست ۔ جمہوریت و اقلیت (بدر الدین طیب)

نظم ۔ سحاب (حسن شہیر)

نظم ۔ انتخاب سودا (ثاقب کانپوری)

نظم ۔ اجالوں کے گیت (حرمت الاکرام)

اگست ۵۷ء ۵۲ - ۵۶

تذکرہ ۔ طنز و مزاح (فرقت کاکوروی)

نظم ۔ نکہت گل (علیم اختر)

ناول ۔ آبلہ دل کا (محمد احسن فاروقی)

نظم ۔ بہاراں (اثر لکھنوی)

فلم ۔ فلمی اشارے (لطیف احمد علوی)

تذکرہ ۔ ہمارے نبی کے صحابہ (اعجاز الحق قدوسی)

تذکرہ ۔ سیرت بتول (")

نظم ۔ نقوش جاوداں (تاباں قادری)

تذکرہ ۔ ابو ظفر بہادر شاہ (انتظام اللہ شہابی)

تذکرہ ۔ فضل الحق خیرآبادی (")

تذکرہ ۔ مولوی احمد شاہ (")

تذکرہ ۔ عظیم اللہ خاں (")

مذہب ۔ رہبرِ حج (محمد احمد کاظمی)
مذہب ۔ درسات عربی (مخدوم محی الدین)
مرثیہ ۔ بدر کامل (خبیر لکھنوی)

نظم ۔ معراج العاشقین (خواجہ گیسو دراز)
تذکرہ ۔ آئینۂ دلدار (دلدار علی)
قواعد ۔ اردو حرف و نحو (عبدالحق)

اکتوبر ۱۹۵۷ء ۵۳ - ۵۶

تاریخ ۔ داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری)
نظم ۔ دیوانِ غالب (مالک رام)
تذکرہ ۔ ظفر علی خاں (شورش کاشمیری)
تذکرہ ۔ سید عطاء اللہ شاہ (")
نظم ۔ نوائے آزادی (ادبی پبلشرز بمبئی)
تنقید ۔ ادبی رجحانات (اعجاز حسین)
تنقید ۔ حفیظ کا جشنِ پنجاہ سالگی (سکریٹری جوبلی کمیٹی)
تذکرہ ۔ مولانا فیض احمد بدایونی (پاک اکاڈیمی)

دسمبر ۱۹۵۷ء ۴۹ - ۵۵

تنقید ۔ تنقیدی شعور (اختر تلہری)
تنقید ۔ ذکرِ اقبال (خلیفہ عبدالحکیم)
تنقید ۔ پردیسی کے خطوط (مجنوں گورکھپوری)
تنقید ۔ نکاتِ مجنوں (")
انتخاب ۔ گلستان ہزار رنگ (بہاء الدین احمد)
نظم ۔ غزلیات (سعید انصاری)
تنقید ۔ ترقی پسند ادب (سردار جعفری)
اخلاق ۔ مقالاتِ حالی (حالی)
تذکرہ ۔ یادگار انیس (امیر احمد علوی)
تنقید ۔ اردو شاعری (")
نظم ۔ نقوش (نند لال پروانہ)
ناول ۔ انصاف (شرما)
ناول ۔ تاراس بلبا (ترجمہ) (خلیق انجم)
سیاست ۔ آسمانی دستور (لطف خلیلی)

مارچ ۱۹۵۸ء ۵۵ - ۵۶

تذکرہ ۔ مقالات الشعراء (میر علی شیر قانع)
نظم ۔ افکار سہیل (اقبال سہیل)
تاریخ ۔ تاریخ اندلس (عبدالقوی ضیاء)

اپریل ۱۹۵۸ء ۴۹ - ۵۶

سیاست ۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ (انگریزی) (مختلف حضرات)
ناول ۔ دار و رسن کی آزمائش ۔ ترجمہ (پبلشنگ ہاؤس دہلی)
ناول ۔ ماں گورکی ۔ ترجمہ (دارالاشاعت سکو)
ڈائری ۔ ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتوں)
تاریخ ۔ انقلاب روس اور اس کے بعد (مسعود جوہر)
تنقید ۔ تنقیدیں (خورشید الاسلام)
نظم ۔ نغمہ زار (حفیظ جالندھری)
نظم ۔ جگناتھ آزاد (آزاد)
نظم ۔ سکندر علی وجد (وجد)
نظم ۔ مجذوب کا کلام (مجذوب)
تذکرہ ۔ حیات آشوب (امداد صابری)
تنقید ۔ ادبی تجزیے (منیر علی)
مثنوی ۔ رضوان شاہ ۔ روح افزا (ناصر)
مثنوی ۔ تصویر جاناں (شفیق اورنگ آبادی)
مثنوی ۔ چندر بدن و مہیار (مقیمی)
نظم ۔ سحر حلال (سحر بھوپالی)
رسم خط ۔ اردو رسم خط (ہارون خاں)
نظم ۔ میاں داد خاں (ظہیر الدین مدنی)
مذہب ۔ تقویم فتحمندی (علی بخش صابری)

جولائی سنہ ۵۸ء ۵۱ - ۵۶

تذکرہ ۔ آشفتہ بیانی میری (رشید احمد صدیقی)
تنقید ۔ فکر و ادب (دیو بیندر)
مذہب ۔ اساس تہذیب (عبداللطیف)
تنقید ۔ شعر و ادب (اختر تلہری)
تنقید ۔ شعور و تنقیدی شعور (شکیل الرحمان)
نظم ۔ اوراق پریشاں (بسمل لکھنوی)
نظم ۔ عکس خیال ۔ ترجمہ (ارشد صدیقی)
تعلیم ۔ پڑھو اور بڑھو (محمد اسحاق صدیقی)
انتخاب ۔ چاند تارے (بزم ریاض الادب)
نظم ۔ ابوالکلام آزاد (جگناتھ)
تاریخ ۔ فیضان اسلام (محمود بریلوی)
تاریخ ۔ بہار میں اردو کا ارتقا (اختر اورینوی)
انشائیہ ۔ محشر خیال (سجاد انصاری)
نظم ۔ لیمانہ (کشن دت)

اکتوبر سنہ ۵۸ء ۵۵ - ۵۶

تمدن ۔ مذاہب عالم (عبداللہ المسدوسی)

دسمبر سنہ ۵۸ء ۵۴ - ۵۶

نظم ۔ شعلۂ نے (حامد اللہ آبادی)
ڈرامہ ۔ یاد ایام (اظہر علی)
نظم ۔ نیم شب (آنند لال پروانہ)
تنقید ۔ تنقید و تحلیل (شبیہ الحسن نونہروی)
خطابت ۔ فن خطابت (کلب مصطفیٰ)
ڈرامہ ۔ طلسم اسرار (مرزا رسوا)
تنقید ۔ اردو قصیدہ نگاری (ابو محمد سحر)
تنقید ۔ حرف غزل (مسیح الزماں)

نظم ۔ آب و تاب (سعادت نظیر)

اپریل سنہ ۵۹ء ۴۹ - ۵۶

انتخاب ۔ نقش آزاد (ابوالکلام)
اخلاق ۔ بشیر احمد ڈار (بشیر احمد ڈار)
تاریخ ۔ سکہ مسلم تاریخ (ابوالامان)
تذکرہ ۔ آہنگ مجاز (مکتبۂ افکار)
تذکرہ ۔ عمر فاروق ترجمہ (حبیب اشعر)
تذکرہ ۔ محمد علی (محمد حسنین)
تاریخ ۔ سنہ ۱۸۵۷ء (عبداللطیف)
مذہب ۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (خلیق احمد)
تاریخ ۔ تاریخ گجرات (ابو ظفر ندوی)
سیاست ۔ بین الاقوامی سیاست (")
تنقید ۔ صنف انشائیہ (محمد حسنین)
تاریخ ۔ ترکی نظام طب ۔ ترجمہ (علی حیدر)
لغت ۔ مجمع اللغات (رام دیال)
نظم ۔ نذر خیام (راجہ لال)
رسم خط ۔ اردو رسم خط (محمد امین عباسی)
نظم ۔ شاہراہ وفا (وفا ملکپوری)
نظم ۔ متاع کلیم (کلیم احمد)
تنقید ۔ شرح دیوان غالب (یوسف سلیم چشتی)
تذکرہ ۔ ولی سے اقبال تک (سید عبداللہ)
نظم ۔ شہر آرزو (باقر مہدی)

مئی سنہ ۵۹ء ۵۴ - ۵۶

نظم ۔ دیوان غالب (عرشی)
تذکرہ ۔ مرقع غالب (خیر بہوروی)
تذکرہ ۔ ابوالکلام آزاد (حکومت ہند)
نظم ۔ طوفان و ساحل (قیصر)

انتخاب ۔ رنگ برنگ (تاج بکڈپو)
تذکرہ ۔ تذکرۂ مخطوطات (زور)

جون ۱۹۵۹ء ۵۵ - ۵۶

نظم ۔ سوز و ساز (حفیظ جالندھری)
جنسیات ۔ جنسی رموز (حکیم محمود خاں)
انتخاب ۔ اردو میں قومی شاعری (علی جواد زیدی)
تذکرہ ۔ تلامذۂ غالب (مالک رام)

اگست ۱۹۵۹ء ۵۴ - ۵۶

تذکرہ ۔ متنبی (جلیل الرحمان اعظمی)
طب ۔ صحت کی کہانی (ڈاکٹر نصیر الدین)
سائنس ۔ سائنس ہمارے لئے ۔ ترجمہ (آفتاب حسن)
نظم ۔ گنگ و جمن (نذیر بنارسی)
زبان ۔ صحت زبان (جگر بریلوی)
نظم ۔ سنگ میل (میلا رام)
نظم ۔ آویزے (نثار احمد)
نظم ۔ خیابان ارم (")

اکتوبر ۱۹۵۹ء ۵۲ - ۵۶

نظم ۔ تلخابۂ شیریں (حفیظ جالندھری)
جمالیات ۔ تاریخ جمالیات (مجنوں گورکھپوری)
تذکرہ ۔ شوپنہار (")
نظم ۔ انتخاب دیوان مومن (حامد حسن قادری)
نظم ۔ انجم کدہ (عزیز لکھنوی)
تنقید ۔ تہذیب و تحریر (مجتبیٰ حسین)
ناول ۔ ڈاکٹر ژواگو ۔ ترجمہ (یوسف صدیقی)

نومبر ۱۹۵۹ء ۵۴ - ۵۶

حدیث ۔ الجامع المسند احمد بن حنبل (بشیر الدین محمود)
فقہ ۔ ہدایت المجتہد ۔ ترجمہ (ادارہ ربوہ)
نظم ۔ دیوان ملا غنیمت فارسی (غلام ربانی عزیز)
تذکرہ ۔ ابن تیمیہ (محمد یوسف)

اپریل ۱۹۶۰ء ۴۴ - ۶۰

نظم ۔ فکر جمیل (جمیل مظہری)
نظم ۔ چراغ منزل (شاہد صدیقی)
نظم ۔ گنج معانی (تلوک چند محروم)
مذہب ۔ تعداد ازدواج (شاہ محمد جعفر)
عمرانیات ۔ تجدید نسل (")
تذکرہ ۔ سرگزشت غزالی (محمد حنیف)
افسانہ ۔ راکھ اور کلیاں (کوثر چاند پوری)
تذکرہ ۔ اطباء عہد مغلیہ (")
نظم ۔ نغمۂ حرمت (شفقت کاظمی)
تذکرہ ۔ معاویہ ۔ ترجمہ (محمد احمد)
مذہب ۔ گلستان حدیث (شاہ محمد جعفر)
تعلیم ۔ تعلیمی نفسیات (علاؤ الدین)
نظم ۔ صدائے دل (ساحر بھوپالی)
نظم ۔ احاطے (احمد عظیم آبادی)
تمدن ۔ تہذیب کے ہیجانات ۔ ترجمہ (فرائد)
تنقید ۔ تجربے اور روایت (ابو اللیث)
تمدن ۔ معاشرتی نفسیات ۔ ترجمہ (علاء الدین)
تذکرہ ۔ عمرو بن العاص ۔ ترجمہ (محمد احمد)

مئی ۱۹۶۰ء ۵۵ - ۵۶

سیاست ۔ یورپ میں چار ہفتے (شورش)

نظم ۔ ذہن و انقلاب (حسن شبیر)
افسانہ ۔ موہنی کی ڈائری (کوثر چاند پوری)

جولائی ۱۹۶۰ء ۱۱۴

تنقید ۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ (قمر رئیس)
تاریخ ۔ عثمان ۔ علی ۔ ترجمہ (عبدالحمید)

اگست ۱۹۶۰ء ۵۳ - ۵۵

تنقید ۔ تنقیدی تجربے (عبادت بریلوی)
تنقید ۔ قول (صبا احمد)
تنقید ۔ المقالات عربی (سعید انصاری)
نظم ۔ بوستان دل (ولی محمد)
تنقید ۔ اردو ادب (آفتاب اختر)
نظم ۔ خانۂ زنجیر (ندیم جعفری)
تنقید ۔ تذکرے اور تبصرے (جلیل قدوائی)

ستمبر ۱۹۶۰ء ۵۱ - ۵۵

نظم ۔ کعبہ میں صنم خانہ (سلام سندیلوی)
تنقید ۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ (")
نظم ۔ سوز و ساز (فاروق)
نظم ۔ خدوخال (اختر رضوانی)
نظم ۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء (امداد صابری)
جمالیات ۔ فنون لطیفہ و جمالیات (مظفر حسین)
نظم ۔ آئینۂ اصلاح (جوش ملسیانی)
نظم ۔ زخموں کے چراغ (وامق)
تذکرہ ۔ تذکرہ ہندو شعراء (یوسف الدین)
نظم ۔ سریلے لعل (عظمت اللہ خاں)

اکتوبر ۱۹۶۰ء ۵۴ - ۵۶

نظم ۔ اڑان (مجید شاہد)
سیرۃ ۔ مقام حسین (پیام شاہجہانپوری)
نظم ۔ حدیث خودی (جگر بریلوی)
تذکرہ ۔ رابعہ بصری ۔ ترجمہ (صارم)
نظم ۔ آتش خنداں (لبیب تیموری)
ڈرامہ ۔ نیا انسان (فضل الرحمان)
نظم ۔ پھول ۔ کلیاں (سعادت نظیر)
نظم ۔ نوید گل (")
تذکرہ ۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی (نادم سیتاپوری)

نومبر ۱۹۶۰ء ۵۳ - ۵۵

سیاحت ۔ یورپ نامہ (حکیم محمد سعید)
تنقید ۔ مقدمہ کلام آتش (خلیل الرحمان)
نظم ۔ حرف جنوں (بشیر فاروقی)
نظم ۔ شام و شفق (سلام سندیلوی)
نظم ۔ کچھ ذرے کچھ تارے (آنند نرائن ملا)
تنقید ۔ حالی کا سیاسی شعور (جذبی)
تذکرہ ۔ فکر غالب (پرتھوی چندر)

اپریل ۱۹۶۱ء ۴۹ - ۵۴

تاریخ ۔ علیگڑھ تحریک (نسیم قریشی)
افسانہ ۔ نئی دھرتی (رام لال)
افسانہ ۔ گلی گلی (رام لال)
سیاست ۔ اسرار کائنات (اختر احمد)
مذہب ۔ خاصیان (نہال احمد)
نظم ۔ شبنم شبنم (کرشن موہن)
نظم ۔ آہنگ غزل (پورن سنگھ)

نظم ۔ طلوع سحر (امجد نجمی)
سائنس ۔ سائنس کی دنیا ۔ ترجمہ (ام ۔ بیگ)
تاریخ ۔ ہزاروں سال پہلے (ابن حنیف)
مزاحیہ ادب ۔ گردِ کارواں (کنہیالال کپور)
نظم ۔ کاکل صبح (عشرت کرتپوری)
مذہب ۔ الحکمۃ فی مخلوقات اللہ ترجمہ (انتظام اللہ)
مذہب ۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ترجمہ (انتظام اللہ)
ڈرامہ ۔ راج محل (اظہر فاروقی)

جون ۶۱ء ۵۲ ۔ ۵۵

مکاتیب ۔ ڈال ڈال پات (بریم ناتھ دت)
نظم ۔ گفتنی (مخمور سعیدی)
تذکرہ ۔ جناب (محمد طفیل)
تنقید ۔ مرزا مظہر (عبدالرزاق)

ستمبر ۶۱ء ۱۰۲ ۔ ۱۰۴

نظم قصاید ۔ وادی ایمن (مانی جائسی)
تذکرہ ۔ نظامی گنجوی (رضیہ اکبر حسین)
نظم ۔ رس (جگر بریلوی)
نظم ۔ دیر و حرم (مسلم انصاری)
نظم ۔ انتخاب داغ (ہندوستانی اکاڈمی)
تذکرہ ۔ اردو غزل ولی تک (ظہیر الدین)
تذکرہ ۔ ۵۷ء کے مجاہد شعراء (امداد صابری)
تذکرہ ۔ ۵۷ء کے غدار شعراء (")

اکتوبر ۶۱ء ۵۱ ۔ ۵۶

مکاتیب ۔ غالب کی نادر تحریریں (خلیق انجم)
نظم ۔ مشاہدات (بسمل سعیدی)
انشائیہ ۔ شہرت کی خاطر (نظیر صدیقی)

تنقید ۔ حالی بحیثیت شاعر (شجاعت علی)
تمدن ۔ کلکی (رادھا کرشن)
افسانہ ۔ دھرتی کا کال (جوگندر پال)
نظم ۔ جشن آزادی (مسعود اختر جمال)
فلسفہ ۔ جیتا جاگتا ۔ ترجمہ (محمد یوسف)
ڈرامہ ۔ وکرم اروسی ۔ ترجمہ (عزیز مرزا)
سیاست ۔ تقسیم ہند (عبدالوحید خاں)
تذکرہ ۔ سندھ کے جدید شعراء (مشتاق جعفری)
تاریخ ۔ سراج الدولہ ۔ ترجمہ (گیتا)
نظم ۔ بہار طفلی (تلوک چند محروم)
تاریخ ۔ گل کرائسٹ کا عہد (محمد عتیق)
تذکرہ ۔ عظمت رفتہ (ضیاء الدین برنی)
مثنوی ۔ سراپا سنور (صادق خاں اختر)
مثنوی ۔ طوطی نامہ (حسرت لکھنوی)
تاریخ گوئی ۔ ذکر عم (انور علی)

نومبر ۶۱ء ۵۲ ۔ ۵۵

مذہب ۔ مفہوم قرآن (پرویز)
تذکرہ ۔ شعر العجم فی الہند (اکرام الحق)
تذکرہ ۔ ہندوستان میں اردو (رفیق مارہروی)
مقالات ۔ انشاء ماجد (عبدالماجد دریابادی)
تنقید ۔ مقالات تلہری (اختر تلہری)
مقالات ۔ شمع فروزاں (عطاء اللہ پالوی)
انشائیہ ۔ اردو انشائیہ (نسیم بک ڈپو)
نظم ۔ پاس گریباں (سلیمان ادیب)
تنقید ۔ غالب (خورشید الاسلام)
نظم ۔ رگ جاں (")

دسمبر ۶۱ء ۵۱ - ۵۵

معاشیات ۔ مروجہ معاشیات (محمد اسماعیل)
سیاست ۔ اسلامی نظم ونسق (بدر الدین)
نظم ۔ دھڑکنیں (ذکی کاکوروی)
تاریخ ۔ دربار اکبری (محمد حسین آزاد)
تذکرہ ۔ ماسٹر رام چندر (سیدہ جعفر)
تاریخ ۔ ریاست میسور میں اردو (محمد جان)
مزاحی افسانے ۔ اندیشۂ شہر (احمد جمال پاشا)
تنقید ۔ پنجاب میں اردو (محمود شیرانی)
تنقید ۔ ادبی اشارے (سلام سندیلوی)
مزاحی افسانہ ۔ حاجی بغلول (سجاد حسین)
تنقید ۔ اقبال کا عہد (جگن ناتھ آزاد)
تصوف ۔ ینابیع التصوف (طالب صفوی)

مارچ ۶۲ء ۵۴ - ۵۹

لغت ۔ نمونۂ لغات اردو (ترقی اردو بورڈ)
نظم ۔ نوائے پریشاں (جگن ناتھ آزاد)
تنقید ۔ شہر سخن (منظور احمد)
نظم ۔ شعلۂ آواز (سراج لکھنوی)
تنقید ۔ جدید شاعری (عبادت بریلوی)
نظم ۔ نوائے کفر (منور لکھنوی)
سیاست ۔ اقبال کے آخری دو سال (عاشق حسین)
تنقید ۔ اسرار و رموز پر ایک نظر (محمد عثمان)
تنقید ۔ اقبال اور حیدرآباد (نظر حیدرآبادی)

اپریل ۶۲ء ۵۳ - ۵۶

تذکرہ ۔ تذکرۂ سرور (خواجہ احمد فاروقی)
تنقید ۔ مومن و مطالعہ مومن (عبادت بریلوی)
نظم ۔ فروغ جام (نشور واحدی)
تنقید ۔ تنقید و تجزیہ (ابو محمد سحر)
نظم ۔ سخن مختصر (جذبی)
ڈرامے ۔ نئے ڈرامے (محمد حسن)
تذکرہ ۔ شادی کی کہانی (محمد مسلم)
تذکرہ ۔ مولانا محمد علی (محمد سرور)
سائنس ۔ سائنس کے چند پہلو ۔ ترجمہ (سید حسنین)

مئی ۶۲ء ۵۳ - ۵۶

نظم ۔ شعلۂ رنگیں (رحیم محمد آبادی)
تنقید ۔ ادب و تہذیب (فرحت اللہ)
تنقید ۔ جدید تنقیدی زاویے (عزیز احمد)
نظم ۔ گل تر (مخدوم محی الدین)
نظم فارسی ۔ یادگار دلا (عزیز جنگ ولا)
قواعد ۔ افعال مرکبہ (تمنا عمادی)
نظم ۔ شکست شب (محسن بھوپالی)
نظم ۔ احاطے (احمد عظیم آبادی)
نظم ۔ لذت آوارگی (اے ۔ ڈی ۔ اظہر)
ناول ۔ خواب پریشاں (سرشار)
نظم ۔ ید بیضا (ساحر بھوپالی)
حشرات ۔ دیمک کی کہانی (عبد البصیر)

جون ۶۲ء ۵۴ - ۵۶

نظم ۔ اردو مثنویاں (نارنگ)
تاریخ ۔ پرچم ضیا (برہم ناتھ دت)
نظم ۔ شعلۂ نوا (تلوک چند محروم)
اخلاق ۔ جواہر پارے (برہم ناتھ دت)
نظم ۔ اجنبی (وشوا ناتھ)
نظم ۔ سوز دروں (آصف بنارسی)

نظم ، حرفِ خاموش (حمید ناگپوری)
نظم ، چشمِ نگراں (حامد عزیز)

جولائی ۱۹۶۲ء

لسانیات ، اردو تعلیم کا لسانی پہلو (ڈاکٹر نارنگ)

اکتوبر ۱۹۶۲ء ۵۱

نظم ، شبِ چراغ (خاور النوری)
تعلیم ، تدریس اردو (فرمان فتحپوری)

تنقید ، زہرِ عشق اور اس کے نقاد (ظہیر احمد)

دسمبر ۱۹۶۲ء ۶۳-۶۴

نظم ، جوشش و بہوش (عقیل جعفری)

فروری ۱۹۶۳ء

مرثیہ ، مراثی نسیم (نسیم امروہوی)
سیاست ، جوائز آف دی ٹرکس (ضیاء الدین برنی)
رسم خط ، خطاطی اور ہمارا رسم خط (یوسف بخاری)

نیاز فتحپوری، "نگار" سے قبل بعض رسائل میں [1]

عارف نیازی

"صلائے عام" اور نیاز

نظم

(۱) نظم — اپریل ۱۹۱۰ء

گلے پر چلتے چلتے رک گئی شمشیر قاتل کی ہوئیں سامان مہجوری ادائیں ضبط بسمل کی

(۲) ماتم شہنشاہ جون ۱۹۱۰ء

سوگ میں کس کے سیہ پوش ہے سارا عالم آج کیوں سینۂ دنیا ہوا وقف ماتم

(۳) سیر کہسار اگست ۱۹۱۰ء

دیکھنے میں تو ہے اک بے قاعدہ سا کوہسار ہے مگر پابندِ آئیں کس قدر یہ بُرد بار

(۴) قلب مضطر ستمبر ۱۹۱۰ء

اے مضغۂ گوشت پارۂ دل اے دائرۂ ہوائے مشعل

(۵) شمع سحر سے دو دو باتیں اپریل ۱۹۱۱ء

آکہ اے شمع حرم، ہمراز سوز اندروں روکش غمہائے پنہاں برہم انداز سکوں

(۶) قصیدہ، بتقریب تہنیت جشن تاج پوشی — جون ۱۹۱۱ء

سپاس خالق مفعول و فاعل و افعال

ثنائے صانع ماضی و حال و استقبال

(۷) ترجیع بند بہ سلسلہ جلوس تخت نشینی جارج پنجم اگست ۱۹۱۱ء

دل میں کیوں آج ہے احساس مسرت پیدا

بلّیوں آج اچھلتا ہے کلیجہ کیسا ؟

---

[1] یہ اشاریہ مکمل نہیں ہے بلکہ مذکورہ رسالوں کی جو فائلیں دستیاب تھیں صرف ان سے مرتب کر دیا گیا ہے۔

نثر

(۱) لٹریچر کا فلسفہ	جنوری ۱۹۱۰ء
(۲) زبانِ بے زبانی	اپریل ۱۹۱۰ء
(۳) دلِ ناداں	ستمبر ۱۹۱۰ء
(۴) مکتوب	جون ۱۹۱۰ء
(۵) "	اگست ۱۹۱۰ء
(۶) اگر میں آزاد ہوتا	جنوری ۱۹۱۱ء
(۷) ایک گمنام خاتون	اپریل ۱۹۱۱ء
(۸) گیتا انجلی کا اشتہار	فروری ۱۹۱۴ء

"تمدّن" اور نیاز

نظم

(۱) جرمِ وفا (منظوم ڈرامہ) اگست ۱۹۱۱ء

چار دن کی میری رخصت ختم ہو جائے گی کل
روکنا مجھکو تمہارا اب ہے بالکل بے محل

(۲) نامہ حبیب ستمبر ۱۹۱۱ء

اے دیارِ شوق کے نغمے سے قاصد جانِ شوق
اے سکونِ قلبِ مضطر اے مرے ارمانِ شوق

(۳) یادِ نذیر (مخمس کی صورت میں) جنوری ۱۹۱۲ء

ہاں اے غروبِ مہرومہ		اے جاذبِ تارِ نظر
دیکھوں تجھے شام و پگہ		ہو آہ لب پر چشم تر
مژگاں ہو میری خوں چکاں

(۴) سرمستیٔ آلام (مسدس) مارچ ۱۹۱۲ء

میرا پہلو آہ وقفِ بسترِ غم ہو چلا
قلب میرا آشنائے دردِ پیہم ہو چلا

(۵) شبنم — اپریل ۱۹۱۲ء

برگِ صدف گل پہ عکس خوشۂ پرویں ہے تو
سچ بتا یا چاک گل کا تکمۂ سیمیں ہے تو

(۶) عرضِ ستم — مئی ۱۹۱۲ء

مطربِ خوش گلو مجھے غرق صدائے ساز کر
کشتۂ جستجو ہوں میں، واقف کنہ راز کر

(۷) غم (ترجیع بند) — ستمبر ۱۹۱۲ء

ہستی تاریک کا مجمر فروزِ دل ہے تو
طرح اندازِ سرِ ہنگامۂ محفل ہے تو

نثر

		صفحہ نمبر
(۱) چاند سے سبق	اکتوبر ۱۹۱۱ء	۳۶
(۲) راز و نیاز	جولائی ۱۹۱۲ء	۲۱
(۳) موت	اکتوبر و نومبر ۱۹۱۲ء	۶۴
(۴) ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر	جنوری ۱۹۱۳ء	۵۴
(۵) چند دن بمبئی میں	اپریل ۱۹۱۵ء	۱۳
(۶) کیوپڈ و سائکی	دسمبر ۱۹۱۵ء	۲۵
(۷) اعتزال	اپریل ۱۹۱۵ء	۳۰
(۸) بعض مسائل علمیہ پر ایک نظر	اکتوبر ۱۹۱۶ء	۴۹
(۹) خودکشی	ستمبر ۱۹۱۷ء	۴۱
(۱۰) شہاب کی سرگزشت	اپریل ۱۹۱۸ء	۳۴
	مئی ۱۹۱۸ء	۳۶
" " "	جون ۱۹۱۸ء	۳۳
" " "	جولائی ۱۹۱۸ء	۳۳
" " "	ستمبر ۱۹۱۸ء	۳۶

"الہلال" اور نیاز

نظم

۲۲ر جنوری ۱۹۱۳ء

(۱) قطرات اشک یا شہر آشوب اسلام (۳۰ بند کا مسدس)

اے زبان تجھ سے تکلم کے طلبگار ہیں ہم زخم دل تجھ سے تبسم کے طلبگار ہیں ہم

(۲) دعوت درد (ترجیع بند۔ ہر بند میں سات شعر) ۵ر فروری ۱۹۱۳ء

اُٹھ دل راحت طلب پیدا سر شور یدہ کر آپ بھی غمدیدہ ہو اوروں کو بھی غمدیدہ کر

(۳) عرض تمنا (غزل کی صورت میں) ۲۰ر اپریل ۱۹۱۳ء

ہوگئیں مدتیں ہمیں، خستہ و ناتواں بنے شب کو زمانہ ہوگیا، روز پہ حکمراں بنے

(۴) التجائے پروانہ (چھ بند کا مسدس) یکم جولائی ۱۹۱۴ء

وہ زمانہ بھی ہے تجھکو یاد اے شمع حرم نور کے سائے میں تیرے جبکہ آسودہ تھے ہم

(۵) فریب لطف (غزل کی صورت میں بغیر مطلع) ۵ر نومبر ۱۹۱۳ء

بسملوں کی اس تنک ظرفی کو دیکھا چاہیئے اک ذرا سے لطف میں ممنون احساں ہوگئے

نثر

۱۔ مشہد کانپور (مراسلہ) ۵ر نومبر ۱۹۱۳ء

۲۔ مراسلہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۲ء

"نقاد" اور نیاز

نظم

(۱) برق نظر (مسدس کی صورت میں) جنوری ۱۹۱۳ء ص ۴۴

تھا ترے سوزاں تبسم میں جو اک لطف نہاں

سچ بتا کیا اب نہ ہوگا مائل روح تپاں

(۲) بتخانہ — فروری ۱۳ء — ص ۱۴

اے زباں تجھ سے تکلم کے طلبگار رہیں ہم
زخمِ دل تجھ سے تبسم کے طلبگار رہیں ہم

(۳) رباعی — فروری ۱۳ء — ص ۱۶

ہم اس کو بھی رزق ہی سمجھتے لیکن
بھر پیٹ گناہ بھی تو ہم نے نہ کئے

(۴) غزل — مارچ ۱۳ء — ص ۲۶

مژہ کی دامن پہ کھیلتا تھا جو فتنہ اس چشم فتنہ زا کا
وہ تیر دلدوز مرحمت تھا، پیامبر تھا مری قضا کا

(۵) تین شعر کی نظم — مئی ۱۹۱۳ء — ص ۴۴

جب نگاہِ بے محاباکامیں لذت یاب تھا
جب شعاعِ حسن سیمیں سے جگر سیراب تھا

(۶) پندِ حسن (مثنوی کی صورت میں) — جون ۱۳ء — ص ۴۷

کہا یہ حُسن نے اک روز دل سے اے بیتاب
ذرا سی ہستی پہ یہ بیقراری سیماب

(۷) یادِ طفلی (مسدس کی صورت میں) — جولائی ۱۳ء — ص ۴۳

وہ دن اچھے تھے، جب پہلو میں اپنے دل تھا ننھا سا
کلیجہ مختصر سا، حوصلہ بھی اس کا تھوڑا سا

(۸) جگنو (مثنوی کی صورت میں) — اگست ۱۳ء — ص ۴۳

اے وجودِ مشتعل اے میہمانِ سوزِ آہ
اے سراپا جستجو اے عاشقِ گم کردہ راہ

(۹) قطعہ — اکتوبر ۱۹۱۳ء — ص ۵۰

راہ میں حضرتِ زاہد کو ملا اک میخوار
بال الجھے ہوئے تن برہنہ، چہرے پہ غبار

(۱۰) مطائبات نیاز — نومبر ۱۳ء — ص ۲۵

نشیلی انکھڑیاں ان کی مجھے تعلیم میخواری
تبسم ان کا ہیں، درس انتہائے ذوق سرشاری

(۱۱) تاج (تاج محل) مسدس — دسمبر ۱۹۱۳ء — ص ۵۵

ہے جو اک تصویر گویائی تری تصویر میں
نطق پنہاں ہے جو اس خاموشیٔ دلگیر میں

(۱۲) رباعی — دسمبر ۱۹۱۳ء — ص ۳۴

معمور تجھی سے پائے جب جملہ بیوت
کیا تیرے وجود کا میں چاہوں گا ثبوت

(۱۳) جھکی ہوئی نگاہ — جنوری ۱۹۱۴ء — ص ۴۵

یہ جھکی ہوئی نگہ ہے کہ مزار ناتوانی
یہ خموشیاں ہیں اس کی کہ زبان بے زبانی

(۱۴) عرض ماتم — فروری ۱۹۱۴ء — ص ۴۷

لائے گا رنگ نیا کیا کوئی بخت ناکام
ایک پہلو پہ مجھے پھر نہیں ملتا آرام

(۱۵) لیمپ کی رسیدیں — اپریل ۱۹۱۴ء — ص ۴۷

ملا لمپ آپ کا بھیجا ہوا خادم کے ہاتھوں سے
بھلا اظہار منت ہو سکے کیا خالی باتوں سے

(۱۶) تیر و نغمہ (انگریزی سے ترجمہ) — جون ۱۹۱۴ء — ص ۴۸

اک آسماں میں تیر پھینکا میں نے
لیکن وہ کہاں گرا نہ دیکھا میں نے

(۱۷) کویل سے — جولائی ۱۹۱۴ء — ص ۴۳

اے نوید جانفزا اے طائر فرخندہ فال
آ گئی بارے تو لے کر پھر پیام برشگال

(۱۸) سوز پروانہ (مسدس نما) — اگست ۱۹۱۴ء — ص ۴۳

وہ زمانہ بھی ہے تجھ کو یاد اے شمع حرم
نور کے سائے میں تیرے لطف آسودہ تھے ہم

(۱۹) لیلۃ القدر (مسدس نما) — ستمبر ۱۹۱۴ء — ص ۴۴

اے شب قدر اے بساط جلوۂ حسن ازل
اے کہ بیتاب مسرت از تو جان صد امل

(۲۰) آہ میری ہستی (رباعی)	اکتوبر سنہ ۱۴ء	ص ۴۸

ہے میری بہار میں خزاں کا عالم
جیسے سرِ تابوت ہو نخلِ ماتم

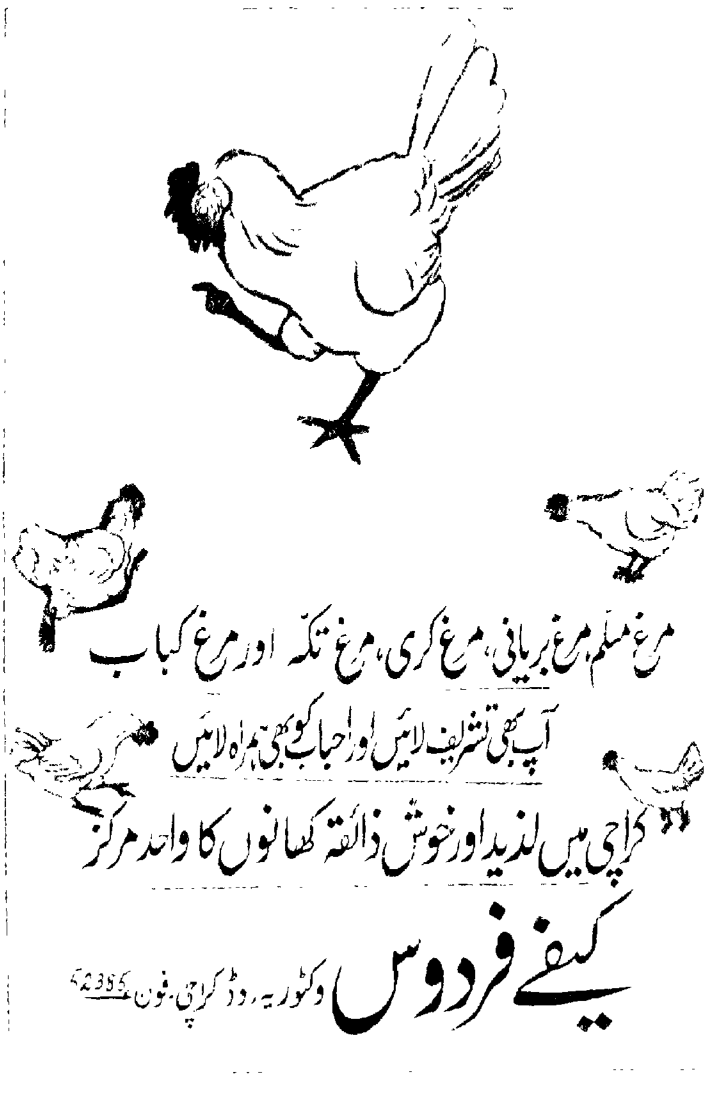
(۲۱) ساحلِ جمن کی ایک صبح	دسمبر سنہ ۱۴ء	ص ۴۸

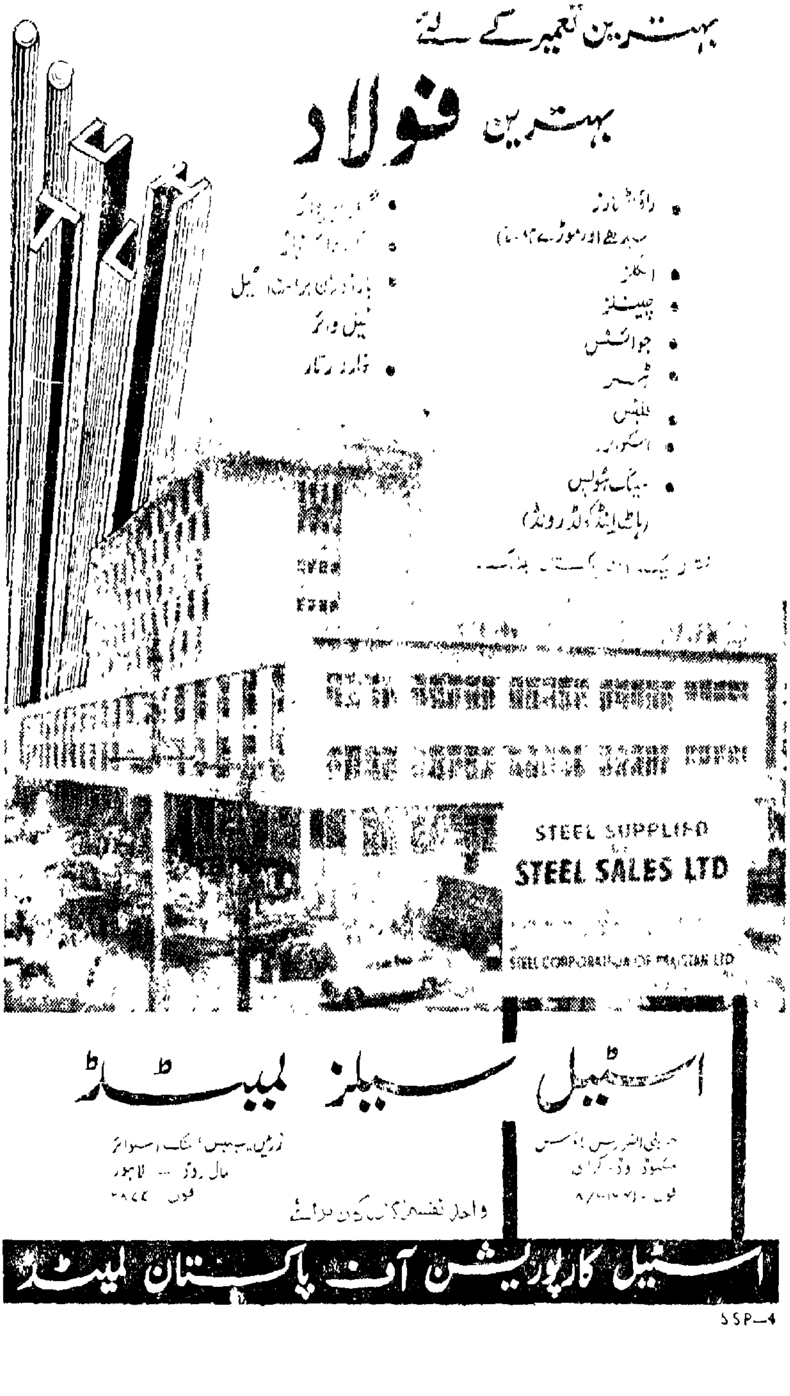
نثر

(۱) ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر	جنوری سنہ ۱۳ء	ص ۱۷
(۲) شباب کی چھیڑ چھاڑ	فروری سنہ ۱۳ء	ص ۱۷
(۳) " "	مارچ سنہ ۱۳ء	ص ۱۷
(۴) " "	جون سنہ ۱۳ء	ص ۳۰
(۵) " "	جولائی سنہ ۱۳ء	ص ۲۳
(۶) فلسفۂ عقل (امام الہام ابوالشکور کی مشہور کتاب "التمہید فی بیان التوحید" کا ترجمہ	جولائی سنہ ۱۹۱۳ء	ص ۲۵
(۷) زائرِ محبت	اگست سنہ ۱۳ء	ص ۲
(۸) "	ستمبر سنہ ۱۳ء	ص ۴
(۹) "	اکتوبر سنہ ۱۳ء	ص ۴
(۱۰) شباب کی چھیڑ چھاڑ	نومبر سنہ ۱۳ء	ص ۳۰
(۱۱) وردِ الحمرا	دسمبر سنہ ۱۳ء	ص ۳۵
(۱۲) "	جنوری سنہ ۱۴ء	ص ۲۳
(۱۳) شیام کی مرلی	اپریل سنہ ۱۴ء	ص ۲۴
(۱۴) چند دن بمبئی میں	جون سنہ ۱۴ء	ص ۳۸
(۱۵) فکاہات	جولائی سنہ ۱۴ء	ص ۲۷
(۱۶) ایک مصور فرشتہ	اگست سنہ ۱۴ء	ص ۱۸
(۱۷) چند دن بمبئی میں	دسمبر سنہ ۱۴ء	ص ۴۴
(۱۸) ایک شیشہ کی قیمت	دسمبر سنہ ۱۴ء	ص ۳۰

(۱۹) ایک رقاصہ سے - اپریل سنہ ۱۹۱۷ء	۲۶	(۲۳) اے بانو (اگست سنہ ۱۹۱۶ء)	۱۹۳
(۲۰) اے نزولِ لطیف مئی سنہ ۱۹۱۷ء	۶۲	(۲۴) برسات - ستمبر سنہ ۱۹۱۷ء	۲۵۰
(۲۱) جذبات ٹیگور - جون سنہ ۱۹۱۷ء	۱۰۹	(۲۵) ایک صناع کا راز اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء	۳۰۲
(۲۲) کتاب ریا کا ایک ورق جولائی سنہ ۱۹۱۷ء	۱۶۷	(۲۶) ایک قافلہ صحرا کو دیکھ کر فروری سنہ ۱۹۱۹ء	۹۷


ICELA
MEDICATED
HAIR DARKENING CREAM
EXQUISITELY PERFUMED
AFTER
BEFORE
• DARKENS GREY HAIR
• CURES DANDRUFF
• STOPS FALLING OF HAIR
I. C. E. LABORATORIES KARACHI. 3 PHONE 53476


مرغ مسلم، مرغ بریانی، مرغ کری، مرغ تکہ اور مرغ کباب
آپ بھی تشریف لائیں اور احباب کو بھی ہمراہ لائیں
کراچی میں لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں کا واحد مرکز
کیفے فردوس
وکٹوریہ روڈ کراچی۔ فون 52385



بہترین تعمیر کے لئے
بہترین فولاد
راؤنڈ بارز
اینگلز
چینلز
جوائسٹس
ٹیز
فلیٹس
(ہاٹ اینڈ کولڈ رولڈ)
ٹین وائر
STEEL SUPPLIED
STEEL SALES LTD
STEEL CORPORATION OF PAKISTAN LTD
اسٹیل سیلز لمیٹڈ
مال روڈ — لاہور
اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ
SSP—4